حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ

(مشاہدات وتأثرات)

مرتب

طلحہ نعمت ندوی

ناشر

علامہ سید سلیمان ندوی اکیڈمی استھانواں، (بہار شریف) نالندہ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

باراوّل

نام کتاب	:	حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ مشاہدات وتأثرات
مرتب	:	طلحہ نعمت ندوی
سنہ اشاعت	:	۱۴۳۷ھ مطابق ۲۰۱۶ء
صفحات	:	۳۶۸
کمپوزنگ	:	عبدالرحیم ندوی 8726305094
ناشر	:	علامہ سید سلیمان ندوی اکیڈمی استھانواں، (بہار شریف) نالندہ
باہتمام	:	مکتبۃ الدارین، لکھنؤ فون نمبر: 9335858300 9335790353
قیمت	:	۲۵۰

ملنے کے پتے

۱- مکتبۃ الدارین

۲- مکتبہ عکاظ دیوبند

۳- بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ

فہرست مضامین

عنوان — صفحہ نمبر

عرض مرتب

پیش نظر کتاب حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ان کے شاگردوں اور اہل وطن کے نقوش وتاثرات اور بعض اہل علم کے مشاہدات ومقالات کا مجموعہ ہے۔

حضرت سید صاحبؒ کی وفات پر ان کے تلامذہ نے ان کی یاد میں آنسو بہائے، اور ان کے اہل وطن نے بھی اپنے تاثرات رنج وغم کا اظہار کیا، ہندوستان میں معارف اعظم گڑھ اور پاکستان میں ماہنامہ ریاض کراچی (مدیر سید رئیس احمد جعفری ندوی) نے حضرت سید صاحبؒ کی یاد میں خصوصی نمبرات شائع کئے، خصوصاً ماہنامہ ریاض میں ان کے بہت سے عزیزوں نے حصہ لیا، ان کے بعد بھی ''معارف'' اور دیگر رسائل میں حضرت سید صاحبؒ پر تاثراتی مضامین نکلے، جو الگ الگ شماروں میں ہونے کی وجہ سے اس طویل عرصہ میں نظروں سے اوجھل ہوگئے، نیز ان مضامین سے حضرت سید صاحبؒ کی شخصیت کی جو تصویر سامنے آتی ہے افسوس کہ ایک طویل عرصہ گذرنے کے بعد وہ لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہے، ان مضامین سے ندوۃ العلماء اور ان کے وطن دیسنہ کے آج سے تقریباً ایک صدی بیشتر کے بعض حالات اور اس کی طرف ضمنی اشارات بھی آگئے ہیں، جن سے ان دونوں جگہوں کے معاشرتی پس منظر کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے، اس لئے خیال آیا کہ ان تاثراتی مضامین کو جن پر تقریباً نصف صدی سے زائد کا عرصہ گذر چکا ہے، مرتب کرکے شائع کردیا جائے تاکہ ان کے ذریعہ حضرت والا کے کمالات واوصاف سے موجودہ نسل بھی واقف ہو، سید صاحبؒ پر بہت کچھ لکھا گیا، ان کے معاصرین، رفقاء اور تلامذہ نے ان کی

علمی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ہزاروں صفحات سیاہ کئے ہیں، ان سب کا احاطہ نہ ممکن ہے نہ مقصود، نہ ان کے تمام معاصرین وتلامذہ کے مضامین کا احاطہ ہوسکتا ہے، ان کے بہت سے اہل وطن نے بھی (جن میں اچھی اردو لکھنے والوں کی بڑی تعداد تھی) انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں سید صاحب پر علمی، تجرباتی اور تاثراتی قسم کے مضامین لکھے ہیں۔

دیسنہ ایسوسی ایشن کراچی سے جب سید صاحبؒ کی صدی تقریبات ولادت کے موقعہ پر اور اس کے بعد بھی سالانہ خصوصی مجلّات شائع کئے، اس ایسوسی ایشن کے دو سالوں کے دو سالانہ خصوصی شمارے ہماری نظر سے گذرے ہیں، معلوم نہیں اس کے اور بھی سالانہ مجلّات شائع ہوئے یا نہیں، بہرحال ان دونوں شماروں میں دیسنوی مہاجرین پاکستان کے بہت سے مضامین شائع ہوئے ہیں جن میں انہوں نے اپنے اس عظیم المرتبت ہم وطن کو خراج عقیدت پیش کیا ہے، اس مجموعہ میں ان دونوں شماروں کے اہم مضامین جو حضرت سید صاحبؒ کے متعلق مضمون نگاروں کے اپنے ذاتی مشاہدات وتاثرات پر مبنی ہیں لے لئے گئے ہیں، نیز مجلّہ ریاض کراچی میں شائع شدہ ان کے ممتاز شاگردوں کے مضامین بھی شامل ہیں، جن میں بہت سے مضامین اہم افادات پر مبنی ہیں، لیکن اس قسم کے تمام مضامین کی گنجائش نہیں تھی اس لئے بعض ندوی فضلاء کے مضامین اس میں نہیں آسکے، نیز بعض ایسے مضامین بھی اس میں شامل ہیں جن کے متعلق راقم کا خیال تھا کہ وہ عام نگاہوں سے اوجھل ہیں یا ان سے حضرت سید صاحبؒ کی عظمت مزید اجاگر ہوتی ہے اور صاحب مضمون کی عظمت قاری کے دل میں اس کے ممدوح کی عظمت واہمیت پیدا کرے گی، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کا مضمون ''علامہ سید سلیمان ندوی اور تبلیغی جماعت'' ان کی کتاب ''تبلیغی جماعت پر چند اعتراضات اور اس کے جوابات'' سے اخذ کیا گیا ہے، اس میں حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے حضرت سید صاحب کے متعلق جس احترام وعظمت کا اظہار ہوتا ہے، نیز حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے مضمون کے سطر سطر سے حضرت سید صاحبؒ کے تئیں جو عقیدت ومحبت

ہویدا ہے وہ قارئین کے لئے لائق توجہ ہے، حضرت مفتی صاحب خود کو حضرت سید صاحب کے مستفیدین ہی میں شمار کرتے تھے، ان کے ایک شاگرد نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سید صاحبؒ کا فون آیا، حضرت مفتی صاحب اس طرح بات کر رہے تھے جیسے سید صاحبؒ سامنے ہوں، ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحبؒ کا مضمون بھی عام نگاہوں میں نہیں ہے، اس لئے ہم نے اس میں شامل کرلیا ہے، وہ بھی حضرت سید صاحبؒ کے خوردوں اور ان کے مستفیدین میں شامل ہیں۔

یہاں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے روحانی کمالات وامتیازات اور شیخ وقت وشیخ طریقت کی حیثیت سے ان کا تعارف اور اس سے بڑھ کر اعتراف کم ہوسکا ہے، مذکورہ بالا بزرگوں کے مضامین وتعظیمی کلمات سے قارئین کو ان کی عظیم المرتبت شخصیت کا کچھ اندازہ ہوسکے گا۔ ان کے علاوہ اس مجموعہ میں مولانا عبدالباری ندویؒ، سید صاحب کے خلیفہ مولانا قاضی سید عبدالرؤف ندوی (والد ماجد مشہور ادیب پروفیسر عبدالمغنی) اور حضرت سید صاحب کے منجھلے داماد ڈپٹی کمشنر سید صاحب حسین صاحب (جو خود بھی صاحب نسبت صوفی تھے) کے مضامین ان کی عرفانی زندگی اور طریقۂ اصلاح وتربیت کو پیش کرتے ہیں، ان کے ارشادات وملفوظات کا مجموعہ ان کے جلیل القدر خلیفہ مولانا محمد اشرف صاحب سلیمانی نے ''سلوک سلیمانی'' کے نام سے دو جلدوں میں مرتب کردیا ہے، نیز ان کے دوسرے ممتاز خلیفہ مولانا غلام محمد صاحب نے بھی ''تذکرۂ سلیمان'' اسی مقصد کے پیش نظر لکھی ہے، اور ابھی حال ہی میں استاذ محترم مولانا مفتی محمد زید صاحب مدظلہ کی ''مکاتیب سلیمان'' منظر عام پر آئی ہے، جو حضرت سید صاحبؒ کی اپنے شیخ مراسلت اور ان کی صوفیانہ زندگی کے تذکرہ پر مشتمل ہے، ان کتابوں کے مطالعہ کے بعد انہیں ولی کامل ہی نہیں شیخ وقت اور مرشد کامل کہنے میں کوئی انصاف پسند تامل نہیں کرسکتا، لیکن بڑے افسوس کے ساتھ اظہار کرنا پڑ رہا ہے کہ اور تو اور، خود ان اہل وطن وعلاقہ حضرت سید صاحبؒ کے ان کمالات سے یکسر بے بہرہ اور اس گوہر آبدار سے نا آشنا

ہیں، شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے وطن میں بعض چھوٹی شخصیتیں جو حضرت سید صاحب کے تلامذہ ومستفیدین کی صف میں شامل یا کم ازکم ان کی ہم عمر ہیں حضرت سے زیادہ مقبول اور عوام وخواص میں متعارف ہیں اور حضرت سید صاحب کی شخصیت سے لوگوں کو مطلق واقفیت نہیں، حالانکہ آج حضرت سید صاحب کے ارشادات کے ذریعہ ان کا فیض جاری ہے جن سے ہر شخص مستفید ہوسکتا ہے۔

حضرت سید صاحب کے سوانح زندگی وحالات پر کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں لیکن بچپن کے ہم عمر وہم درس رفقاء اور براہ راست صاحب سوانح کے صحبت یافتوں کے مشاہدات اور چشم دید بیانات کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے، اس مجموعہ میں سب سے پہلے حضرت سید صاحب ہی کے دو مضامین ہیں جن میں ان کی علمی وطالب علمانہ زندگی کے اہم حالات بیان کردئے ہیں جن کی شرح وتفصیل میں ان کے سوانح نگاروں نے کئی صفحات کے صفحات سیاہ کئے ہیں، اس کے بعد سب سے مفصل مضمون ان کے ہم دم اور ابتدائی زندگی سے پوری طالب علمی تک کے رفیق وعزیز مولانا سید نجم الہدیٰ ندوی دسنوی کا ہے جس میں انہوں نے پورے شرح وبسط کے ساتھ حضرت سید صاحب کے خاندانی حالات ذکر کردئے ہیں جو دوسری جگہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے، انہوں نے اپنی آخری زندگی وظیفہ یاب ہونے کے بعد دسنہ ہی میں گذاری اور دسنہ کے حالات پر دو کتابیں ''نسب نامہ سادات وسلوک دیسنہ'' اور تاریخ دسنہ مرتب کی تھی، اول الذکر اسی وقت شائع ہوگئی تھی، ثانی الذکر کی اشاعت کی نوبت اب تک نہیں آسکی ہے، دیسنہ کے قدیم خانوادوں اور اس کی تاریخ پر ان سے زیادہ کسی کی نظر نہیں تھی۔

''سید الملت کی مکتبی زندگی میں مولانا گیلانیؒ نے سید صاحبؒ کے ایک مکتبی رفیق ہی کی زبانی ان کی مکتبی زندگی کی کہانی سنائی ہے، سید صاحبؒ کے نامور بھتیجے مولانا سید ابوظفر ندویؒ کا مضمون ''بچپن اور طالب علمی کے چند واقعات'' بھی اسی کی تفصیل ہے، مولانا عبدالباری ندویؒ کے مضمون کا ابتدائی حصہ بھی طالب علمانہ زندگی کے مشاہدات پر

مشتمل ہے، نیز مولانا محمد اویس نگرامی رحمۃ اللہ علیہ (جو حضرت سید صاحبؒ کے بہت ہی چہیتے شاگرد، اور علوم قرآن میں ان کے وارث اور علوم وافادات کے امین تھے) کا مضمون بھی اہم افادات پر مشتمل ہے، اس مجموعہ میں سب سے مفصل مضمون حضرت سید صاحبؒ کے عظیم المرتبت شاگرد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جو ان کی کتاب ''پرانے چراغ'' سے منقول ہے اور اپنے تاثرات وافادات کے ساتھ حضرت والا کے امتیازات وخصوصیات کے مفصل تذکرہ پر مشتمل ہے، مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی، مولانا احمد اللہ ندوی، حکیم نصیرالدین ندوی کے مضامین میں حضرت سید صاحبؒ کے متعلق جو باتیں ذکر کی گئی ہیں وہ ان کے علمی واخلاقی کمالات پر روشنی ڈالتی ہیں، مصباح الہدیٰ دسنوی اور مولانا ڈاکٹر سید ابراہیم ندوی کے مضامین گرچہ علمی ہیں لیکن سید صاحبؒ ان کے قرب خاص کی بنا پر شامل کر لئے گئے ہیں، نیز اس لئے بھی کہ قریہ استھانواں جہاں سے یہ کتاب شائع ہو رہی ہے، اور جسے حضرت سید صاحبؒ کے گاؤں سے قرب واتصال اور ان کے اعزہ واہل قرابت کا مسکن ہونے کی بنا پر ان کا وطن ہی کہا جا سکتا ہے وہاں کے کسی اہل علم کا حضرت سید صاحبؒ کے متعلق کوئی مضمون ہمارے علم میں نہیں، اس لئے ان کے برادرزادۂ عزیز ممتاز عالم ومحقق مولانا سید محمد ہاشم استھانوی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مکتوب جو ان کے تاثرات پر مشتمل ہے اس مجموعہ میں شامل کر لیا گیا ہے، اس مختصر مکتوب کے علاوہ ان کے کسی مفصل مضمون کا ہمیں علم نہیں اس لئے ان کے صاحب زادے مولانا ڈاکٹر سید ابراہیم ندوی استھانوی کا علمی مضمون اس میں درج کیا گیا، ان دو مضامین کے علاوہ ہم نے کوئی علمی مضمون اس مجموعہ میں شامل نہیں کیا ہے، حضرت سید صاحبؒ کے علمی جانشیں وعزیز سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا کوئی مضمون اس مجموعہ میں شامل نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت سید صاحبؒ پر ان کی تمام تحریروں کو الگ ایک مجموعہ میں یکجا کر دیا گیا ہے جو تقریباً ۴۰۰ر صفحات کی ضخیم کتاب ہوگی، دارالمصنفین میں وہاں کے سابق مصحح ابوعلی عبدالباری صاحب اثری کا تحریر کردہ ایک قلمی مجموعۂ مضامین موجود ہے جس میں انہوں

نے حضرت سید صاحب سے متعلق اس وقت تک مختلف مجلّات میں شائع ہونے والے مضامین، مقالات اور مکتوبات کو یکجا کر دیا ہے، پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی دسنوی کا مضمون اور مولانا سید ہاشم ندوی کا مکتوب اسی مجموعہ سے ماخوذ ہیں۔

یقیناً حضرت سید صاحب پر ان کے اہل وطن نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن ان کے وطن سے ان کے حالات پر شائع ہونے والی شاید یہ پہلی کتاب ہے، امید ہے کہ حضرت صاحبؒ سوانح اور مرتب کتاب کو دعائے خیر میں یاد رکھا جائے گا۔

رب ذوالجلال سے دعا ہے کہ اسے قبول فرما کر امت کے لئے مفید بنائے اور حضرت والا کے دیگر علمی آثار کی خدمت کی توفیق بخشے، آمین۔

والسلام

طلحہ نعمت ندوی

۲۸ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ

میری تعلیم ومطالعہ

حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ

میرے بڑے بھائی مرحوم مولوی حکیم سید ابو حبیب صاحب رضوی مجددی، مولانا عبداللہ صاحب غازی پوری اور ان کے شاگرد مولوی شاہ علی نعمت صاحب پھلواروی کے شاگرد تھے؛ اس کا اثر یہ تھا کہ وہ توحید وسنت کے شیفتہ اور دل دادہ تھے، اور تمام عمر کامل اتباع سنت اور زہد وتقویٰ میں گزاری۔

وہ جب فراغت پاکر گھر آئے تو میں بچہ تھا، وہ مجھ سے عمر میں اٹھارہ برس بڑے تھے، میں نے انہیں کے دامن شفقت میں پرورش پائی۔ مسلمانوں میں بدعات کا رواج زیادہ تر عورتوں کے سبب سے ہے، اس لئے ان کو اپنے رشتے کی بیبیوں اور گاؤں کی دوسری مسلمان بیبیوں کو سمجھانے اور اسلام کی صحیح تعلیم سے آشنا کرنے کی دھن تھی۔ انہوں نے ہفتے میں ایک دن ان بیبیوں میں وعظ وتلقین کے لئے مخصوص فرمایا۔ چوں کہ میں بچہ تھا، فارسی ختم ہوکر میزان ومنشعب شروع تھی، قرآن پاک کے بعد مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تقویۃ الایمان میرے ہاتھ میں دین کی پہلی کتاب دی گئی۔ میں ان بیبیوں کے بیچ میں بیٹھ کر تقویۃ الایمان کی ایک ایک بات پڑھتا تھا، اور بھائی صاحب مرحوم پردے کے پیچھے سے اس کے ایک ایک مسئلے کی تشریح وتفسیر فرماتے، اور جو وہ فرماتے، وہ میرے دل میں بیٹھتا جاتا۔

یہ پہلی کتاب تھی، جس نے مجھے دین حق کی باتیں سکھائیں اور ایسی سکھائیں کہ

اثنائے تعلیم ومطالعے میں بیسیوں آندھیاں آئیں، کتنی دفعہ خیالات کے طوفان اٹھے؛ مگر اس وقت جو باتیں جڑ پکڑ چکی تھیں، ان میں سے ایک بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکی؛ علم کلام کے مسائل، اشاعرہ ومعتزلہ کے نزاعات، غزالیؒ ورازیؒ وابن رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہوں سے گزرے، مگر اسمٰعیل شہیدؒ کی تلقین بہرحال اپنی جگہ پر قائم رہی۔

۱۹۰۱ء میں دارالعلوم آیا، اور دوسرے درجے میں داخل ہوا، گھر سے کچھ رسالے ساتھ لایا تھا، ان میں اصول حدیث میں، شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کا رسالہ ''عجالۂ نافعہ'' بھی تھا، اصول حدیث کے اس مختصر فارسی رسالے کو پڑھنے سے مجھے علم حدیث سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ندوہ کے کتب خانے سے شاہ صاحب کی دوسری کتاب بستان المحدثین ہاتھ آئی، بڑے شوق سے اس کا مطالعہ کیا، اور بالآخر محدثین کی شخصیتوں میں سے امام مالکؒ نے میرے دل پر قبضہ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مؤطا امام مالکؒ سے بے حد گرویدگی پیدا ہوئی۔

ان دنوں دارالعلوم کے طلبہ کے مطالعہ کے لئے ان کے دارالمعلومات میں کچھ کتابیں الگ رکھوادی گئی تھیں جن کو میں دیکھا کرتا تھا، انہیں کتابوں میں حافظ ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ تھی، اس کے مطالعے نے محدثین کے کارناموں سے آگاہ کیا۔

اوپر کی سطروں سے ظاہر ہے کہ کیونکر میرے دل میں رفتہ رفتہ علم حدیث وامام مالکؒ کی مؤطا کا شوق ہوا۔ اسی شوق کا یہ نتیجہ تھا کہ ۱۹۰۵ء میں میرا سب سے پہلا مضمون الندوہ میں علم حدیث پر نکلا، جس کی تعریف بزرگوں نے فرما کر میرا حوصلہ بڑھایا، اور میری سب سے پہلی کتاب حیات مالکؒ وجود میں آئی۔

اس شوق نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ آخری سال تھا، صحیح بخاری کا آغاز تھا؛ ہم درس ساتھیوں میں کچھ غالی حنفی تھے اور کچھ مائل الی الحدیث، آخری لقب کا اطلاق خود مجھ پر تھا۔ درجے میں یہ دونوں قسم کے لڑکے ہرروز اسباق میں الجھتے اور سوال وجواب کرتے تھے، اور آخر درس گاہ سے اٹھ کر اپنے اپنے ثبوت کے لئے کتابوں کی طرف دوڑتے تھے۔

دوسرے اشخاص امام طحاوی اور حافظ عینی کا سہارا ڈھونڈھتے تھے، اور میں حافظ ابن حجر کی فتح الباری کی پناہ۔ اسی سلسلے میں فتح الباری کے مقدمے کے مطالعے کی توفیق ملی، اور اس کا نتیجہ امام بخاریؒ پر وہ میرا مضمون ہے، جو الندوہ ۱۹۰۶ء میں نکلا ہے۔

حدیث کے شوق نے رجال کی طرف اور رجال نے تاریخ کی طرف بڑھایا، اور اس سلسلے میں ابن ندیم کی کتاب ''الفہرست''، حاجی خلیفہ کی ''کشف الظنون'' اور ابن خلکان کی ''وفیات'' کے مطالعے پر آمادہ کیا۔ میں نے ابن خلکان کی کتاب اتنی دفعہ بار بار پڑھی کہ اس کے حواشی اور حوالوں سے اس کے اول وآخر کے صفحے بھر گئے۔ مولانا شبلیؒ نے ۱۹۰۸ء میں حیدرآباد کے ایک سفر سے واپس آکر مجھے اس کے انگریزی یا فرنچ مترجم کا جب ایک تبصرہ دیا، اور تعریف فرمائی کہ دیکھو یوروپین کس وقت نظر سے کسی کتاب کو دیکھتے ہیں، تو میرے دل میں ایک ٹھیس لگی اور میں نے ابن خلکان پر اس سے بہتر تبصرہ لکھ کر پیش کیا جو الندوہ میں چھپا۔

ہاں شروع میں ایک بات بھول گیا۔ میرے وطن دیسنہ کے قریب ایک دوسرا مشہور قصبہ استھانواں ہے۔ مولانا وحید الحق صاحب (استاد وخسر مولانا محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت بہار) کی ایک چھوٹی سی کتاب ''مغنی الصبیان'' ہاتھ آئی، اس میں مختلف ضرورتوں کے عربی الفاظ اور ان کے معنی لکھے ہیں۔ یہ مجھے بڑی انمول چیز ہاتھ آئی؛ میں نے اپنے ہاتھ سے اس کو نقل کیا اور یاد کیا۔ یہ ادب عربی کی طرف میری توجہ کا پہلا قدم تھا۔ اس کا نتیجہ تھا [کہ] جب مجھے ادب عربی پر سب سے پہلے لکھنے کا خیال آیا، تو اسی طریق پر ''دروس الادب'' کی بنیاد ڈالی۔

ادب عربی کی تعلیم مولانا فاروق اور مولانا سید عبدالحی صاحب مرحوم کے زیر سایہ ہوئی، مگر یہ دونوں بزرگ متأخرین کے طرز کے زخم خوردہ تھے۔ مولانا شبلی مرحوم کے حسن توجہ سے جب دلائل الاعجاز جرجانی درس میں پڑھنے کو ملی، تو سب سے پہلے متقدمین کا طرز انشاء دیکھنے کو ملا؛ شوق سے پڑھی اور اس کی نقالی کی، اور کچھ عربی لکھنے اور

بولنے کی شد بد پیدا ہوئی؛ حماسہ اور نقد الشعر نے اس ذوق پر جلا دی اور ان کی پیروی نے نظم کا کچھ انداز پیدا کیا۔

علم کلام کا شوق تمام تر مولانا شبلیؒ کی تربیت کا نتیجہ ہے؛ ان کی تصنیفات پڑھیں، ان کی حوالہ دی ہوئی کتابیں دیکھیں؛ ملل ونحل شہرستانی اور فصل فی الملل والنحل ابن حزم نگاہوں میں رہی، ابن رشد کی کشف الادلہ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی حجۃ اللہ البالغہ، سب نے یکے بعد دیگرے اپنا رنگ دکھایا؛ بالآخر علامہ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ کی تصنیفات نے ہر نقش کو مٹا ڈالا اور ہر رنگ کو بے رنگ کر دیا۔

سب سے آخری جلوہ قرآن پاک کا نظر آیا۔ مولانا شبلی مرحوم نے اس کا آغاز کیا اور مولانا حمید الدین مرحوم کی دلچسپ ومفید صحبتوں میں یہ چسکا اور آگے بڑھتا گیا؛ اور اسی کا یہ اثر ہوا کہ سیرت نبوی ﷺ کی ہر بحث میں قرآن پاک میری عمارت کی بنیاد ہے، اور حدیث نبوی ﷺ اس کے نقش ونگار ہیں۔ اور اب یہی دونوں میرا سرمایہ، اور یہی دونوں میری زاد راہ ہیں۔ ایک اصل ہے دوسرا ظل؛ ایک وحی جلی ہے دوسرا وحی خفی؛ ایک دلیل ہے دوسرا نتیجہ؛ جس کو یہ ایک، دو نظر آتے ہیں، وہ ''احول'' ہے۔ ولا حول ولا قوۃ الّا باللّٰہ۔

جن سے میں متاثر ہوا

حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ

انیسویں صدی ختم ہورہی تھی، تو میرے ہوش اور تمیز کی آنکھیں کھل رہی تھیں، پندرہ سولہ برس کا سن ہوگا، اس وقت قدیم وجدید کی کشمکش سے سارا ہندوستان خیالات کا دنگل بن رہا تھا، کانوں میں دوقسم کی تحریکوں کی آوازیں دم بہ دم آرہی تھیں، ایک سرسید کی تحریک یعنی انگریزی تعلیم کی اشاعت اور مذہب میں عقل اور فطرت کی مطابقت کی کوشش، اور دوسری علماء کو نئے زمانہ کے نئے خیالات اور فلسفہ سے آشنا کر کے پرانی عربی تعلیم کی ازسرنو تنظیم کی تحریک، جس کو لے کر چند روشن خیال علماء اٹھے تھے، اور یہ بھی عجیب بات تھی کہ اس تحریک کا مرکز بھی علی گڑھ کی ایک عربی درس گاہ تھی، جو مولانا لطف اللہ صاحب کی ذات سے عبارت تھی، اس تحریک کا دوسرا مرکز دہلی تھا، جہاں مولانا سید نذیر حسین محدث دہلویؒ درس دیتے تھے، کانوں میں یہ دونوں آوازیں پڑیں، مگر میرا خاندانی ماحول اسی دوسری تحریک سے متاثر تھا، اس لئے اسی دوسری تحریک سے دلچسپی ہوئی، اور وہ بڑھتی گئی، اور پھیلتی گئی، اور وہی میری زندگی کا جزء بن گئی۔

اس تحریک کا پہلا اثر یہ تھا کہ علماء نے قدیم وجدید کی آمیزش سے نئی عربی درسگاہ کے قیام کی کوشش کی، اور سب سے پہلے مولوی سید نذیر حسین صاحب کے مشہور شاگرد مولانا ابراہیم صاحب آروی نے آرہ (صوبۂ بہار) میں مدرسہ احمدیہ کی بنیاد ڈالی، اور اس کے بعد ندوۃ العلماء نے لکھنؤ میں اپنا نیا مدرسہ دارالعلوم کھولا، میرے والد مرحوم نے مدرسۂ

احمدیہ میں مجھے بھیجنے کا ارادہ کیا، مگر میرے خاندان کے چند عزیزوں کا تعلق ندوۃ العلماء کی تحریک سے تھا، اس لئے دارالعلوم ندوہ لکھنؤ میں داخلہ کی تجویز میرے لئے مناسب بتائی گئی، مگر ابھی اس کے داخلہ میں کچھ تاخیر تھی، تو چند ماہ بہار کے مشہور علمی و مذہبی حلقہ خانقاہ پھلواری میں مجھے رکھا گیا، یہاں خانقاہ میں ہر ہفتہ قوالی ہوتی تھی، اس کے اثر سے اس قصبہ میں شعروسخن کا خاصہ چرچا تھا اور ہے، میں نے بھی اس فضا میں سانس لی، اور یہیں سب سے پہلے میں نے مولوی عبدالحلیم شرر کا ناول ''منصور موہنا'' دیکھا، اس کا یہ اثر ہوا کہ جس وقت کتاب ختم کی، خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا۔

ایک برس کے بعد مجھے دربھنگہ کے ایک اور نئے مدرسہ امدادیہ میں جو دارالعلوم ہی کے خاکہ پر بنا تھا، اور اب تک ہے، چند ماہ رکھا گیا، یہاں سب سے پہلے میں نے طلبہ کی انجمن دیکھی، اور لوگوں کی تقریریں سنیں، اور دوسرے ہی ہفتہ میں وقت کے عنوان پر ایسی تقریر کی کہ ہر طرف سے شاباشی ملی۔

میں نے جس ندوۃ العلماء کا اوپر ذکر کیا، وہ علماء کی ایک مجلس کا نام ہے، جس نے سب سے پہلے علماء کی منتشر جماعت کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا، اور قوم وملت اور علم وفن کی خدمت کے نئے راستوں اور نئے طریقوں سے ان کو مانوس کیا، اس کے جلسے سال بہ سال ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں ہوتے تھے ۱۹۰۰ء پورا ہورہا تھا، جب اس مجلس کا سالانہ جلسہ بڑے دھوم دھام سے پٹنہ میں ہوا، یہ جلسہ کیا تھا، جوش وخروش کا ایک سمندر تھا، یہ پہلا موقع تھا جب عمامے اور ہیٹ یکجا ہوئے، علماء اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب دونوں نے ایک پلیٹ فارم پر بیٹھ کر قوم وملت کی چارہ نوازی کی فکریں کیں، میں بھی اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ اس جلسہ میں شریک تھا، میری آنکھوں نے قومی خدمت کا یہ پہلا تماشا دیکھا تھا، میں نے اسی جلسہ میں یہ پراثر منظر دیکھا کہ کوٹ پتلون میں ملبوس ایک بیرسٹر تقریر کر رہے تھے، اور خود رو رہے تھے، اور بڑے بڑے جبّہ و دستار والے علماء اور مشائخ کو رلا رہے تھے، اسی جلسہ میں سب سے پہلے میں نے اس سلسلہ تقریر کے اگلے مقرر یعنی شیخ

(سر) عبدالقادر لاہور کو دیکھا، وہ اس وقت آبزور کے ایڈیٹر تھے، وہ اپنی اس تقریر کی تمہید میں ٹرنسوال میں بوئروں کی لڑائی کی مختلف خبریں جو اس وقت آ رہی تھیں دلچسپ انداز میں ان کا حوالہ دے کر یہ کہہ رہے تھے کہ اخبار نویسیوں کی بات پر اعتبار کیوں کر کیا جائے، اس تمہید کے بعد انہوں نے کہا کہ ''میں بھی اخبار نویس ہوں، اور اگر تم سے یہ کہوں کہ تمہارے بزرگوں کی بہت بڑی دولت آج بھی الماریوں اور صندوقوں میں بند پڑی ہے، مگر تم کو خبر نہیں، تو تم کو بھی میری اس بات کا کیوں کر یقین آئے گا''، یہ کہہ کر انہوں نے ندوۃ العلماء کی نگرانی میں اگلے بزرگوں کی کتابوں کو محفوظ کرنے کی تجویز پیش کی، ان کی تقریر ایسی دلچسپ تھی کہ جس نے پورے جلسہ کے ساتھ مجھے بھی محوِ حیرت بنا دیا، اور دل میں ایسی ہی تقریر کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا، جس کی مشق بعد کو ہوئی، جلسہ کے اختتام پر میرے شوق نے بال و پر پیدا کیے، اور میں اُڑ کر لکھنؤ پہنچا، اور ندوۃ العلماء کی درسگاہ میں داخل ہو گیا، اور یہ وہ مقام تھا جو اس وقت سارے ہندوستان کے علماء کا مرکز اور قوم کے بڑے بڑے لوگوں کا مرجع بنا ہوا تھا، یہیں آنکھوں نے سب کچھ دیکھا، اور کانوں نے سب کچھ سنا۔

یہاں ہندوستان کی ایک مشہور ہستی صدر مدرس تھی، مولانا فاروق چریا کوٹی، یہ اپنے زمانہ میں ادب اور معقولات کے امام تھے، ان کی خاص چیز ان کے پڑھانے کا طریقہ تھا، وہ جو کچھ پڑھاتے تھے عملی طور سے پڑھاتے تھے اور اس کی مشق کراتے تھے، صرف و نحو، ادب، عروض، منطق فلسفہ ہر ایک فن میں ان کا یہی طرز تھا، دوسری خصوصیت ان کی یہ تھی کہ وہ کتاب کے لفظوں کے پابند نہ تھے، یعنی وہ کتاب نہیں پڑھاتے تھے، بلکہ اس فن کے مسائل پڑھاتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ طالب علم فن پر قابو پا لیتا تھا، ان کی طرزِ تعلیم کی بہتری کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مولانا شبلیؒ جیسا کامل ان کی درسگاہ سے پیدا ہوا۔

بہر حال موصوف کے طرزِ تعلیم نے چند ہی دنوں میں یہ کیفیت پیدا کر دی کہ آنکھوں سے پردے ہٹ گئے اور وہ مسئلے جو پہلے استادوں کے سمجھانے سے سمجھ میں نہیں

آئے تھے، وہ روز روشن کی طرح نظر آنے لگے۔ یہ پہلی شخصیت تھی، جس نے میرے دل و دماغ پر اپنا پرتو ڈالا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ اردو ادب کی پہلی کتاب مولانا شرر کی منصور موہنا میرے ہاتھ میں آئی، اس لئے میری تحریر پر سب سے پہلا اثر شرر کے طرزِ تحریر کا پڑا۔

۱۹۰۱ء میں شیخ عبدالقادر نے لاہور سے مخزن نکالا، آج کل کے بہت سے بوڑھے اہلِ قلم اس کے نوجوان مضمون نگار تھے، میں نے بھی اپنی زندگی کا پہلا مضمون اسی میں لکھا، بلکہ اسی کو پڑھ کر مضمون لکھنے کی تحریک دل میں پیدا ہوئی۔

۱۹۰۴ء میں خود ندوہ کی طرف سے الندوہ نکلا، مولانا سید عبدالحیؒ صاحب مددگار ناظم ندوہ نے مجھے اس میں مضمون لکھنے کی طرف متوجہ کیا، میں نے ایک مضمون علم حدیث اور دوسرا منطق پر لکھ کر پیش کیا، دونوں قبول ہوئے اور الندوہ میں لکھنے کو دیئے گئے، مگر عین وقت پر میری علمی زندگی کے اصلی رہنما مولانا شبلیؒ ۱۹۰۵ء میں ندوہ آ گئے، یہ دونوں مضمون شرر مرحوم کے طرز میں تھے، مولانا نے پہلے مضمون کو تو کچھ اصلاح دے کر باقی رکھا، اور دوسرے کو جس میں شرریت زیادہ تھی نکال ڈالا، اس وقت سے مولانا کے رنگ کی تقلید شروع کی، مگر اصل منزل تک پہنچنے میں کچھ دیر لگی کیوں کہ ابھی یہ رنگ پوری طرح چڑھنے بھی نہ پایا تھا کہ ۱۹۰۷ء میں شمس العلماء آزاد دہلی کی سخندانِ پارس کے مطالعہ کا اتفاق ہوا، اس کی دلکشی نے اپنی طرف کھینچا، ایک دو مضمون اس رنگ میں لکھے، مگر یہ طرزِ تحریر ایسا تھا کہ جو آمد ہو تو کیا کہنا، اور بدقسمتی سے اگر وہ آورد ہو تو اس سے برا کوئی اور نہیں ناچار اُدھر سے ہٹ کر پھر استاد کی بتائی ہوئی شاہ راہ پر آ جانا پڑا، کیونکہ علمی مضامین کے لئے ان کے طرزِ تحریر سے بڑھ کر کوئی دوسرا طرز کارآمد نہیں، اس لئے بار بار ان سے اصلاحیں لیں، ان کی ایک ایک تصنیف کئی کئی دفعہ پڑھی، اور سالہا سال ان کی صحبت اٹھائی، تو علمی زندگی کا ایک نہج، تقریر کا طرز اور تحریر کا ایک رنگ نکل آیا۔

میرا سیاسی ذوق بھی مولانا شبلیؒ کا فیض ہے، وہ اٹھارہ برس سرسید کے ساتھ رہنے

کے باوجود ان کے سیاسی خیالات کے سخت مخالف تھے، پھر طرابلس کی لڑائی، مسجد کانپور کا ہنگامہ اور بلقان کی جنگ نے اس نشہ کو اور تیز کیا، اسی کا نتیجہ تھا کہ مولانا ابوالکلام نے جو خود بھی مولانا شبلیؒ کی صحبتوں سے متاثر تھے، جب ۱۹۱۲ء میں اپنا اخبار الہلال نکالا، تو میں اس کے اسٹاف میں شامل ہوگیا، اخبار کے لٹریچر اور ادبی سطح کو یکساں رکھنے کے لئے میں نے اسی کے طرز میں لکھنا شروع کیا، چنانچہ الہلال میں اس زمانہ میں جو تحریریں میرے قلم سے نکلیں، ان میں ابوالکلام کا طرز اتنا نمایاں ہے کہ لوگ غلط فہمی سے ان کو مولانا ابوالکلام کے نام سے بے تکلف چھاپ رہے ہیں، اور پڑھ رہے ہیں، اور میری پہلی کتاب ارض القرآن میں بہت کچھ مٹانے پر بھی اس کی جھلک موجود ہے۔

معارف میں جو شذرات لکھے جاتے ہیں، اس کا آغاز میں نے الہلال ہی میں کیا تھا، لیکن معارف میں آکر ہلالیت کم ہوکر ایک اور خاص رنگ ابھر آیا۔

لیکن بہرحال چند روز ادھر ادھر بہک کر پھر اسی راستہ پر آگیا، جس پر استاد مرحوم نے لاکر مجھے کھڑا کر دیا تھا، خصوصیت کے ساتھ سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اپنے جانتے ان کے طرز ادا کے نباہنے کی پوری کوشش کی ہے۔

میں نے شروع ہی میں اپنے ایک جرم کا جس کو میں چھپاتا رہا، ہلکا سا اقبال کرلیا ہے، یعنی شعر وسخن کا ذوق، میں نے جب آنکھ کھولی تو ملک میں امیر اور داغ کے معرکے تھے، میرے ایک استاذ شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب مدرس دارالعلوم جو جنرل عظیم الدین خان کے زمانہ میں رامپور میں رہے تھے، اور وہاں منشی امیر احمد صاحب مینائی کی صحبت برسوں اٹھائی تھی، وہ اکثر امیر مرحوم کے تذکرے کیا کرتے تھے، اور ان کے شعر سناتے تھے، ایک اور اتفاق یہ ہے کہ حضرت مینائی کے جلیل القدر شاگرد جلیل مانک پوری جواب نواب فصاحت جنگ سے مخاطب ہیں، ان کے بڑے صاحبزادہ مولوی صدیق صاحب (متوسل سرکار نظام) میرے ساتھ دارالعلوم ندوہ میں پڑھتے تھے، ان کے ذریعہ سے حضرت امیر کی بہت سی غزلیں میری نظر سے گذریں اور دل میں امیر مرحوم کی قدرو

منزلت نے گھر کرلیا، ان کا دیوان مرأۃ الغیب اکثر مطالعہ میں رہتا، دارالعلوم میں لڑکوں کے مشاعرے ہوتے تھے، غزلیں پڑھی جاتی تھیں، ایک صاحب داغ کا روپ بھرتے تھے، اور مجھے امیر مرحوم کی پیروی کا دعویٰ تھا، لیکن ۱۹۱۲ء میں جب مولانا شبلیؒ نے نئی اردو شاعری کی طرح ڈالی، تو دل نے اس میں بھی استاد کی پیروی کا حق ادا کرنا چاہا، متعدد نظمیں اس رنگ میں لکھیں، جن کا خاتمہ استاد کے ماتم پر ہوا، جو نوحۂ استاد کے نام سے ۱۹۱۵ء میں پونہ میں چھپا، جہاں ان دنوں، دکن کالج میں فارسی کا لکچرر تھا، میں نے جب یہ نوحہ لکھا تو اکبرالہ آبادی، ڈاکٹر اقبال، عزیز لکھنوی، مولانا شروانی وغیرہ اور استاد مرحوم کے اکثر دوستوں اور قدردانوں کے پاس اس کو تحفہ بھیجا، سب نے تعریفیں کیں، اور دل بڑھایا، مگر ایک آزمودہ کار صاحب کمال ایسا تھا، جس نے شفقت کی راہ سے مجھے لکھا کہ معاف کیجئے آپ شاعر نہیں، اور اس کے بعد ایک ایسا نکتہ مجھے بتایا جو میرے دل میں پیوست ہوگیا، انہوں نے فرمایا کہ جب تک انسان کسی فن میں کامل نہ ہوجائے، اس کو دوسروں کے سامنے عرض ہنر نہیں کرنا چاہئے، میں نے اسی دن بساط سخن لپیٹ دی اور شاعری سے توبہ کرلی، اس کے بعد اگر کبھی دل کے تقاضے سے مجبور ہوکر کچھ کہا تو اس کو عیب کی طرح چھپایا، اور اگر چھپ نہ سکا، اور چھپ گیا تو نام کو رمز واشارہ بنا دیا، یہ آزمودہ کار صاحب کمال جنہوں نے مجھے یہ قیمتی نصیحت کی جس نے میرے رخ کو نظم سے تمام تر نثر کی طرف پھیر دیا، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی تھے۔

اسی طرح طالب علمی کے زمانہ میں ایک اور بزرگ نے عین وقت پر میری ایسی رہبری کی، جس نے میرے خیالات کی دنیا پلٹ دی، یہ بزرگ ندوۃ العلماء کے پہلے ناظم مولانا سید محمد علی صاحب ہیں، مجھے اس زمانہ میں عربی ادب اور منطق کا شوق تھا، ایک دن انہوں نے مجھے بلوا کر پوچھا کہ تم کو کس کس فن سے ذوق ہے، میں نے عربی ادب اور منطق کا نام لیا، فرمایا کیوں، میں نے کہا اس لئے کہ یہ دونوں دوسرے اصل مقصود علوم کے خادم اور ذریعہ ہیں، ارشاد ہوا کہ آخر ان اصل علوم کی طرف توجہ کب ہوگی، عرض کی، جب ان

میں کمال پیدا ہو جائے گا، فرمایا تو اسی خادم اور ذریعۂ علوم میں تو ہمارے علماء کی پوری عمریں بسر ہو جاتی ہیں، اور اصل مقصود کی نوبت نہیں آئی، اس پر انہوں نے یہ حکایت بیان کی، ''کہ ایک صاحب کو تصنیف کا شوق پیدا ہوا، تو وہ قلم بنا بنا کر رکھنے لگے، یہاں تک کہ تمام کمرہ قلموں سے بھر گیا، کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت یہ آپ اتنے قلم بنا بنا کر کیوں رکھ رہے ہیں؟ تو متانت سے ارشاد ہوا کہ ''میرا ارادہ تصنیف کا ہے''، پوچھنے والوں نے کہا کہ ''پھر وہ کب ہوگی''؟ فرمایا: جب ان قلموں سے فرصت ملے گی''۔

یہ تمثیل اس بات کی تھی کہ عربی نصاب تعلیم کا بڑا حصہ دینی علوم کی تمہید اور ذریعہ کے طور پر پڑھایا جاتا ہے، مگر ہوتا یہ ہے کہ یہ ذریعہ تعلیم اصل تعلیم کی جگہ لے لیتا ہے، مولانا کی یہ حکایت میرے لئے اس درجہ موثر ہوئی کہ میں نے پھر تمام عمر ذریعۂ علوم اور مقصد علوم کے درمیان کبھی مغالطہ نہیں کھایا۔

دارالعلوم ہی میں تھا کہ ایک اور بزرگ سے نیاز حاصل ہوا، یہ مولانا شبلیؒ کے ماموں زاد بھائی مولانا حمید الدین صاحب بی اے تھے، یہ عربی کے عالم اور انگریزی کے گریجویٹ تھے، فلسفہ میں وہ ڈاکٹر آرنلڈ کے اور ادب میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے شاگرد تھے، یہ ان لوگوں میں تھے جو ثانوی علوم کی تکمیل کی بھول بھلیوں سے نکل کر اصل مقصد کی منزل تک پہنچ گئے تھے، سالہا سال سے وہ قرآن پاک کے حقائق و معانی پر غور کر رہے تھے، ان سے قرآن پاک اور فلسفۂ جدید کے سبق تو کم ہی پڑھے، مگر صحبت بار بار اٹھائی، اور مشکلات میں مشورے بار بار کئے، سیرت کی تیسری جلد میں جو معجزات پر ہے، انہی کے فلسفہ کی تقلید کی ہے۔

سب جانتے ہیں کہ میرا تصنیفی ذوق مولانا شبلی مرحوم کی تربیت کے دامن میں پرورش پایا ہے، استاذ مرحوم کا طریقہ یہ تھا کہ وہ نوآموزوں کو پہلے مضمون لکھنے کی ہدایت کرتے تھے، کبھی وہ عنوان خود بتاتے تھے، اور کبھی طالب علم خود ہی مقرر کر لیتے تھے، پھر وہ اس مضمون کے متعلق معلومات کا سراغ کتابوں میں بتاتے تھے، طالب علم اپنی محنت سے

ان کا کھوج لگاتے تھے، اور جب کافی معلومات جمع ہو جاتے تو ان کو لکھ کر ان کے سامنے پیش کرتے، وہ اس میں کاٹ چھانٹ کرتے، مضمون کے بعد پھر رسالوں کی، اور اس کے بعد کتابوں کی تصنیف کی باری آتی، تاکید ہوتی کہ معلومات اور مواد کو ہر کونہ اور گوشے سے اس محنت سے ڈھونڈو کہ پھر کوئی کونہ خالی نہ رہ جائے، اس عنوان پر اگر پہلے کسی نے لکھا ہو تو اس سے تمہارا مضمون بالکل الگ رہے، یا اس سے بڑھ جائے، مستند حوالہ کے بغیر کوئی واقعہ نقل نہ کیا جائے، حوالہ میں سب سے قدیم اور سب سے مستند ماخذ کا خیال رکھا جائے، معنی کے ساتھ عبارت کی چستی، طرز ادا کی شگفتگی اور تشبیہ واستعارہ کی ندرت ہاتھ سے نہ جائے، پامال معلومات، متبذل محاورات اور عامیانہ الفاظ سے پوری طرح پرہیز کیا جائے، یہ ان کا طریقہ تھا، اور اسی طریقہ کی پابندی ہمارے دارالمصنفین میں جس میں علماء اور گریجویٹ اصحاب کو تصنیف و تالیف کی تعلیم دی جاتی ہے، اب تک کی جاتی ہے۔

سید صاحب کی یاد میں

حضرت مولانا سید نجم الہدیٰ دسنوی ندویؒ

راقم الحروف علامہ سید سلیمان ندوی کا حقیقی ماموں زاد بھائی ہے، سید صاحب کی ولادت ۳؍صفر ۱۳۰۲ھ میں ہوئی، اور راقم رجب ۱۳۰۱ھ میں پیدا ہوا، اس طرح وہ مجھ سے چھ مہینے چھوٹے تھے، لیکن بچپن سے ندوہ کی تکمیل تعلیم تک میرا ان کا ساتھ اس طرح رہا کہ میری زندگی کی تمام باتوں سے وہ واقف رہے اور میں ان کی ہر بات کا ہمراز رہا، اب وہ ساری باتیں خواب وخیال بن کر رہ گئی ہیں، لیکن ان کی خوشگوار یاد اب بھی میرے لئے سرمایۂ حیات بنی ہوئی ہے، جناب شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی اور عزیزی سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا برابر تقاضا رہا کہ میں سید صاحب کے خاندانی اور ابتدائی زندگی کے حالات قلمبند کروں، لیکن میں کوئی اہل قلم نہیں، اس لئے اس کی تکمیل سے گھبراتا رہا، مگر دونوں عزیزوں کے مسلسل اصرار پر کچھ حالات پیش کرنے کی کوشش کررہا ہوں، شاید برادرم شاہ معین الدین کو حیات سلیمانی کی ترتیب میں ان میں کچھ کام کی باتیں مل جائیں۔

سید صاحب کی ولادت دیسنہ میں ہوئی، جو بہار شریف ضلع پٹنہ سے آٹھ میل شمال مشرق میں واقع ہے، اس گاؤں کے آثار قدیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ کسی زمانہ میں شاید یہاں سے جین یا بودھ مذہب والوں کا کچھ تعلق رہا ہے، چنانچہ اب بھی بعض حصوں کی کھودائی کے وقت عہد عتیق کی اینٹیں اور پتھر نکلتے ہیں، ۱۳۰۲ھ سے قبل جب دیسنہ کی مسجد کی تعمیر ایک بلند مقام پر شروع کی گئی تو بنیاد کھودتے وقت اندر سے ہزاروں پختہ اینٹیں

برآمد ہوئیں، جو ڈیڑھ فٹ مربع اور مستطیل اور تقریباً ڈیڑھ انچ موٹی تھیں، یہی خداداد اینٹیں مسجد کی بنیاد میں کام آئیں، قیاس ہے کہ اس جگہ کوئی گڑھ رہا ہوگا جو اس کی تاریخی اہمیت کی دلیل ہے۔

گاؤں کے چاروں طرف پٹھانوں کی قدیم بستیاں ہیں، خود دیسنہ میں بھی ایک دو گھر پٹھانوں کے رہ گئے ہیں، خیال یہ ہے کہ بہار میں جب مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی تو کچھ مسلمان تو شہروں میں آباد ہوگئے ہوں گے اور کچھ گاؤں میں پھیل گئے ہوں گے، اور جو مقامات جنگی حیثیت سے اہم تھے، وہاں پٹھان کثرت سے آباد ہوگئے، چند پٹھان خاندان اس دیس نو میں بھی آباد ہوگئے، جو بعد میں دیسنہ کے نام سے مشہور ہوا، پٹھانوں کے بعد سادات آئے اور ان کے بعد ملک آباد ہوئے۔

دیسنہ کے دو حصے ہیں، (ایک) جو زمینداری کے خاتمہ سے پہلے مہاراجہ ٹکاری ضلع گیا کے خالصۂ آراضیات کا حصہ تھا، اور دیسنہ کا مشرقی حصہ کلیان پور دیسنہ یا ائمۂ دیسنہ کے نام سے موسوم ہے، اس کی مال گزاری مہاراجہ ٹکاری کو دینے کے بجائے سرکاری خزانہ میں داخل کی جاتی تھی، میری ذاتی تحقیق یہ ہے کہ دیسنہ کا مغربی حصہ شہنشاہ اکبر کے خالصہ آراضیات میں تھا، جسے اکبر نے اس عہد کے راجہ ٹکاری کو اس کے حسن خدمات کے صلہ میں بطور انعام دیدیا تھا، اسی وقت سے اس کا نام اکبر پور پڑ گیا، راجہ ٹکاری کے خاندان میں اب تک عہد اکبری کے فرامین موجود ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کو انعام میں بہت سی جاگیریں دی گئیں۔

دیسنہ کا دوسرا مشرقی حصہ پانچ سو بیگھے میں پھیلا ہوا ہے، اور کلیان پور دیسنہ کہلاتا ہے، اور ائمہ اراضی کے نام سے بھی مشہور ہے، ائمہ اراضی کے نام سے بہت سی آراضیات مشرقی بہار کے مواضعات میں موجود ہیں، یہ ان قطعات زمین کو کہا جاتا ہے جو دہلی کے بادشاہوں نے علماء ومشائخ کو عطا کی تھیں جو سرکاری اصطلاح میں ائمہ کہلاتے تھے، دیسنہ کی اراضی ائمہ اسی قسم کی ہے، عہد مغلیہ کے آخری دور میں بہار کا صوبہ دار کلیان سنگھ ہوا تو

اس نے اس کو اپنے نام سے موسوم کرلیا، تاکہ اس کی یادگار بھی رہ جائے، اور خالصہ آراضی اکبر پور سے تفریق بھی ہو جائے۔

سادات دیسنہ کے مورث اعلیٰ حضرت میر حسن شہید کا نسب نامہ حضرت امام علی رضا سے ملتا ہے، ان کے آباء واجداد مشہد مقدس سے شہاب الدین غوری کے ساتھ ہندوستان آئے، میر حسن شہید عہد اکبری سے بہت پہلے بہار تشریف لائے، اور دیسنہ میں مقیم ہوئے اور عہد اکبری میں جب دین الٰہی کا فتنہ اٹھا تو اس سیاسی اور مذہبی بحران میں میر حسن نے شہادت پائی، اور دیسنہ ہی میں مدفون ہیں، ان کی شہادت کے بعد ان کے صاحبزادے سید عثمان دیسنہ ہی میں متوطن رہے، اور ان کی دوسری اولادیں اور مقامات پر منتقل ہوگئیں، سید عثمان کے اکلوتے صاحبزادے میر سید سلیمان تھے، ان کے دولڑکے تھے، حضرت صدرالدین اور حافظ میر جان محمد، سادات دیسنہ ان ہی دونوں بھائیوں کی نسل سے ہیں، اور جب بہار کے سادات کا عروج ہوا تو حضرت صدرالدین کو ائمہ دیسنہ کے علاوہ اور بھی جاگیر ملی، جس میں سے ایک حصہ ان کے چھوٹے بھائی حافظ جان محمد کے نام پر چک جان محمد کے نام سے اب تک مشہور ہے، یہ جاگیر زمینداری کے خاتمہ تک سادات دیسنہ کے قبضہ میں تھی۔

سید صاحب کا دادیہالی سلسلہ رضوی اور نانہالی سلسلہ زیدی ہے، اوپر جاکر چوتھی پشت میں دونوں مل جاتے ہیں، دادیہالی سلسلۂ نسب حسب ذیل ہیں:

سید سلیمان ندوی بن سید ابوالحسن بن محمد شیر عرف حکیم محمدی بن میر عظمت علی بن میر وجیہ الدین عرف میر جگن بن میر رجب علی بن میر محمد شیر بن میر سید صدرالدین بن میر سید سلیمان بن میر سید عثمان بن سید حسن شہید بن سید شمس الدین بن میر سید خلیل بن میر سید عرب ثانی بن میر سید مالک بن میر سید منیر بن میر سید محمد بن میر سید شمس محمد بن سید معین محمد بن سید عرب اول بن سید امیر براں بن میر سید میران بن میر سید احمد بن میر سید محمد بن میر سید محمد یوسف بن میر سید اسحاق بن میر سید یعقوب بن میر سید حسن بن امام علی رضا بن امام

موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام سید محمد باقر بن سید زین العابدین بن امام سید حسین شہید کربلا بن حضرت فاطمہ زہرا بنت حضور اکرم محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم۔

سید صاحب کا نانہالی سلسلہ حسب ذیل ہے۔

سید سلیمان ندوی بن بی بی قطبن بنت سید حیدر حسین بن سید کاظم حسین بن سید خادم حسین بن سید رحمت اللہ بن سید امین اللہ (ساکن موضع مسیاں مقیم دیسنہ شادی از دختر میر صدرالدین) بن سید محمد فاضل بن سید غلام حیدر بن سید عبدالہاشم بن سید عبداللہ بن سید علادل بن سید ملوک بن سید چاند شہید (مزار برکوہ پاربتی مضافات بہار) بن سید یحییٰ بن سید محمد عرف سید ہیبت بن سید یحییٰ بن سید محمود بن سید فرید بن سید مسعود جاجنیری بن سید محمود بن سید ابوالفرح واسطی بن سید داؤد بن سید حسین بن سید یحییٰ بن سید زید بن سید عمر بن سید ابا بکر علی بن سید حسین بن سید علی بن سید محمد بن سید ابو یحییٰ عیسیٰ بن امام زید شہید بن امام زین العابد ین بن امام حسین شہید کربلا بن حضرت فاطمہ زہرا بنت حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم۔

سید صاحب کی انتہائی سلسلہ میں چار پشت تک طبیب ہوتے رہے، اطراف بہار میں یہی پہلا خاندان ہے جس میں طبابت کا سلسلہ برسوں جاری رہا، سید صاحب کے نانا اور میرے دادا حکیم سید حیدر حسین اپنے وقت کے مشہور طبیب تھے، اور اسلام پور ضلع پٹنہ کے مشہور رئیس چودھری ظہورالحق کے خاندانی معالج تھے، پٹنہ کے مشہور حکیم عبدالحمید صاحب کو چودھری صاحب نے کئی مواقع پر علاج کے لئے بلایا تو انھوں نے حکیم سید حیدر حسین کے نسخوں کو دیکھ کر فرمایا کہ ان کے ہوتے ہوئے میری ضرورت نہ تھی، ان کے بڑے صاحبزادے سید ناظر احسن بھی بہت اچھے طبیب تھے، لیکن عین عالم شباب ہی میں لاولد وفات پا گئے، اس لئے حکیم حیدر حسین کے انتقال کے بعد ان کی جگہ سید صاحب کے والد ماجد حکیم سید ابوالحسن صاحب کا تقرر ہوا، حکیم سید حیدر حسین کے والد حکیم سید کاظم حسین بھی بہت اچھے طبیب شمار کئے جاتے تھے، ان کے والد حکیم سید رحمت اللہ دہلی کے مشہور طبیب حکیم محمد شریف خاں بن حاذق الملک حکیم محمد اکمل

خاں سے فیضیاب ہوئے تھے۔

سید صاحب کے دادا حکیم سید محمد شیر عرف حکیم محمدی کا شمار حاذق اطباء میں ہوتا تھا، انہوں نے شروع میں طب اپنے نانا حکیم سید خادم حسین اور اپنے ماموں حکیم سید کاظم حسین سے پڑھی، پھر ۱۲۴۷ھ سے ۱۲۵۱ھ تک پٹنہ میں جناب قاضی محمد وحیدالدین خاں کے یہاں رہ کر تکمیل تعلیم کی، طبابت پہلے بہار شریف، پھر محلّہ بگھیہ شیخپورہ ضلع مونگیر میں کی، اور وہاں کے نواب علی خاں کے دربار میں بڑی عزت ووقار کے ساتھ رہے، مزاج شاہانہ تھا، نازک مزاجی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی، لیکن اپنے فن میں بڑی مہارت رکھتے تھے، اس لئے خاص وعام دونوں ان کی ناز برداری کرتے تھے، تقریباً چالیس سال تک وہاں مطب کر کے ۱۳۰۳ھ میں وفات پائی، بادۂ تصوف کے بھی ذوق آشنا تھے، بہار شریف کی درگاہ انبیر شریف کے سجادہ نشین حضرت شاہ محمد نور قدس سرہ العزیز سے بیعت تھے، اور اسی مناسبت سے تصوف پر ایک رسالہ ''نور محمدی'' کے نام سے لکھا تھا، جو چھپ کر شائع ہوگیا ہے، طب پر بھی چند کتابیں لکھیں جن کے نام یہ ہیں، قرابادین محمدی جس کا تاریخی نام ''مخزن الحکمۃ العلیاء'' ہے، دستور العلاج یا اصول علاج، یہ دونوں کتابیں حضرت سید صاحب کے والد ماجد کی تعلیم کی خاطر لکھی تھیں، حکیم محمدی شعر وشاعری سے بھی ذوق رکھتے تھے، اور کبھی کبھی مناجات، بزرگان دین کی منقبت اور اپنے خاندان کے بزرگوں کی تاریخ وفات کہا کرتے تھے، انہوں نے اپنا نسب نامہ بھی منظوم کیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ پدری سلسلہ میں رضوی اور مادری سلسلہ میں زیدی تھے

ایں نسب نامہ جانب مادر   نظم کریم برائے حفظ پسر
نام اجداد و مادر خود را   ازرہِ صدق می کنم انشا
رضوی ام بے گماں زروئے پدر   زیدی ام من زجانبِ مادر
جدہ ام بنت میر عبداللہ   پس بجاں می کنم شکراللہ
جد امجد طبیب حاذق بود   میر خادم حسین فایق بود

بے شک و شبہ آں مسیح زمن   عالم طب و ماہر ہرفن
میر کاظم حسین اموں جاں   بے گماں بود آں طبیب زماں

حکیم محمدی کے چھوٹے بھائی مولوی مصطفیٰ شیر نے جونپور میں مولانا سخاوت علی سے تعلیم پائی، جو مولانا ابوبکر شیث مرحوم سابق صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے جد امجد تھے، اسی لئے سید صاحب اور مولانا ابوبکر شیث صاحب کے بڑے گہرے مراسم تھے، اور مولانا مرحوم دیسنہ بھی تشریف لائے تھے، مولوی مصطفیٰ شیر حصول تعلیم کے بعد سہسرام کے عربی مدرسہ کے صدر مدرس ہوئے اور وہیں وفات پائی۔

حکیم محمدی صاحب کے تین صاحبزادے تھے، جن میں سب سے بڑے سید صاحب کے والد ماجد حکیم سید ابوالحسن صاحب تھے، ان کی شادی حکیم سید حیدر حسین کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی جو میری سگی پھوپھی تھیں، پہلے ذکر آچکا ہے کہ حکیم سید حیدر حسین اسلام پور ضلع پٹنہ کے مشہور رئیس چودھری ظہور الحق کے خاندانی معالج تھے، ان کی وفات کے بعد حکیم سید ابوالحسن ان کی جگہ خاندانی طبیب مقرر ہوئے، اور بڑے اعزاز کے ساتھ رہے، ان کی پوری زندگی وہیں گزری اور یہیں حضرت شاہ ولایت علی نقشبندی سے بیعت بھی کی، اور ان کے ساتھ حج کو بھی تشریف لے گئے، لیکن مرشد سے تربیت ابھی پورے طور سے حاصل نہیں کی تھی کہ ان کا وصال ہوگیا، جس سے حکیم صاحب موصوف کی تشنگی باقی رہ گئی، اس لئے کچھ دنوں کے بعد طبیعت میں اضطراب پیدا ہوا، جب یہ کیفیت ناقابل برداشت ہوگئی تو رہبر کی تلاش میں گھر سے پیدل نکل کھڑے ہوئے، بہار شریف کے ہر خانوادہ میں گئے مگر تشفی نہیں ہوئی، جھٹلی شریف اور پٹنہ سیٹی وغیرہ میں ٹھہرے، لیکن وہاں بھی سیری نہیں ہوئی، آخر میں پھلواری شریف کی خانقاہ پہنچے، صبح کا وقت تھا، سائبان میں لوگ بیٹھے تھے، چائے کا دور چل رہا تھا، یہ بھی ایک گوشہ میں جا کر بیٹھ گئے، حضرت شاہ علی حبیب قدس سرہٗ اس وقت سجادہ نشین تھے، انہوں نے اپنے خادم سے کہہ رکھا تھا کہ آج ایک مہمان آنے والے ہیں، وہ جب آجائیں تو اطلاع کرنا،

جب کچھ تاخیر ہوئی تو خادم کو بلایا، خادم نے کہا کوئی مہمان ابھی تک نہیں آیا ہے، شاہ صاحب نے تاکید کی کہ باہر جا کر غور سے دیکھو، خادم باہر آیا تو برآمدہ میں ایک نووارد کو دیکھا جو سید صاحب کے والد ماجد تھے، ان کو ساتھ لے کر شاہ صاحب کے پاس گیا، دونوں میں تخلیہ میں ڈھائی گھنٹہ تک راز و نیاز کی باتیں ہوتی رہیں، چار دن کے بعد واپسی کا حکم ہوا، اور اسلام پور آ کر پوری عمر ریاضت وعبادت میں گزار دی، اور وفات کے بعد اپنے مرشد کے پائیں سپرد خاک ہوئے۔

حکیم سید ابوالحسن کے ایک لڑکی اور دو لڑکے تھے، صاحبزادی گاؤں ہی میں سید امیرالحسن ابن میر واعظ شیر بن میر صفدر شیر سے بیاہی گئیں، لیکن شادی کے فوراً ہی بعد بیوہ ہوگئیں، گاؤں کی تعلیم یافتہ خواتین میں ان کا پہلا یا دوسرا درجہ تھا۔

بڑے صاحبزادہ کا اسم شریف سید ابوحبیب تھا، ان کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی، عربی پٹنہ اور پھلواری شریف میں پڑھی، حضرت شاہ عین الحق صاحب خلف شاہ علی حبیب قدس سرہٗ کے ہمدرس تھے، مولانا شاہ نعمت علی صاحب سے حدیث اور پھر طب کی تعلیم پھلواری شریف میں مولانا شاہ سید سلیمان اور حکیم وارث حسن صاحب، اور پٹنہ میں حکیم محمد نصیر سے پائی، بھوپال میں حضرت شاہ ابواحمد مجددی سے بیعت تھے، ان کا انتقال ۱۹۲۷ء میں ہوا، اور کاغذی محلّہ بہار شریف میں سپرد خاک ہوئے، ان کے صاحبزادہ مولانا ابوظفر صاحب ندوی تھے، جو علمی دنیا میں اچھی طرح روشناس ہیں، تین صاحبزادیاں بھی ہیں، ایک سید عبدالباری صاحب اور سیر سے بیاہی گئیں جو اب کراچی میں مقیم ہیں، دوسری مولوی عبدالحفیظ ندوی سے منسوب ہیں جو ریلوے ہائی اسکول کھڑگپور سے ریٹائر ہو کر اب دیسنہ میں مقیم ہیں، تیسری اس حقیر راقم کی رفاقت کر رہی ہیں۔

سید صاحب اپنے بڑے بھائی سے تقریباً ۱۹؍سال چھوٹے تھے، گاؤں میں ان کا جدی مکان داؤد مرحوم کے مکان کے نام سے مشہور ہے، لیکن ان کے والد ماجد حکیم سید ابوالحسن نے اپنی شادی کے بعد ایک علیحدہ مکان بنوایا جو اس وقت گاؤں کی

مسجد کے پچھم اور شمال میں واقع ہے، اور اس میں آج کل ان کے خاندانی خادموں کا خاندان آباد ہے، یہیں سید صاحب کی ولادت ہوئی، ان کے والد نے ان کا نام ابونجیب رکھا، لیکن ان کے منجھلے چچا سید ابوتراب مرحوم نے سلیمان اعظم رکھا، اور وہ سلیمان ہی کے نام سے پکارے گئے۔

سید صاحب نے اردو کی تعلیم اپنی ہمشیرہ سے پائی، وہ شروع سے کم آمیز تھے، اور گاؤں کے ہمسن لڑکوں سے بہت کم ملتے تھے، گاؤں میں ایک زندہ دل بزرگ مولوی محمد یٰسین جو یٰسین چچا کے نام سے مشہور تھے ایک لڑکے محمد حنیف کو پڑھایا کرتے تھے سید صاحب کچھ دنوں محمد حنیف کے ساتھ ان کے پاس بھی بٹھائے گئے اور پارۂ عم کی کچھ سورتیں ان سے پڑھیں، لیکن جلد ہی مولوی مقصود علی صاحب ساکن موضع اوکھدی ضلع پٹنہ خاص طور پر سید صاحب کی تعلیم کے لئے بلائے گئے، ان کے آنے کے بعد ایک مکتب قائم ہوا، جس میں میرے علاوہ سید مظاہر حسن مرحوم (حافظ) عبدالصمد مرحوم، محمد حنیف (مختار مرحوم) ملک رشید الحق، توحید شاہ کے بڑے بھائی عبدالقادر اور دو ہندو سنار کے لڑکے شریک ہوئے، یہ مکتب جہاں قائم ہوا تھا، وہ اس وقت صغیر مرحوم کا دروازہ کہلاتا تھا، صغیر مرحوم مولانا ابوظفر ندوی کے چھوٹے ماموں تھے، سید صاحب نے کلام مجید مولوی مقصود علی صاحب ہی سے ختم کیا، اور فارسی شروع کی، ان کے ساتھ میں بھی آمدنامہ، کریما، نسخہ تعلیمیہ، گفتگو نامہ اور گلستاں باب اول و دوم پڑھتا رہا، ہم لوگوں کی تعلیم اس مکتب میں غالبًا دو ڈھائی سال رہی، سید صاحب اپنے ہم مکتبوں سے نہ بے تکلفی سے ملتے اور نہ ہمارے کھیلوں میں شرکت کرتے، ہم لوگ چندہ کر کے کوئی چیز پکاتے تو چندے میں تو شریک ہو جاتے، لیکن چیزوں کی فراہمی میں دوڑ دھوپ کرنا پسند نہ کرتے تھے، البتہ گاؤں کی ندی میں جب کبڈی ہوتی تو اس میں شریک ہو جاتے، اور کبڈی اچھی کھیلتے تھے، کبھی کبھی ہم لوگ کوئی تمثیلی ڈرامہ کرتے تو اس میں بھی وہ شریک ہوتے اور ہم لوگ ان کو ہیرو کا پارٹ دیتے۔

سیدصاحب کے بڑے بھائی حکیم سیدابوحبیب جب تعلیم پاکر دیسنہ تشریف لائے، اور یہاں مطب شروع کیا تو ہم دونوں نے ان سے گلستاں باب ہشتم، بوستاں، یوسف زلیخا اور رقعات عالمگیر وغیرہ پڑھیں، پھر عربی شروع کی، اور میزان منشعب، پنج گنج، زبدہ، صرف میر، فصول اکبری اور نحو میں شرح ملا جامی تک پڑھی، منطق میں کبریٰ، میزان، منطق اورتہذیب تک تعلیم پائی، اس درس میں ہم لوگوں کے ہم وطن مولانا محمد قاسم بن حافظ شاہ مولانا تجمل حسین خلیفہ مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی بھی شریک ہوتے تھے، میرا زیادہ وقت جناب حکیم سیدابوحبیب کے گھر ہی پر گزرتا، میری پھوپھی یعنی سیدصاحب کی والدہ مجھ سے گھر کا جو کام بھی لیتیں میں بلاتکلف کردیتا، کبھی چارپائی بنی جاتی تو میں بھی شریک ہوجاتا، سیدصاحب کوان کاموں سے کوئی دلچسپی نہ تھی، ان کی والدہ اور ہمشیرہ ان پر خفا ہوتیں تو وہ کہتے کہ نجم الہدیٰ آپ لوگوں کا پلنگ بن دیتے ہیں اس لئے وہ اچھے ہیں، میں نہیں بنتا اس لئے برا ہوں۔

اسی زمانہ میں مولوی حکیم سیدابوحبیب کو اپنے گاؤں کی عورتوں کی معاشرتی اصلاح کا خیال ہوا، ان میں بہت بڑی رسمیں اور بدعتیں رائج تھیں، حکیم صاحب عورتوں کو ہفتہ میں دو روز اپنے گھر بلاکر ان کی تربیت واصلاح فرماتے، اور رمضان شریف میں پند ونصیحت کا سلسلہ روزانہ جاری رہتا، اس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ میں یا سیدصاحب حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کی تقویۃ الایمان کی قرأت کرتے اور حکیم صاحب اس کا مطلب بیان کرتے، اور موقع موقع سے قرآن شریف کے احکام اوامر ونواہی بھی سناتے جاتے، یہ سلسلہ گیارہ بجے دن تک رہتا، اسی سے میرے اور سیدصاحب کے عقائد میں پختگی کی بنیاد پڑی، جس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں محرم میں امام باڑہ اور تعزیہ داری کے تماشوں سے پرہیز کرنے لگے، اور جو لوگ اس میں شریک ہوتے تھے، ان کے خلاف ہم دونوں نے ایک تحریر مرتب کی۔ اور اس کو لفافہ میں بند کرکے ان لوگوں کے پاس بھجوادیا، تعزیہ اور سپر بنانے والوں میں ہم دونوں کے بزرگ بھی تھے، ان بزرگوں کو یہ تحریک ناگوار گزری، چونکہ

میرے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی، اس لئے میں ان کی عدالت میں حاضر کیا گیا، اور یہ سزا تجویز کی گئی کہ پچیس بار کان پکڑ کر اٹھوں بیٹھوں، اس کے بعد میں ایک شریر لڑکے کی حیثیت سے مشہور ہوا، اور سیدصاحب بدستور نیک لڑکوں میں شمار ہوتے رہے۔

حکیم سیدابوحبیب صاحب کچھ دنوں کے لئے اپنے پیرومرشد کے یہاں بھوپال تشریف لے گئے تو ہم دونوں نے مولانا سید بشارت کریم سے پڑھنا شروع کیا، یہ میرے ہمزلف عبدالباری صاحب کے والد ماجد تھے، اور اس زمانہ میں استھانواں میں حافظ ملک شرف الدین کو حدیث شریف کا دورہ کرا رہے تھے، ہم دونوں روزانہ صبح کے وقت استھانواں جاتے اور سبق لے کر واپس آتے تھے، استھانواں دیسنہ سے ایک میل کی مسافت پر ہے، جب بھوپال سے حکیم صاحب واپس آگئے تو پھر ہم لوگ ان سے درس لینے لگے، ان ہی کے ساتھ ہم لوگ ظہر کی نماز پڑھنے مسجد جایا کرتے، جہاں نماز کے بعد اخبار وکیل امرتسر پڑھا جاتا اور گاؤں کے لوگ دلچسپی سے سنتے، اس زمانہ میں سرسید احمد خاں کی مخالفت میں پرزور مضامین نکل رہے تھے، ان مضامین سے مجھ کو تو کوئی دلچسپی نہ ہوتی تھی لیکن سیدصاحب غور سے سنتے۔

۱۸۹۷ء کے آخر یا ۱۸۹۸ء کے اوائل میں حکیم صاحب حج کے لئے تشریف لے گئے، اس وقت ہم دونوں کی تعلیم کا سلسلہ ٹوٹ گیا، سیدصاحب کو ان کے والد اپنے ساتھ اسلام پور لے گئے اور چھ مہینے اپنے ساتھ رکھا، وہ بڑے رکھ رکھاؤ کے بزرگ تھے، ان کے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے اور بات چیت کرنے میں بڑا وقار ہوتا، اس لئے ہم لوگ جب کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو ان کے سامنے بڑے ادب سے بیٹھتے، وہ کوئی سوال کرتے تو جواب دیتے وقت بڑی سنجیدگی اختیار کرنی پڑتی، جب وہ اسلام پور سے دیسنہ تشریف لاتے تو ہم دونوں کو ان کے ساتھ دسترخوان پر شرکت کرنے کی سعادت حاصل ہوتی، کھانے میں ہم لوگوں کے منہ سے آواز نکلتی تو فرماتے کہ انسان اس طرح نہیں کھاتے، کتے اور بلی اس طرح کھاتے ہیں، سیدصاحب کی آواز ہمیشہ سے پست اور دھیمی

تھی، اور ایک بار حکیم صاحب نے ان سے کچھ پوچھا تو حسب معمول بہت ہی دھیمی آواز میں جواب دیا، جس کو حکیم صاحب نے نہیں سمجھا، اس لئے پھر پوچھا، سید صاحب نے پھر اسی آواز میں جواب دیا، حکیم صاحب نے جھلاّ کر کہا: ”منہ سے آواز کیوں نہیں نکلتی، جی چاہتا ہے کہ تمہارا منھ نوچ لیا جائے“، اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد انجمن الاصلاح دیسنہ کا سالانہ جلسہ تھا، جس کی صدارت حکیم صاحب فرما رہے تھے، اس موقع پر سید صاحب نے بھی تقریر کی جو سامعین نے پسند کی، اس تقریر کو سن کر حکیم صاحب نے فرمایا کہ میں نہیں سمجھتا کہ ابو نجیب کو بولنا بھی آتا ہے۔

حکیم صاحب سید صاحب کو تعلیم کے لئے اسلام پور سے پھلواری شریف لے گئے، پھر مجھے بھی پھلواری پہنچا دیا، وہاں میر عابد حسین کے یہاں میرے قیام کا انتظام تھا، اور سید صاحب خانقاہ کی ایک کوٹھری میں مقیم تھے، میری قیام گاہ کے متصل حضرت مولانا شاہ سلیمان پھلواروی کا مکان تھا، اور ان کے صاحبزادوں سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں، پھلواری شریف سے ہم لوگوں کو پرانا قلبی تعلق تھا، سید صاحب کے والد ماجد نے حضرت شاہ علی حبیب سے فیوض حاصل کئے، میرے بزرگوں کو بھی اسی خانوادہ سے عقیدت وبیعت تھی، اس لئے یہاں ہم لوگوں کو اجنبیت محسوس نہیں ہوئی، ہماری تعلیم حضرت استاذی مولانا شاہ محی الدین کے سپرد ہوئی، وہاں کے مدرسہ میں اس وقت مولانا عبدالرحمٰن کاکوی صدر مدرس تھے، جو مولانا شاہ محی الدین کو حدیث کا دورہ کراتے تھے، ان کے ہم درس مولانا شاہ معین الدین مرحوم، جناب شاہ محمد خلیل، جناب شاہ حکیم محمد شعیب، جناب حکیم عبدالمنان صاحب، جناب مولانا رحیم بخش صاحب آروی بانی مدرسہ فیض الغرباء آرہ اور جناب حافظ محمد وصی صاحب ساکن ہزاری باغ بھی تھے، یہ حضرات طلبہ کو شوقیہ درس بھی دیتے تھے، ہم اور سید صاحب دیسنہ سے قدوری اور تہذیب پڑھ کر آئے تھے، پھلواری پہنچ کر شرح وقایہ اور تہذیب شروع کی، مولانا رحیم بخش منطق بہت اچھی پڑھاتے تھے، وہ تہذیب پڑھاتے تو پوری طرح ذہن نشین کرادیتے، اور ان ہی کی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ جب

میں ندوہ میں داخل ہوا، تو منطق کے درس میں ہمیشہ ممتاز رہا، مولانا شاہ معین الدین مرحوم سے شرح وقایہ پڑھی، سید صاحب پھلواری کے قیام میں حسب معمول طلبہ سے کم ملتے جلتے تھے، ان کے مزاج میں شروع ہی سے تحمل، بردباری اور عفو و درگزر کا مادہ تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا، پھلواری کے مدرسہ میں جہان آباد ضلع گیا کا ایک لڑکا پڑھتا تھا، ۱۲؍ربیع الاول کے عرس کے موقع پر اس نے دھوکا دے کر ہم دونوں سے کچھ نقد وصول کرلیا، اس کے بعد سید صاحب سے اس کی ملاقات ہوئی تو نادم ہونے کے بجائے ان سے لڑنے لگا، میں بھی اتفاق سے وہاں پہنچ گیا، سید صاحب جیسے جیسے نرم ہوتے جاتے ویسے ہی وہ گرم ہوتا جاتا، میں نے اس کو سختی سے جواب دیا، وہ کچھ ہاتھا پائی پر اتر آیا، اور میں مغلوب ہو گیا، سید صاحب کھڑے تماشا دیکھتے رہے، اور انہوں نے میری کوئی مدد نہیں کی، جب وہ لڑکا چلا گیا تو میں ان پر بہت برہم ہوا کہ تمہاری خاطر تو میں لڑتا رہا اور تم نے کوئی مدد نہیں کی، جب میں زیادہ بگڑا تو بولے میں نے تم سے کب کہا تھا تم میری مدد کے لئے اس سے جھگڑا کرو، وہ خود ہی بولتے بولتے خاموش ہو جاتا اور اس کی نوبت ہی نہیں آتی۔

سید صاحب کا زیادہ وقت مولانا شاہ محی الدینؒ کی صحبت میں گزرتا، یا پھر کوئی اردو کی کتاب پڑھتے، مولانا عبدالحلیم شرر کا کوئی تاریخی ناول ان کو مل جاتا، تو اس کو شروع سے آخر تک پڑھ جاتے، سید صاحب کی کوٹھری کے پاس ہی ایک بزرگ مولوی عبداللہ رہتے تھے، ان کے چھوٹے بھائی مولوی محمد معشوق صاحب شاعر تھے، ان کے کمرہ میں شعر وشاعری کا چرچا رہتا تھا، سید صاحب اس مجلس میں ضرور شریک ہوتے، خانقاہ میں قوالی کی محفلیں برابر ہوتی رہتیں، سید صاحب ان میں بھی شوق سے شرکت کرتے، ان کو شعر و سخن سے فطری لگاؤ تھا، مگر اس پر جلا پھلواری شریف کے قیام میں ہوئی۔

اس زمانہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ مہاجر مکی کے خلیفہ مولانا شاہ منور علی نے مرشد کی ہدایت سے دربھنگہ میں ایک مدرسہ کھولا تھا، جس کا نام ”مدرسہ امدادیہ“ تھا، تھوڑے دنوں میں اس کی شہرت پھیل گئی، اس لئے ہم دونوں کو ۱۸۹۹ء میں پھلواری شریف

سے دربھنگہ بھیج دیا گیا، یہاں ہمارا قیام عم محترم سید امیر حسن کے یہاں تھا، جو عم محترم سید رحیم الدین مالک وایڈیٹر اخبار ''الپنچ'' کے حقیقی بھائی تھے، اسی مدرسہ میں ہم دونوں نے مولانا مرتضیٰ حسن صاحب دیوبندی سے ہدایہ جلد اول اور مولانا فدا حسین صاحب آروی سے تہذیب پڑھی، مدرسہ میں ہر ہفتہ مجلس مکالمہ بھی منعقد ہوتی تھی، طلبہ کو ایک ہفتہ پہلے کوئی عنوان دیدیا جاتا جس پر وہ مضمون لکھتے یا تقریر کرتے، داخلہ کے پہلے ہی ہفتہ میں ہم لوگوں کو اس میں شرکت کا موقع ملا، اور عنوان ''وقت کی قدر وقیمت'' دیا گیا، گھر آ کر ہم دونوں نے اس موضوع پر مضمون لکھنا شروع کیا، مگر میں مشکل سے دو صفحے لکھ سکا، اور سید صاحب نے اتنی ہی دیر میں چار پانچ صفحے لکھ ڈالے، اور اس کو مجلس مکالمہ میں پڑھا جس کی بڑی تعریف کی گئی، اور بعد میں یہ مضمون رسالہ ''مخزن'' میں شائع ہوا جو اس وقت شیخ عبدالقادر کی ادارت میں نکلتا تھا۔

۱۹۰۰ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کا سالانہ جلسہ پٹنہ میں منعقد ہوا، اس میں قدیم اور جدید تعلیم یافتہ جماعتوں کے افراد بڑے شوق سے شریک ہوئے، پنڈال میں بڑی شان وشوکت نظر آتی تھی، اور قدیم وجدید دونوں گروہوں کے تعاون کا بڑا دلکش اور موثر منظر تھا، صوبہ بہار کے اکثر علماء اس میں شریک تھے، ممتاز بیرسٹروں اور وکیلوں کی جماعت بھی تھی، بڑی دلپذیر تقریریں ہوئیں جن سے متأثر ہو کر سید صاحب کے والد ماجد نے فیصلہ کیا کہ ہم دونوں کو تعلیم کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء بھیج دیں، چنانچہ ہم لوگ برادر محترم محمد احسن مرحوم استھانوی کے ساتھ لکھنؤ روانہ ہوئے، سید محمد احسن صاحب سید صاحب کے پھوپھی زاد اور میرے چچازاد بھائی تھے، وہ اس زمانہ میں لکھنؤ میں طب کی تعلیم پا رہے تھے، اور مولانا شاہ محمد علی مونگیریؒ خلیفہ جناب مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی سے ان کے تعلقات تھے، مولانا محمد علی مونگیریؒ کی نظامت ندوۃ العلماء سے پہلے ان کی نگرانی میں سید محمد احسن صاحب تحفہ محمدیہ کانپور سے ایک رسالہ نکالتے تھے، جس میں اسلام پر عیسائیوں اور آریوں کے اعتراضات کے جوابات

دئے جاتے تھے، سید محمد احسن صاحب عزیزی محمد ہاشم ندوی سابق ناظم دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن کے والد ماجد تھے۔

ہم دونوں ۱۹۰۱ء کے آغاز میں لکھنؤ پہنچے، ہم سے پہلے ہمارے دو ہم وطن اور اعزہ مولانا عبدالسبحان بن حاجی شاہ سید محمد اسمٰعیل انسپکٹر پولیس اور مولانا محمد قاسم بن مولانا شاہ حافظ سید تجمل حسین خلیفہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی ندوہ پہنچ چکے تھے، مولانا عبدالسبحان مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کے ساتھ رہتے تھے، جو ان کے والد ماجد کے مرشد جناب شاہ محمد کامل صاحبؒ ولید پوری کے قریبی عزیز تھے، مولانا قاسم کے والد ماجد مولانا محمد علی مونگیریؒ کے پیر بھائی تھے، اس لئے ندوہ سے ان کو گہرا لگاؤ رہا، اور انہوں نے اپنے لڑکے کو یہاں داخل کیا تھا، ہم دونوں کا داخلہ ندوہ میں ہوا تو مولانا قاسم کے کمرہ ہی میں جگہ ملی۔

ہم لوگ دارالعلوم کی دوسری جماعت میں داخل ہوئے، جس میں مولانا عبدالسبحان اور مولانا قاسم پہلے سے تھے، اس وقت دارالعلوم میں کل چار درجے کھلے تھے، پہلے درجہ میں صرف، نحو اور حساب کی تعلیم ہوتی تھی، جو مولوی نجیب الدین مرحوم کے سپرد تھی، دوسرے درجہ میں صرف ونحو کی آخری کتابیں، فقہ، فرائض، منطق اور حساب کی تعلیم ہوتی تھی، تیسرے میں فقہ اور منطق کے علاوہ ادب اور فلسفہ بھی تھا، یہ دونوں درجے مفتی عبداللطیف سے متعلق تھے، چوتھے درجہ میں منطق، فلسفہ اور ادب کے ساتھ حدیث پڑھائی جاتی، اس کے اسباق شمس العلماء محمد حفیظ اللہ صاحب کے ذمہ تھے، اس وقت دوسرے درجہ میں سب سے زیادہ لڑکے تھے، ان میں کچھ طلبہ کے نام یاد ہیں، خاکسار، سید سلیمان، سید محمد قاسم دیسنوی، سید عبدالسبحان دیسنوی کے علاوہ ظہور احمد شاہجہاں پوری مرحوم، انجم مانپوری، گیاوی (صاحب طنزیات مانپوری) محمد مبین خلف ثانی مولانا محمد فاروق چریاکوٹی، حبیب الزمان خاں شاہجہانپوری خلف مولانا محمد مسیح الزماں خاں قائم مقام ناظم ندوہ وغیرہ تھے۔

چاروں درجے کے ادب کی تعلیم مولانا محمد فاروق چریا کوٹی کے متعلق تھی، اس کے علاوہ تعلیم کی نگرانی بھی ان ہی کے ذمہ تھی، داخلہ کے سال اول میں میرا اور سید صاحب دونوں کا معمولی طالبعلموں میں شمار رہا، سید صاحب کو حساب سے مطلق دلچسپی نہ تھی، اس لئے وہ مجھ سے بھی فروتر سمجھے جاتے تھے، استاذی مفتی عبداللطیف ہرسنیچر کو اور ہم سے اوپر والی جماعت کے درمیان منطق یا فلسفہ کے کسی مسئلہ پر مباحثہ کراتے، اس میں کبھی کبھی مولانا محمد حفیظ اللہ مدرس اول اور مولانا محمد فاروق چریا کوٹی بھی شرکت فرماتے، مناظرانہ گفتگو کرنے میں میری طبیعت بہت لگتی تھی، پھلواری شریف کے قیام کے زمانہ میں مولانا رحیم بخش آروی کے درس میں اس کی مشق بھی پیدا ہوگئی، اور ان ہی کے ذریعہ مجھ کو بہت سی مناظرانہ اصطلاحات سے واقفیت ہوگئی تھی، مثلاً تحصیل حاصل محال ہے، دعویٰ بلا دلیل قابل حجت نہیں ہوتا، مخالف اور منکر پر بار ثبوت نہیں، کسی مجہول شئے کی تعریف مجہول امور سے نہیں ہوسکتی، مسلمات اور بدیہیات سے انکار علمیت کے خلاف ہے، اسی لئے میں مباحثے اور مناظرے میں زیادہ حصہ لیتا اور نمایاں رہتا، شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب مہتمم دارالعلوم میری باتوں سے بہت خوش ہوتے، ۸/شعبان ۱۳۱۹ھ میں ندوہ کا سالانہ جلسہ کلکتہ میں ہوا، اس میں شریک ہونے کے لئے دارالعلوم سے ہر درجہ سے ایک ایک طالب علم کا انتخاب ہوا، میرے درجہ سے مولانا حفیظ اللہ صاحب کی تحریک سے میرا انتخاب ہوا، حالانکہ میں حقیقۃً اس کا مستحق نہیں تھا، تحریری اور علمی لیاقت کی بنا پر سید صاحب یا ظہور احمد شاہجہانپوری کا انتخاب ہونا چاہئے تھا۔

فروری ۱۹۰۳ء مطابق شوال ۱۳۱۹ھ میں جب ہم دونوں ترقی پا کر سال سوم میں پہنچے تو سید صاحب نے بال و پر نکالے اور مولانا محمد فاروق چریا کوٹی کے گھنٹہ میں جس میں عروض اور ادب کا درس ہوتا تھا، وہ نمایاں رہنے لگے، قصیدۂ بردہ اور دیوان ابوالعتاہیہ کے اسباق میں جب کوئی نیا محاورہ یا فعل آجاتا جس کے مختلف صلات سے معنی میں تبدیلی ہوتی، تو درس کے بعد مولانا ان محاورات اور افعال کی مختلف طریقوں

سے مشق کراتے، کبھی اردو فقرے عربی میں ترجمہ کرنے کے لئے دیتے، جس میں ان افعال اور محاورات کا استعمال ہوتا، کبھی اپنی طرف سے عربی جملے اردو میں ترجمہ کرنے کو کہتے، اس طرح نئے عربی محاورات اور افعال کی مشق کراتے رہتے، میری کاپی بھر جاتی تو اس کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا، مگر سید صاحب اس کو ضائع نہ کرتے، اور مولانا چریا کوٹی کی بتائی ہوئی باتوں کو یاد رکھتے، مولانا شبلی کے سفرنامہ کے آخر میں جدید عربی الفاظ کا جو فرہنگ شامل ہے، سید صاحب نے اس کو بھی یاد کر لیا تھا، اور لغت کی مدد سے ان کو حل کرتے تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ عربی کے مصر سے جو اخبارات ندوہ میں آتے تھے، ان کو آسانی سے سمجھ لیتے تھے۔

ہم لوگ جب متوسط درجہ میں آئے تو مرزا غلام احمد قادیانی کی ایک نظم عربی میں شائع ہوئی، جس کے بارے میں غیر معمولی فصاحت اور بلاغت کا دعویٰ تھا، سید صاحب نے اس نظم کو مولانا محمد فاروق چریا کوٹی کے سامنے پیش کیا، انھوں نے اس کی تمام ادبی خامیوں بلکہ معائب کو اچھی طرح واضح کر دیا، مولانا اشعار جاہلیت اور کلام پاک کی آیتوں سے عربی کے طرز بیان، طرز ادا، موقع شناسی اور مخاطب کی صلاحیت کے موافق طرز کلام کی نوعیت کو سمجھاتے اور اس کا فرق بتاتے، سید صاحب مولانا چریا کوٹی کے ایک ایک حرف کو لکھ لیتے اور فرصت کے اوقات میں دیکھا کرتے، مگر دوسرے طلبہ کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

اس زمانہ میں ندوہ میں مشہور شاعر حافظ جلیل حسن صاحب جلیل کے صاحبزادے محمد صدیق صاحب بھی تھے، ان کا ذوق بھی ادبی تھا، اور وہ بھی سید صاحب ہی کی طرح خاموش اور الگ تھلگ رہنے والے طالب علم تھے، سید صاحب نے ان کو اپنا ہم مذاق پایا، تو ان سے ان کے تعلقات ہوگئے، وہ اپنے والد ماجد کی وساطت سے سجاد حسین صاحب اڈیٹر اودھ پنچ لکھنؤ کے یہاں آتے جاتے رہتے، سید صاحب بھی ان کے ساتھ ان کے یہاں آنے جانے لگے، اس زمانہ میں اودھ پنچ کے آخر میں بطور ضمیمہ آزاد اخبار بھی منسلک

رہتا تھا، جس میں خبریں ہوتی تھیں، سید صاحب عربی اخباروں کی خبریں ترجمہ کرکے اس ضمیمہ میں کچھ دنوں تک دیتے رہے، اسی زمانہ میں مولانا عبدالعلی صاحب، آسی مالک اصح المطابع کے لائق شاگرد مولانا عبداللہ عمادی عربی میں ایک ماہانہ رسالہ ''البیان'' نکالتے تھے، سید صاحب نے اس میں بھی مضامین لکھنا شروع کئے، اس سے سید صاحب کی ادبی اور علمی صلاحیتیں تو ظاہر ہونے لگیں، لیکن اپنے درجہ میں بہت زیادہ ممتاز نہ تھے، سال دوم میں مفتی عبداللطیف صاحب نے منطق شروع کرائی تو منطق کی پہلی کتاب کبریٰ کا درس اپنے سامنے مجھ سے دلواتے، اور جہاں میں رکتا یا طلبہ کو مطمئن نہ کرپاتا تو مفتی صاحب تقریر شروع کردیتے، علم الفرائض میں بھی سید صاحب کچھ اچھے نہ تھے، بلکہ یہ خاکسار ان سے بہتر سمجھا جاتا تھا، لیکن قدرت کو ان سے بہت بڑا کام لینا تھا، اس لئے ان کی دبی صلاحیتیں آہستہ آہستہ ابھریں۔

استاذی مولانا مفتی عبداللطیف تعلیم وتربیت کے معاملہ میں بہت سخت تھے، تمام طلبہ ان سے تھراتے تھے، وہ بے ضابطگی اور عدول حکمی پر بڑی سخت سزا دیتے تھے، ندوہ کے باہر قریب ہی ایک مسجد تھی جس میں طلبہ نماز پنجگانہ پڑھتے تھے، فجر کی نماز میں لڑکا غیر حاضر رہتا، اس کو دوپہر کے کھانے میں گوشت کا پیالہ نہ ملتا، اور دال روٹی ہی پر قناعت کرنی پڑتی، سید صاحب رات کو دیر تک مطالعہ کرتے رہتے تھے، اس لئے فجر کی نماز کے وقت ان کی آنکھ نہ کھلتی اور ان کو اکثر دال روٹی پر قناعت کرنی پڑتی، وہ دن کو بھی سوجاتے تو مشکل سے اٹھتے تھے، ان میں پھرتی مطلق نہ تھی، کھانے کی گھنٹی سننے کے بعد بھی دسترخوان پر دیر کرکے پہنچتے، درجہ میں بھی کبھی وقت پر نہ آتے، مفتی عبداللطیف صاحب نے شروع میں تو سختی کی، لیکن جب ان کو اس کا اندازہ ہوگیا کہ وہ قصداً دیر کرکے نہیں آتے بلکہ ان کے مزاج ہی میں سستی ہے تو پھر چشم پوشی کرنے لگے، لیکن طلبہ ان کو ''پوستی'' کہا کرتے تھے، یہ بہار کی اصلاح ہے جو افیونیوں کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی جن طلبہ کی طرف مائل ہوتے، ان کو ان کی

طبیعت کی مناسبت سے کوئی نہ کوئی لقب دیدیتے، سید صاحب کو ''قیس'' کہا کرتے تھے، ظہور احمد شاہجہانپوری بہت لاغر اور دبلے تھے اس لئے ان کو ''ناحل'' کہتے، میں ذرا موٹا تازہ اور چلبلا تھا، اس لئے مجھ کو چنگیز خاں کہتے تھے۔

۱۹۰۳ء میں ہم دونوں چہارم یعنی متوسط اول میں آئے تو عربی ادب میں سب سے اچھے سید صاحب ہی سمجھے جانے لگے، ان کے بعد ظہور احمد شاہجہانپوری تھے، مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی سید صاحب پر بہت شفقت کرتے تھے، اور سید صاحب بھی ان کے مشورے کے مطابق ادب کی کتابوں کا مطالعہ بڑی محنت سے کرتے تھے، ان کے اسی ذوق کی بنا پر ان کو دارالاخبار کا ناظم بنایا گیا، اس زمانہ میں وہ عربی اخبارات کا گہرا مطالعہ کرتے رہے، جس سے عربی زبان میں ان کی صلاحیت اور زیادہ بڑھی، عربی ادب کے مطالعہ سے اردو ادب میں بھی ان کا ذوق نکھرنے لگا، دارالعلوم میں طلبہ اکثر مشاعرہ کرتے تھے، جس میں رکن الدین دانا سہسرامی تجمل حسین شاہجہانپوری، ظہور احمد شاہجہانپوری، مصطفیٰ خان ملیح آبادی، عبدالغفور شرر، سید محمد عثمان گیلانی اور عبدالسلام اعظمی کے ساتھ سید صاحب بھی اپنا طرحی اور غیر طرحی کلام سناتے، مگر ہم لوگ محض سامعین میں رہتے۔

اسی سال جناب شاہ محمد سلیمان صاحب پھلواروی اشاعت اسلام کے سلسلہ میں لکھنؤ آئے اور دارالعلوم ہی میں قیام فرمایا، ان کے ساتھ ان کے بڑے صاحبزادے حسن میاں مرحوم بھی تھے، جن سے سید صاحب کی بڑی بے تکلفی ہوگئی، حافظ شاہ تجمل حسین دیسنوی بھی دارالعلوم کی عمارتوں کی تعمیر کے سلسلہ میں مقیم تھے، اور اکثر دونوں بزرگوں کے ساتھ مولانا حفیظ اللہ کی بھی نشست ہوتی، ان تینوں کی گفتگوئیں ہم لوگ بہت دلچسپی سے سنتے، اس زمانہ میں تقریباً ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی معزز شخص دارالعلوم آتا اور طلبہ کا امتحان لیتا رہتا، مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی طلبہ کو پیش کرتے، اور معزز مہمان طلبہ سے سوال کرتے تو مولانا اس کو اس طرح دہراتے کہ سوال کا جواب معلوم ہوجاتا، اسی زمانہ میں نواب محسن الملک دارالعلوم تشریف لائے، طلبہ سے عربی اخبارات پڑھوا کر امتحان لیا، اس

میں سید صاحب اول آئے، انھوں نے نواب صاحب کی مدح میں اپنا ایک عربی قصیدہ بھی پڑھ کر سنایا جس سے نواب صاحب بہت محظوظ ہوئے، شاہ سلیمان پھلواروی نے خوش ہوکر فرمایا کہ انشاء اللہ ہر زمانہ میں ایک سلیمان بہار کی سرزمین میں علم اور دین کی خدمت کے لئے موجود رہے گا، یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔

۱۹۰۳ء میں مفتی عبداللطیف ندوہ سے مستعفی ہوکر مولانا شاہ محمد علی صاحبؒ کے پاس مونگیر چلے گئے، اور ان کی جگہ مولانا محمد شبلی مدرس تشریف لائے، اس جدید انتظام میں حکیم مولانا سید عبدالحیٔ صاحب معتمد مراسلات، منشی احتشام علی صاحب معتمد مال، مولانا فتح محمد صاحب معتمد تعلیم نامزد ہوئے، مولانا حفیظ اللہ صاحب مدرس اول اور مہتمم ہوئے، وہ اپنے متعلقین کے ساتھ ندوہ سے باہر رہتے تھے، اس لئے مولانا فتح محمد صاحب نے طلبہ کی نگرانی کے لئے اپنے ایک عزیز کو اتالیق مقرر کیا جو پولیس کی ملازمت ختم کر کے پنشن پاتے تھے، ان کا برتاؤ طلبہ کے ساتھ بالکل پولیس والوں کا جیسا تھا، طلبہ ان سے بے حد خفا رہتے، اور یہ زمانہ طلبہ کی معاشرتی حالت کے لحاظ سے بھی بہت خراب رہا، سرکس اور تھیٹر جاتے، شطرنج اور تاش کھیلنے کی وبا عام ہوگئی تھی، لیکن سید صاحب ان سب لغویتوں سے پاک وصاف رہے، اور سب سے الگ تھلگ کتب بینی میں مصروف رہتے، طلبہ کے قضیوں اور جھگڑوں سے ان کو کوئی سروکار نہ تھا۔

۱۹۰۴ء میں مولانا محمد فاروق چریا کوٹی ندوہ سے چلے گئے، تو سید صاحب پر کچھ دنوں تک ان کی علحدگی کا بڑا اثر رہا لیکن مولانا نے ادب کا جو ذوق ان میں پیدا کیا تھا اس کی آبیاری وہ برابر کرتے رہے اور اسی سال وہ انجمن المعین کے مستقل ناظم مقرر ہوگئے، اور میں محاسب مقرر کیا گیا، ان عہدوں پر ہم دونوں تکمیل تعلیم تک برابر رہے۔

اسی زمانہ میں ہم لوگ شہر جاتے تو قیصر باغ کے چوراہے پر ایک پادری صاحب کو اکثر وعظ کہتے ہوئے پاتے، سید صاحب کو ان سے ملنے جلنے کا موقع ملا، انہوں نے ان کو ایک عمدہ مجلّد ''بائبل'' دی، سید صاحب نے اس کا مطالعہ کیا جس سے ان کو غیر

مذاہب سے واقفیت حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا، ایک روز ہم لوگوں نے ایک اشتہار دیکھا کہ پادری جوالا پرشاد صاحب کرسچن اسکول میں حسب ذیل تین عنوانات پر لکچر دیں گے، ضرورت مذہب، موازنہ مذاہب، عیسائی مذہب کی برتری اور فوقیت، ندوہ کے طلبہ کی ایک جماعت پہلے دن لکچر میں شریک ہوئی، جس میں ہم دونوں کے علاوہ ضیاء الحسن علوی اور عبدالباری صاحب بھی تھے، جب پادری صاحب نے لکچر دینا شروع کیا تو ہم لوگوں نے ان پر اعتراضات شروع کئے، وہ بڑے حلم وانکسار سے جواب دیتے لیکن تشفی بخش نہ ہوتے، دوسرے دن ہم لوگ پھر پہنچے، موضوع موازنہ مذاہب تھا، سید صاحب نے پادری صاحب کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ وہ اسلام پر آدھ گھنٹہ تک اعتراض کریں اور آدھ گھنٹہ اس کا جواب دینے کے لئے ان کو وقت دیا جائے، پادری صاحب نے اس کو منظور نہیں کیا، اور پانچ منٹ کا وقت دیا، سید صاحب نے جوابی تقریر میں کہا کہ مذہب وہی قابل قبول ہوسکتا ہے جس کے احکام فطرت انسانی کے مطابق ہوں، نہ اس قدر سخت ہوں کہ انسان ان کا متحمل نہ ہوسکے، اور نہ ایسے نرم وآسان ہوں کہ ان کو انسان ناقابل اعتبار سمجھے، مثلاً عیسائی مذہب کی تعلیم ہے کہ اگر تمہارے ایک گال پر کوئی طمانچہ رسید کرے تو دوسرا گال بھی پیش کردو، یا تم سے کوئی عبا مانگے تو تم اپنی چادر بھی اس کو دیدو، یا ایسے تمام لذائذ کو جنھیں اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے لئے مباح اور جائز قرار دیا ہے، چھوڑ کر رہبانیت اختیار کرو، یا کنفشن کا یہ اصول ہے کہ اگر کوئی مرتے وقت پادری کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرلے تو وہ بالکل معصوم ہوجاتا ہے، کس طرح صحیح ہوسکتا ہے، عیسائیوں کا یہ عقیدہ کہ حضرت عیسیٰؑ اپنے کو مصلوب کرا کے اپنی امت کے گناہوں کا کفارہ بن گئے، انسان کو جرائم اور معاصی کے ارتکاب پر دلیر اور نڈر کردیتا ہے، سید صاحب نے ان باتوں کو کچھ ایسے مؤثر اور باوقار طریقہ پر پیش کیا کہ حاضرین ان کی تقریر سے بہت متاثر ہوئے، اور پھر پادری صاحب کا رنگ کچھ ایسا اکھڑا کہ وہ تیسرے دن لکچر دینے پر آمادہ نہیں ہوئے۔

سید صاحب نے شروع سے خالص عربی تعلیم پائی تھی، لیکن گفتگو کرنے، ملنے جلنے، تقریر کرنے اور لکھنے لکھانے میں ان کا وہ انداز نہ تھا، جو عربی کے طلبہ کا عام طور سے ہوتا ہے، اس کی ایک وجہ تو ان کی فطری صلاحیتیں تھیں، دوسرا بڑا سبب ان کے وطن کا ماحول تھا، گاؤں میں صرف ہم چند لڑکوں نے عربی کی تعلیم پائی تھی، ورنہ ہمارے تمام اعزہ اور ہم وطن انگریزی پڑھتے تھے، ہم دونوں جب چھٹیوں میں گھر جاتے تو ان ہی عزیزوں، دوستوں اور ہم وطنوں کا ماحول ہوتا، جن میں سے بعض یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے، ہم دونوں کے گہرے مراسم ملک مظفر امام عرف محمد وحید مرحوم، سید محی الدین مرحوم اور سید وحید النبی سے زیادہ تھے، ملک مظفر امام ام۔اے۔او کالج علی گڑھ میں تعلیم پا رہے تھے، اور وہاں کے بڑے ممتاز طالب علم تھے، ۱۹۰۶ء میں بی۔اے کیا، اسی زمانہ میں امیر حبیب اللہ خاں والی کابل کے ولی عہد سردار عنایت اللہ خاں اور ان کے چچا سردار نصر اللہ خاں ہندوستان آئے تو یونیورسٹی کی طرف سے وہ مترجم کی حیثیت سے ان کے ساتھ کئے گئے، اس کے صلہ میں سردار عنایت اللہ خاں نے ان کی بڑی پرزور سفارش کی اور وہ ڈپٹی کلکٹری میں لے لئے گئے، سید صاحب ان کو اور وہ سید صاحب کو بے حد عزیز رکھتے تھے، جب دونوں دیسنہ کی انجمن الاصلاح کے سالانہ جلسہ میں شریک ہو جاتے تو جلسہ کی رونق دوبالا ہو جاتی، سید صاحب ان کے عہدہ سے بہت خوش تھے، لیکن ۱۹۱۳ء میں عین عالم شباب میں ان کا انتقال ہو گیا، ان کے انتقال کی خبر سن کر سید صاحب اتنے متاثر ہوئے کہ مجھ سے کہنے لگے کہ افسوس وہ رہتے اور میں ان کے عوض میں چلا جاتا، سید محی الدین مرحوم میرے سگے ماموں زاد بھائی اور سید صاحب کے رشتہ میں بھتیجے تھے، وہ پٹنہ میں تعلیم پاتے تھے، ۱۹۰۹ء میں پٹنہ کالج سے بی۔اے کیا، اور ڈپٹی کلکٹری کے لئے نامزد ہوئے، لیکن عہدہ سنبھالنے سے پہلے ہی وفات پا گئے، سید صاحب ان سے بھی بہت ہی قریب تر تھے، اور ان کی وفات پر ایک پردرد مرثیہ انجمن الاصلاح کے جلسہ میں پڑھا، ان کے صاحبزادے سید صباح الدین عبدالرحمٰن جب دارالمصنفین پہنچے تو سید صاحب نے مجھ

سے کہا کہ اب مجھے موقع ملا ہے کہ محی الدین مرحوم کی دوستی اور محبت کا حق ادا کرسکوں، سید وحید النبی بفضلہٖ تعالیٰ میری ہی طرح ابھی زندہ ہیں، وہ محکمۂ آبکاری میں انسپکٹری کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے ہیں، اور خاندانی ثروت کی وجہ سے بڑی خوشحالی کی زندگی بسر کرتے ہیں، مولانا عبدالماجد دریابادی اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب گورنر صوبۂ بہار جب دیسنہ تشریف لائے تھے، تو ان ہی کے دولت کدہ پر شاندار دعوتیں ہوئی تھیں، سید صاحب ان سے آخر آخر وقت تک بڑے بے تکلف رہے، مذکورۂ بالا دوستوں اور عزیزوں کے علاوہ دیسنہ کے اور تمام انگریزی خوانوں کے ساتھ سید صاحب کا اٹھنا بیٹھنا رہتا تھا، اس لئے وہ ان کے خیالات اور رجحانات سے نہ صرف واقف بلکہ غیر شعوری طور پر متأثر بھی ہوتے رہے، اسی لئے ان میں نئی روشنی اور نئی تہذیب کی جھلک نظر آتی تھی، پھر جب ان کا حلقہ وسیع ہوا تو جس طرح وہ علماء کی جماعت کے حلقے میں جاتے اسی طرح انگریزی خوانوں کے مجمعوں میں بلا جھجھک شریک ہوتے، اس طرح قدیم وجدید گروہوں کا نقطۂ اتصال بن گئے تھے۔

۱۹۰۵ء میں ہم لوگ درجہ ششم میں پہنچے تو اسی سال مولانا شبلی نعمانی ندوہ میں مستقل طور پر آ گئے، اور اپریل ۱۹۰۵ء میں معتمد تعلیمات مقرر ہوئے، سید صاحب نے ان کی تشریف آوری کی تقریب ومسرت میں ایک فارسی قصیدہ کہا، طلبہ میں علمی وادبی صلاحیت کے لحاظ سے مولانا شبلی کی نظر سید صاحب اور ضیاء الحسن علوی پر پڑی اور ان کو انہوں نے ترجمے اور تلخیص کا کام دیا، مولانا شبلیؒ کے پاس عربی کے جتنے نئے رسالے آتے سید صاحب ان کو پڑھ کر ان سے پورا فائدہ اٹھاتے تھے۔

اس زمانہ میں ہمارے درس میں، ادب میں دلائل الاعجاز، حماسہ اور نقد الشعر تھیں، جن کو مولانا سید علی زینبی پڑھاتے تھے، اور پوری تیاری کر کے آتے تھے، حدیث میں ترمذی شریف، مؤطا اور بخاری شریف تھیں، ان کا درس مولانا حفیظ اللہ کے متعلق تھا، سید صاحب حدیث کے مطالعہ میں اپنے ہمدرس طلبہ سے ہمیشہ آگے رہتے تھے، جب میں

ترمذی کی جرح وتعدیل میں لگا رہتا تو وہ شاہ عبدالعزیز کی عجالۂ نافعہ اور بستان المحدثین کی ورق گردانی میں مشغول رہتے، اور جب مؤطا کا دور شروع ہوتا تو سید صاحب شاہ ولی اللہ صاحب کی سویٰ شرح مؤطا کا مطالعہ کرتے رہتے اور جب بخاری شریف کا دور شروع ہوتا تو سید صاحب عینی اور فتح الباری شرح بخاری اور تذکرۃ الحفاظ پڑھ کر اپنی معلومات میں اضافہ کرتے، اسی لئے اس کی نظر حدیث پر بڑی گہری تھی، جنوری ۱۹۰۵ء کے الندوہ میں حدیث پر ان کا مضمون شائع ہوا تو اس کی ہر طرف سے بڑی تعریف ہوئی۔

ندوہ میں درسی کتابوں کے علاوہ طلبہ کے لئے درس قرآن وفلسفہ جدید کی تعلیم اور تقریر کی مشق کا بھی انتظام تھا، درس قرآن میں مستقل طور پر صرف دو طلبہ ہی حاضر رہتے، ایک سید صاحب اور دوسرے ضیاء الحسن علوی، یہ درس مولانا شبلی نعمانیؒ دیا کرتے تھے، کچھ دنوں کے لئے مولانا حفیظ اللہ نے بھی دیا، فلسفہ جدید میں سید صاحب اور ضیاء الحسن علوی کے ساتھ میں بھی شریک ہوتا تھا، لیکن اور طلبہ زیادہ دنوں تک ساتھ نہ دے سکے، اس کی تعلیم مولانا حمید الدین فراہی اور ان کے بعد پروفیسر مرزا سید محمد ہادی دیتے تھے، تقریر کی مشق میں بہت سے طلبہ شریک ہوئے اس کے پہلے گروپ میں عبدالباری بہاری مرحوم، سید سلیمان اور ضیاء الحسن علوی تھے، دوسرے میں خاکسار کے علاوہ حافظ عبدالصمد اعظمی، قمر الدین اعظمی اور محمد یوسف تھے، تیسرے میں عبدالسلام، مسعود علی اور عبدالواجد تھے، ان میں عبدالباری مرحوم نے اچھی مشق پیدا کی، وہ مولوی غلام محمد شملوی سفیر ندوہ کے ساتھ یوپی کے شہروں کا دورہ کرکے تقریریں کرتے تھے۔

۱۹۰۵ء میں ہم لوگوں کے سامنے ندوہ کا پہلا گروہ فارغ التحصیل ہوا، اس میں مولوی عبدالباری مرحوم، مولوی محمد جلیل اعظمی، مولوی عبدالرحمٰن فتحپوری، مولوی محمد یوسف خلف مولانا حفیظ اللہ صاحب تھے، ان تمام حضرات نے ندوہ کی تعلیم سے فراغت کے بعد طب شروع کی، البتہ مولوی محمد یوسف ندوہ ہی میں مدرس ہوگئے، ۱۹۰۶ء میں دوسرا گروہ فارغ ہوا جس میں مولوی ضیاء الحسن علوی بھی تھے، وہ ندوہ کے بعد علی گڑھ ام۔اے۔او

کالج چلے گئے اور یہاں سے ایم۔اے کیا، ۱۹۰۶ء میں ندوہ کا سالانہ جلسہ بنارس میں ہوا، تو اس میں تقریر کرنے کے لئے ندوہ سے دو طلبہ منتخب ہوئے، مولوی عبدالباری بہاری اور سید صاحب، مولوی عبدالباری کی آواز بلند تھی، ان کو غلام محمد صاحب شملوی کے ساتھ بہت سی جگہوں پر تقریر کرنے کا اتفاق ہو چکا تھا، اس لئے ان کی تقریر ایسی کامیاب رہی کہ مولانا شبلی نے غایت محبت میں عین تقریر کے دوران ہی میں اپنی عبا ان کو پہنا دی، سید صاحب کی آواز دھیمی تھی، اس لئے ان کی تقریر کا وہ اثر نہ ہوسکا، جو مولوی عبدالباری کی تقریر کا ہوا تھا، لیکن جو حضرات پنڈال پر تشریف فرما تھے، انہوں نے سید صاحب کی سلجھی ہوئی تقریر کی داد مولانا شبلی کو دی، اور جناب شاہ سلیمان پھلواروی نے خوش ہوکر سید صاحب کو اپنی عبا دینے کا وعدہ کیا، جس کا تقاضا سید صاحب ان سے برابر کرتے رہے، ۱۹۰۶ء میں مولانا ابوالکلام آزاد الندوہ کی سب ایڈیٹری کے بعد وکیل کی ادارت سنبھالنے کے لئے امرتسر چلے گئے، سید صاحب کی تحریر میں اس وقت تک پختگی آگئی تھی، اس لئے مولانا شبلی نے الندوہ کا پورا کام ان کے ذمہ کردیا جس کو انہوں نے بڑی خوبی سے انجام دیا، اسی سال ہم لوگوں کا سالانہ امتحان مولانا شبلی نعمانی کی نگرانی میں ہوا، اور سید صاحب کے ساتھ میں بھی امتیازی حیثیت سے پاس ہوا، اس وقت امتحان میں صرف تین طلبہ شریک ہوئے تھے، ہم دونوں اور عبدالخالق رمضان پوری بہاری تھے۔

۱۹۰۷ء کے مارچ میں تقسیم اسناد کا جلسہ ہوا، جس میں ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۶ء تک کے فارغ التحصیل طلبہ شریک تھے، حاضرین میں ندوہ کے حامی اور مخالف، ہمدرد اور نکتہ چیں دونوں تھے، اس موقع پر مولانا شبلی نے اپنے مخصوص اور عزیز طلبہ کی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرانے کی خاطر ان سے تقریریں کرائیں، پہلے مولوی ضیاء الحسن علوی نے اردو میں کلام پاک کے اعجاز پر تقریر کی، پھر سید صاحب نے ''علوم جدید وقدیم'' کے عنوان پر اردو میں تقریر شروع کی، تقریر کے دوران ہی میں کسی نے کہا کہ اگر عربی میں تقریر کریں تو ہم ندوہ کی کرامات کا یقین کریں، مولانا شبلی نے کھڑے ہوکر کہا کہ ہاں یہ عربی میں بھی تقریر

کرسکتے ہیں، کوئی صاحب چاہیں تو اسی وقت موضوع مقرر کردیں، خواجہ غلام الثقلین نے ''ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی'' موضوع مقرر کیا، سید صاحب نے بغیر کسی جھجک کے فوراً عربی میں تقریر شروع کردی اور بہت فصیح وصحیح زبان میں تقریر کی جس سے حاضرین بہت متأثر ہوئے اور مولانا شبلیؒ نے غایت خوشی میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر شاگرد کے سر پر باندھ دیا، اس کے بعد ندوہ کے معاندین نہ صرف خاموش ہوگئے بلکہ اس کے حامی بن گئے، اس جلسہ کی صدارت مولانا غلام محمد صاحب ہوشیار پوری کررہے تھے، انہوں نے طلبہ کو ایک ایک حمائل مطبوعۂ بیروت عطا فرمائی، سید صاحب اس حمائل کو ہمیشہ سفروحضر میں ساتھ رکھتے اور اسی سے تلاوت فرماتے تھے، اثنائے تلاوت میں کوئی خاص بات ذہن میں آجاتی تو اس کو حاشیہ پر لکھ دیتے، کاش وہ حمائل دارالمصنفین کو مل جاتی تو اس سے استفادہ کرنے کا موقع ملتا، ورنہ جہاں ہوگی بجز طاق نسیاں پر پڑی رہنے کے کوئی اس سے فائدہ اٹھانے والا نہ ہوگا۔

ہم دونوں ۱۹۰۷ء میں جب ندوہ سے فارغ ہوئے تو میری اور سید صاحب کی راہیں الگ الگ ہوگئیں، میں زندگی کے کچھ نشیب وفراز دیکھنے اور کچھ دنوں طبابت کرنے کے بعد سرکاری اسکول میں عربی، فارسی اور اردو پڑھانے میں لگ گیا، لیکن سید صاحب ان تینوں زبانوں میں علمی افق پر بدر کامل بن کر چمکے، اور میں ان کی ضیاء باری کا محض تماشائی بنا رہا۔

اوائل زندگی سے آخر وقت تک گھریلو زندگی میں ساٹھ سال سے زیادہ ان کا ساتھ رہا، یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ ان میں بشری کمزوریاں نہیں تھیں لیکن اس طویل مدت میں یاد نہیں آتا کہ انہوں نے مجھے کبھی ایسی بات کہی ہو جس سے مجھ کو تکلیف یا شکایت ہوئی ہو، ان کی بے تکلفی میں بھی سنجیدگی ہوتی تھی، ہنسی مذاق میں بھی وقار ہوتا، اور اپنے سے قریب تر رہنے والوں کو زیادہ اپنا گرویدہ اور شیفتہ بناتے تھے، ہم دونوں نے زندگی کا سفر ساتھ شروع کیا تھا، لیکن وہ جس طرح ہر شعبۂ زندگی میں مجھ سے آگے رہے، اسی طرح سفر

آخرت میں بھی سبقت کی اور مجھ کو پیچھے چھوڑ گئے، وہ اپنی دینداری، خشیت الٰہی، محبت رسول، پاکیزگیٔ نفس، طہارت طبع اور بلند کردار کی بدولت اپنے ساتھ بہت کچھ توشۂ آخرت لے گئے، اور اب جب کہ میں خلوت نشینی کی زندگی بسر کررہا ہوں، اور ان ہی کی بتائی ہوئی راہ پر گامزن ہوں تو میری آرزو صرف یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں ان سے چولی دامن کا ساتھ رہا، اور ان کی دینی ودنیاوی زندگی کے کمال وجمال کو بہت قریب سے دیکھتا رہا، اسی طرح آخرت میں جب ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کی بارش ہورہی ہو اس وقت میں ان کے ساتھ اس سے محروم نہ رہوں۔ آمین ثم آمین۔

سید الملتؒ کی مکتبی زندگی

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

جیسا کہ معلوم ہے، علامہ سید سلیمان ندوی غفر اللہ لہ صوبہ بہار کے مشہور ومعروف قریۃ السادات والملوک دسنہ (۱) نامی میں پیدا ہوئے، یوں تو سادات کرام کے موطن ومسکن ہونے کے بعد اطراف ونواح کی ممتاز بستیوں میں دسنہ بھی شمار ہوتا رہا، عموماً اہل علم وصاحب دل بزرگوں کو ہر زمانہ میں اس بستی میں ہم پاتے ہیں، مولانا مصطفیٰ شیر تقریباً سو سال پہلے ایک مشہور عالم دسنہ میں رہے، ان ہی مولانا مصطفیٰ شیر کے تلمیذ رشید مولانا الحاج سید یعقوب رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، جو اپنے علم اور اخلاص کی وجہ سے نفوس طیبہ میں شمار ہونے کا بجا استحقاق رکھتے ہیں، بادبانی جہاز سے کلکتہ وچٹگانگ سے حج وزیارت کی سعادت سے سرفراز ہونے کے بعد واپسی کے وقت ٹھیک جب بہار اپنے وطن میں ان کی کشتی مقام باڑھ کے قریب گنگا میں چل رہی تھی، تو اچانک اپنی زوجہ محترمہ سے جو سفر حج میں ہمراہ تھیں یہ فرمانے لگے کہ:

”دیکھو! میں بہشت کا مشاہدہ کر رہا ہوں“

یہ کہتے ہوئے گنگا میں کود پڑے، یہ جگہ گنگا کی ایسی تھی جہاں سے ڈوبنے والوں کو بآسانی نکال لیا جاتا ہے، کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا، جال مہاجال بڑے بڑے، ماہرین نے ڈالے، میلوں کے طول وعرض میں پتہ چلایا گیا، لیکن مولانا یعقوبؒ کی لاش کے برآمد کرنے میں لوگ کامیاب نہ ہو سکے، ”خبرش باز نیامد“ کی خبر مشہور ہوگئی، خود ہمارے

سید الملت رحمۃ اللہ علیہ جو سید صدر الدینؒ کے خاندان کی ایک شاخ میں پیدا ہوئے تھے، عموماً اہل علم وفضل تقویٰ ودیانت اس شاخ میں مسلسل پیدا ہوتے چلے آرہے تھے، سید الملت کے والد ماجد مولانا حکیم سید ابوالحسن حاذق طبیب ہونے کے ساتھ اپنے وقت کے عارف وکاسب بزرگ تھے، وجد وحال میں کبھی کبھی ان کی باطنی کیفیت، جس کے اخفا کی کوشش فرماتے تھے نمایاں ہو جاتی تھی، برادری میں شادی تھی، رخصتی کے وقت مشہور وداعی گیت لونڈیاں گا رہی تھیں، حکیم صاحب ممدوح مسجد میں تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ سمع مبارک میں گیت کے چند الفاظ پہنچ گئے، ایک ایسا حال ان پر طاری ہوا کہ مسجد کی دیوار پر سر دے مارا جس سے خون جاری ہو گیا۔

حکیم سید ابوالحسن صاحب مرحوم بہار کی ایک اسلامی ریاست اسلام پور کے دربار کے طبیب تھے، ان کے والد یعنی سید الملت کے جد امجد جن کا اصلی نام تو محمد شیر تھا لیکن عام طور پر ”حکیم محمدی“ کے نام سے مشہور تھے، اور طبابت ہی کا مشغلہ فرماتے تھے، ان ہی حکیم محمدی صاحب کے ایک بھائی مولانا مصطفیٰ شیر تھے، جن کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ عربی واسلامی علوم کی قدیم تعلیم گاہ سہسرام میں جو تھی اس کے صدر مدرس تھے، تیسرے بھائی کا نام باقر شیر تھا، ان کے خاندان میں بھی عام علمی ذوق کے ساتھ طب میں بعضوں نے خاص شہرت حاصل کی، اور اس زمانہ میں بھی بمبئی یونیورسٹی میں پروفیسر سعید رضا ندوی اپنے خاندانی اعزاز کی نمائندگی فرماتے ہیں۔

خود سید الملت کے بڑے بھائی مولانا حکیم ابو حبیبؒ بھی دسنہ کے مشہور طبیبوں میں تھے، اور ان کی باطنی نسبت کے متعلق میں نے جو کچھ سنا ہے وہ تو ایک مستقل داستان ہے، بھوپال کے ایک نقشبندی شیخ طریقت شاہ ابو احمد رحمۃ اللہ علیہ سے وہ بیعت ہی نہ تھے بلکہ نقشبندی سلسلہ کے مجاہدات وریاضات میں جو محنتیں انہوں نے برداشت کیں ہم تو شاید ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے، ان کا یہ ایک عمومی مجاہدہ تھا کہ جہاز سے اترنے کے بعد حج وزیارت کا سارا سفر پیادہ پا پورا فرمایا تھا، حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات کے تو عاشق

زار تھے، خاکسار سے ایک دفعہ فرمانے لگے کہ ''مکاتیب طیبہ'' کے خاص پہلوؤں پر میں نے کچھ لکھا بھی ہے، لیکن افسوس کہ وہ شائع نہ ہوسکا، حکیم ابوحبیب صاحب ہی کے صاحبزادے مولانا ابوظفر ندوی ہیں، جو اپنے بلند پایہ تصنیفات مثلاً تاریخ سندھ و گجرات، اور اپنے تحقیقی مقالات کی وجہ سے ملک میں کافی روشناس ہیں۔

ان بزرگوں کے سوا دسنہ میں پہلے بھی اور اس وقت تک اسلامی و دینی علوم کے بھی، اور جدید مغربی یونیورسٹیوں کے بھی، کافی فضلاء ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں، اپنی طالب علمی کے زمانہ میں مجھے یاد آتا ہے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں جب حاضر ہوا تھا تو معلوم ہوا کہ اس وقت ندوہ کے دارالعلوم میں دسنہ کے طالب العلموں کی تعداد سترہ تک پہنچ چکی تھی، جن میں ایک پروفیسر نجیب اشرف سلمہ اللہ تعالیٰ بھی تھے، اس وقت شاید نو دس سال سے زیادہ ان کی عمر نہ ہوگی، اب تو ماشاءاللہ اردو زبان کے مستند اساتذہ و مصنفین میں شمار ہوتے ہیں، بارک اللہ فی عمرہ وعملہ، پروفیسر سعید رضا بھی اسی زمانہ میں زیر تعلیم تھے، سید الملتؒ فارغ ہونے کے بعد درس اور رسالہ الندوہ میں مضمون نگاری کے کاروبار میں مشغول ہو چکے تھے، علاوہ ندوہ کے ٹونک جہاں خاکسار نے اپنی تعلیم کی پہلی منزل گزاری، وہاں بھی بہاری طلبہ میں دسنہ ہی کے چار چار طلبہ تھے، جن میں مولانا سید عبدالسبحان سابق استاذ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ نے خاص امتیاز حاصل کیا، آج کل تصوف وعرفان کی منزلوں کے طے کرنے میں مشغول ہیں، ان ہی کے منجھلے بھائی مولوی حکیم عبدالسلام تو بجائے دسنوی کے مستقلاً سالہا سال سے دہلوی بن چکے ہیں۔

بہرحال ان مختلف شخصیتوں کے علاوہ آج سے چالیس پینتالیس سال پہلے دسنہ میں اردو کی لائبریری انجمن الاصلاح کی طرف سے جو قائم کی گئی تھی رفتہ رفتہ بہ تدریج کتابوں، رسالوں، پرانے اخباروں کا ایک ایسا نادر ذخیرہ ہزار ہا ہزار کی تعداد میں اس لائبریری میں جمع ہوگیا ہے جو مجموعی حیثیت سے شاید سارے ہندوستان میں اپنی آپ نظیر ہے، اردو کا کوئی کتب خانہ اس ذخیرے کو میرا خیال تو یہی ہے کہ مشکل ہی سے پیش کرسکتا

ہے، پچھلے دنوں عمر خیام کی رباعیات کے ایک خاص مخطوطہ کی وجہ سے اس لائبریری کا ذکر یورپ و امریکہ کے اخباروں میں بھی کیا گیا تھا، یہ لائبریری مستحق ہے کہ حکومت اس کے غیر معمولی سرمایہ کی حفاظت کا انتظام کرے، سچ تو یہ ہے کہ یورپ و امریکہ میں اگر یہ لائبریری ہوتی تو خدا ہی جانتا ہے کہ ملک اور حکومت کی طرف سے اس کی قدر افزائیوں میں کیا کچھ نہ کیا جاتا، کتب خانہ کے قیام میں جن لوگوں کی غیر معمولی دلچسپیوں نے کام کیا ہے ان کے نام سنہرے حروف میں لکھے جاتے، کچھ بھی ہو، اس سلسلہ میں مولوی ابوالکمال مولوی سید عبدالحکیم صاحب قبلہ کی شخصیت ایک تاریخی شخصیت بن چکی ہے۔(۲)

بہرحال عرض یہی کرنا چاہتا ہوں کہ جس ماحول میں سید الملت کو ناسوتی وجود بخشا گیا تھا، اس کی خصوصیتوں کا کچھ سرسری اندازہ لوگوں کو ہوجائے، ورنہ تفصیلات کے لحاظ سے دسنہ تو مستحق ہے کہ اس کی مستقل تاریخ لکھی جائے۔(۳)

یہ حسن اتفاق ہے کہ فقیر کا کہفی زاویہ یعنی گیلانی جہاں دنیا سے واپس ہوکر آخری واپسی کے پیغام کا منتظر ہے، اسی ویرانہ میں آج کل سید الملت مرحوم کے ایک مکتبی رفیق بھی مقیم ہیں، ان کا نام مولوی سید محمد حنیف ہے، مولانا حاجی محمد یعقوب صاحب مرحوم دسنوی جن کا ذکر کرچکا ہوں، ان ہی کے یہ پوتے ہیں، دسنہ ہی کے رہنے والے تھے، شادی گیلانی میں ہوئی اسی تقریب سے گیلانی ہی کو مستقر بنالیا، پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں انٹر میڈیٹ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد مختارکاری کا امتحان پاس کیا تھا، لیکن اس پیشہ سے طبعی مناسبت نہ تھی، چھوڑ بیٹھے، سید الملت کے فاجعہ وفات کے بعد مولوی حنیف صاحب سے ان کی مکتبی زندگی کے بعض پہلو معلوم ہوئے، اسی کو قلم بند کرکے بھیج رہا ہوں۔

مولوی سید محمد حنیف صاحب کا بیان ہے کہ سید صاحب سے تین چار سال عمر میں اگرچہ وہ بڑے تھے، لیکن مکتب خانے میں ابجد سے فارسی کی عام درسی کتابیں گلستاں بوستاں وغیرہ تک دونوں نے سالہا سال تک ایک ہی استاذ سے ایک ہی مکتب خانہ میں پڑھیں، مکتب، دسنہ میں سید صاحب کے گھر پر قائم تھا، دسنہ ہی کے نواح میں اوکھدی (۴)

نامی بستی کے ایک معلم جن کا نام مولوی مقصود تھا، ان ہی کا تقرر بچوں کو پڑھانے کے لئے سید الملت کے والد ماجد مولوی حکیم ابوالحسن صاحب مرحوم نے کیا تھا، علاوہ کھانا، ناشتہ، پان، حقہ وغیرہ کے سید صاحب کے گھر سے مولوی مقصود صاحب کو دو روپے ماہوار ملتے تھے، اور جاڑوں کے موسم میں سید صاحب کے والد ماجد جب اسلام پور سے وطن دسنہ میں تشریف لاتے تو مولوی مقصود صاحب کے لئے روئی کا ایک وگلا، روئی بھرا ہوا پائجامہ، روئی کا کنٹوپ التزاماً ساتھ لاتے، گویا سرمائی لباس بھی تنخواہ کا ایک جز تھا۔

سید الملت کی حیثیت اس مکتب خانے میں گویا شاہ مکتب کی تھی، ان کے سوا دوسرے بچے بھی شرفاء دسنہ کے مولوی مقصود صاحب سے پڑھتے تھے، ان کے ہاں سے بھی ماہوار ان کی خدمت میں کچھ پیش کر دیا جاتا تھا، مولوی سید حنیف کے گھر سے ماہوار ایک روپیہ ملتا تھا، عموماً ۸/اور۴/ ماہوار کے دینے والے زیادہ تھے، عیدوں کے موقعہ پر بھی مولوی صاحب کو بچوں سے کافی آمدنی ہو جاتی تھی۔

مولوی سید حنیف صاحب کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں سید الملت کی تعلیم کا یہ نظم اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے والد ماجد کو اپنے بچے کی تعلیم کا حد سے زیادہ خیال تھا، سید صاحب کے استاذ کی قدر و منزلت کے جو مظاہر ان کی نظروں سے آئے دن گزرتے رہتے تھے ان ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس باب میں سید صاحب کے والد ماجد کا کیا حال اور کیا ذوق تھا۔ کہتے ہیں کہ ایام طفلی ہی سے فطرۃً سید صاحب کچھ خاموش رہنے کے عادی تھے، بچوں کی عام شرارتوں سے ان کی طبیعت کو جبلّۃً کسی قسم کی مناسبت نہیں تھی، اسی لئے شرارت وغیرہ کے قصوں میں مولوی سید محمد حنیف کا بیان ہے، سید الملت تنبیہ کے بہت کم محتاج تھے۔ خود اپنے متعلق بھی ان کا حسن ظن یہی ہے، البتہ اپنی جماعت کے ایک صاحب جنہوں نے بعد کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی، اور لکھنؤ ہی میں طب پڑھ کر مولوی حکیم سید نجم الہدیٰ کے نام سے مشہور ہوئے، الحمدللہ اس وقت تک بقید حیات ہیں، کچھ دن طبابت کا پیشہ ہزاری باغ میں کرنے کے بعد اسکول کے ہیڈ مولوی بن گئے، اور

اسی عہدہ سے وظیفہ یاب ہو کر آج کل دسنہ ہی میں خانہ نشین ہیں اور طبابت کی راہ سے اپنے وطن کے باشندوں کی خدمت فرما رہے ہیں۔ "العہدۃ علی الراوی" (السید محمد حنیف) کہ ساری مکتبی شرارتوں کے بانی مبانی بھی مولوی سید حکیم نجم الہدیٰ ندوی اس سلیمانی مکتب میں تھے، وہی کبھی مشورہ کرتے کہ آج ندی زوروں پر جا رہی ہے چلو! کرتے پائجامے اتار اتار کر کہتے ہیں کہ ساحل کے کنارے سے ہم لوگوں کو ندی میں کود جانے کا حکم دیتے، حکیم صاحب تیرنے سے واقف تھے، اس لئے تیرتے ہوئے وہ دور تک چلے جاتے، اور ہم دونوں (یعنی سید الملت اور مولوی سید حنیف) شناوری سے قطعاً چونکہ نابلد تھے، اس لئے کنارے ہی پر ہاتھ پاؤں پٹکتے رہتے، کبھی حکیم صاحب باغوں کی طرف مکتب کے بچوں کی توجہ منعطف فرماتے، ایک دفعہ اسی سلسلہ میں مولوی سید حنیف صاحب کا بیان ہے، ایک کافی اہم حادثہ بھی پیش آ گیا، بیری کے درختوں پر حملہ کر دیا گیا تھا، ایک چھوکری بیروں کی حفاظت کر رہی تھی، اس نے بچوں کو اس ظلم و تعدی سے روکنا چاہا، حکیم صاحب کو غصہ آ گیا، جیب میں چاقو تھا، غریب چھوکری کے کان پر جسے چلا دیا گیا، غالباً کل یا کچھ حصہ کان کا غائب ہو گیا، گاؤں میں اس واقعہ کی وجہ سے کافی سنسنی پھیلی، مقدمہ مولوی مقصود صاحب کے اجلاس میں پیش ہوا، اور کھجور کی چھڑی سے ہر ایک پر مولوی صاحب نے حد جاری کی۔

تعلیم کے ساتھ اخلاقی تربیت پر بقول مولوی حنیف صاحب سید الملت کے والد ماجد ہی کی کافی توجہ تھی، نشست برخواست، گفتار رفتار ہر مسئلہ میں دیکھتے رہتے تھے کہ کوئی نامناسب بات بچوں سے سرزد نہ ہو، اس باب میں ان کی نزاکت احساس کا حال یہ تھا کہ دسترخوان پر ایک دن جب سید الملت بھی اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ کھانے میں مشغول تھے چباتے ہوئے ہلکی سی آواز بھی پیدا ہوئی، دیکھا گیا کہ بے ساختہ ایک چپت رسید کی گئی، سید صاحب کے والد ماجد کہتے جاتے تھے کہ آدمی کے بچوں کو آدمی کے بچوں کی طرح کھانا کھانا چاہئے، کھاتے ہوئے منہ سے آواز تو کتے نکالتے ہیں، والد ماجد کے اسی نقطۂ نظر کی رعایت مولوی مقصود صاحب سید صاحب کے مکتب کے معلم بھی کرتے تھے، سچ

تو یہ ہے کہ اخلاق و عادات کے جس شریفانہ معیار کو سید صاحب کی زندگی پیش کرتی رہی، اس معیار کے قائم کرنے میں مکتبی زندگی کی ان کڑی نگرانیوں کو بھی غالباً دخل تھا۔

مکتبی تعلیم کے ان ہی دنوں میں جب طفلانہ بے ضابطگیوں میں سید الملت کی حیثیت مقلد کی تھی، ایک واقعہ کا تذکرہ مولوی سید حنیف صاحب کرتے ہیں جس میں بجائے مقلد کے امامت کا فرض سید صاحب ہی نے انجام دیا تھا، اس سے ان کے رجحان طبع کا پتہ چلتا ہے۔

اور صوبوں کا حال تو معلوم نہیں لیکن آج سے چالیس پچاس سال پہلے بہار میں یہ عام دستور تھا کہ کسی گاؤں میں دوسرے گاؤں سے جب برات آتی تھی تو طرفین کے بچے عموماً شعر لڑا کرتے تھے، اس علمی معرکہ کا اصطلاحی نام اس زمانہ میں بیتا بحث (۵) تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ ایک فریق کوئی شعر اردو یا فارسی کا پڑھتا جس حرف پر وہ شعر ختم ہوتا تھا فریق مخالف کا فرض تھا کہ اسی حرف سے شروع ہونے والے شعر کو جواب میں پڑھے، پھر یہ جوابی شعر جس حرف پر ختم ہوتا، فریق اول اسی حرف سے شروع ہونے والے شعر کو سناتا، وھلم جرا۔ جب تک جوابی شعر کے سنانے سے کوئی فریق عاجز نہیں ہوجاتا اس وقت تک یہ سلسلہ برابر جاری رہتا، بعض دفعہ تین تین و چار چار گھنٹے خرچ ہوجاتے اور شعری سوال و جواب کا یہ قصہ ختم نہ ہوتا، قاعدہ تھا کہ برات آنے سے چند مہینے پیش تر تیاریوں میں مکتب خانوں کے بچے اس بیتا بحث کے قصوں میں مشغول ہوجاتے تھے، اس زمانہ میں کچھ کتابیں بھی اسی سلسلہ میں مروج تھیں، جن سے اس معرکہ کے سر کرنے میں مدد ملتی تھی، ان ہی کتابوں کے اشعار لوگ زبانی یاد کرتے، ایسے حروف جو اردو و فارسی میں کم مستعمل ہیں، مثلاً فارسی کا حرف ژ یا ہندی کا حرف ڈال، ڑ، کوشش کی جاتی تھی کہ شعر اسی قسم کے حروف پر ختم ہوں، جن کے جواب میں مخالف کو کافی دشواری پیش آتی تھی، چند مشہور اشعار تو لوگوں کو اس سلسلہ میں عموماً یاد تھے، لیکن جب بات کہیں گے بڑھ گئی، تو پالکی رکھ دی جاتی تھی، شعر کو غلط طریقہ سے کوئی پڑھتا تو ''القط'' کی ایک اصطلاح تھی، جو گویا اس زمانہ کے پوائنٹ آف

آرڈر کا قائم مقام تھا، شطرنج میں ''مات'' کا لفظ ہارنے کے معنوں میں مستعمل ہے، اسی طرح بیتا بحث میں بھی ہارنے والے فریق کے متعلق اعلان ہوجاتا تھا کہ اس کو مات ہوگئی، عجب زمانہ تھا، مسلمانوں کی براتوں سے متجاوز ہوکر ہندوؤں کے خواندہ طبقات کائستھ وغیرہ میں بھی اس ''بیتا بحث'' کا چرچا کچھ دن پہلے زوروں پر جاری تھا۔

بہرحال سید الملت کی مکتبی زندگی میں ''بیتا بحث'' کا کافی رواج تھا، دستور کے مطابق سلیمانی مکتب کے بچے بھی اس میں کافی حصہ لیتے تھے، مولوی حنیف صاحب کا بیان ہے کہ مشق کے لئے مکتب خانے ہی میں دو فریق بچوں میں بن گئے تھے، ایک فریق کے امام سید الملت تھے، اور دوسرے فریق کی قیادت حکیم مولوی سید نجم الہدیٰ ندوی کے ہاتھوں میں تھی، مولوی سید حنیف سید صاحب کی زیر امامت کام کرتے تھے، اور مدرسہ شمس الہدیٰ کے سابق استاذ مولانا محمد قاسم ندوی وعالوی (۶) حکیم صاحب کے ذریات میں تھے، حکیم صاحب نے نوادر اشعار کی ایک بیاض صیغۂ راز میں تیار کی تھی، جس کا سید الملت کو کسی طرح سراغ مل گیا۔ اب یہی سننے کی بات ہے کہ ایام طفلی کے اس علمی مشغلہ میں سید صاحب کا طبعی رجحان بر سر کار آیا، انہوں نے مولوی سید حنیف صاحب کو آمادہ کیا کہ مصنوعی طور پر ان کی پارٹی سے ٹوٹ کر حکیم سید نجم الہدیٰ کی پارٹی میں شریک ہوجائیں، اور جس طرح بن پڑے نوادر اشعار کی یہ بیاض جس پر ان کو ناز ہے، اس کے اڑانے کی کوئی تدبیر اختیار کریں، سید الملت کے حسب ہدایت چند روز کے لئے بجائے سلیمانی پارٹی کے مولوی حنیف صاحب نجمی پارٹی میں گھل مل گئے، اور مولوی قاسم صاحب جو نسبتاً سادہ آدمی تھے، اور اب تک سادگی ہی ان کی سب سے بڑی امتیازی صفت ہے، ان ہی سے یہ ''بیاض'' ان کو ہاتھ لگی، جسے اسی وقت اپنے امام کے سامنے لاکر انہوں نے حاضر کر دیا، اور پھر حسب دستور سلیمانی پارٹی ہی میں شریک ہونے کا اعلان کر دیا، حکیم نجم الہدیٰ اس واقعہ سے اس درجہ متأثر ہوئے کہ معمر ہونے کے بعد بھی مولوی حنیف صاحب کے اس ''کید عظیم'' کا اب بھی ذکر کرتے رہتے ہیں۔

مکتب خانے میں پڑھنے کا دستور یہ تھا کہ چند کلاسوں پر بچے منقسم تھے، ہر کلاس میں ''سامع وقاری'' یعنی سننے اور پڑھنے کا فرض باری باری سے بچوں کو ادا کرنا پڑتا تھا، سیدالملت کی کلاس میں مولوی سید حنیف اور غالبًا حکیم نجم الہدیٰ ندوی سامع وقاری بنتے تھے، اور یہ سلسلہ بارہ تیرہ سال کی عمر تک جاری رہا، مکتبی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد سیدالملت طلب علم کی راہ میں والدین سے جدا ہوکر پھلواری شریف کی تعلیمی وتدریسی خانقاہ میں پڑھنے کے لئے داخل ہوئے، بیرونی تعلیم کی یہ پہلی منزل تھی، سننے میں آیا ہے کہ پھلواری شریف کی خانقاہ کے بعد کچھ دن دربھنگہ کے مدرسہ امدادیہ میں بھی ان کے گذرے، اگرچہ کبھی اس کا ذکر انہوں نے مجھ سے نہیں فرمایا، کچھ ہی دن کے بعد سفر کی آخری منزل ندوہ تھی، جس کے بعد وہ ندوی ہی ہوگئے۔ علامہ، ڈاکٹر، تصنیف وتالیف، تحقیق وتدقیق کے یکہ ناز فاضل یگانہ بن جانے کے بعد کچھ دن ہوئے سیدالملت کسی وجہ سے تھوڑی دیر کے لئے گیلانی تشریف فرما ہوئے، غالبًا ان کا خیال تھا کہ فقیر گھر ہی پر ہے، لیکن مجھ سے ملاقات نہ ہوئی، غالبًا میں حیدرآباد میں تھا، لوگوں سے میں نے یہ سنا کہ خاکسار کے غریب خانے پر پہنچنے کے ساتھ ہی یہ دریافت فرمانے لگے کہ:

''میرے پُرانے ساتھی، اور بھائی کھڑاون الناس کہاں ہیں؟''

یہ ''کھڑاون الناس'' مولوی سید حنیف صاحب کا خطاب تھا، مولوی صاحب ممدوح پڑھنے پڑھانے اور زندگی کی مختلف منزلوں سے گزرنے کے بعد اس زمانہ میں کچھ مجذوبانہ رنگ اختیار کرچکے تھے، جوتوں کی جگہ ہمیشہ کھڑاون استعمال کرنے لگے، اور ناس لینے کی ایسی عادت ڈالی کہ ایک لمحہ کے لئے اس مشغلہ سے الگ ہونا نہیں چاہتے تھے، سیدالملت نے ان کی کھڑاوَن اور ناس کی وجہ سے ''کھڑاون الناس'' کا خطاب پیار سے ان کو دیا تھا، زیرلب ہلکے سے تبسم کے ساتھ اس قسم کے مزاحانہ فقرے اور طبیعت سیدالملت کی عام فطرت تھی، ان لطائف کو اپنی یادداشتوں کی مدد سے لوگ اگر جمع کریں تو ایک دلچسپ ذخیرہ یہ بھی ہوسکتا ہے۔

یہی مولوی سید حنیف جو ہمارے راوی ہیں، اپنی تمام مزاجی وارستگیوں کے ساتھ آخر عمر میں حج وزیارت کی سعادت سے بھی بحمداللہ بہرہ اندوز ہوئے، اتفاقًا یہ وہی سال تھا جس میں بھوپال سے سیدالملت نے بھی حج کا سفر فرمایا تھا، مولوی سید حنیف کی حالت یہ تھی کہ مکہ معظّمہ میں بھی اپنے مجذوبانہ رنگ ہی کے ساتھ چلتے پھرتے رہے، ناس کی عادت تو چھوٹ چکی تھی، لیکن کھڑاوَن وہاں بھی ان کے قدموں کے ساتھ لپٹی رہی، صرف لنگی پہنے کرتے کے بغیر ننگے سر مکہ کے بازاروں میں نکل جاتے، عرب کے بچے خود ہی کہتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر ''صوفی صوفی'' چلاتے ہوئے تالیاں لگاتے۔

بہرحال کہنا یہ ہے کہ مکتب کے ان دونوں رفیقوں کی بلد اللہ الحرام میں عام ملاقاتیں تو ہوتی رہتی تھیں، اتفاق کی بات کہ مولوی سید حنیف صاحب بیمار ہوئے، اور علالت نے کچھ شدّت کی شکل اختیار کی، سیدالملت کو کسی نے ان کی اس علالت کی خبر سنائی، مولوی حنیف کا بیان ہے کہ سننے کے ساتھ ہی سید صاحب بے تحاشا اپنے بچپن کے رفیق کی عیادت کے لئے پہنچے، اور طرح طرح سے تسلی دی، اب بھی اس واقعہ کا جب ذکر کرتے ہیں تو آب دیدہ ہوجاتے ہیں، بے چارے کو خیال آتا ہے کہ کہاں میں یک لاابالی کس مپرس آدمی، اور کہاں سید صاحب کی ذات والا قدر، حکومت سعودی کے بڑے بڑے حکام جس کی تعظیم کے لئے سروقد کھڑے ہوجاتے ہوں، اور دنیائے اسلام کے ممتاز ترین علماء میں جوشمار ہوتا ہو، بے تحاشا وہی ان کی عیادت بھی کرتا ہے اور تسلی وتشفی کے کلمات سے بھی سرفراز کرتا ہے۔

اور یہ بھی سیدالملت کی مختلف دل آویز شانوں میں ایک خاص شان تھی، کم سخنی، اور کم آمیزی، جوان کی جبلّت تھی، بسا اوقات لوگوں کو کبروخودبینی کا شبہ اس پر ہوتا تھا، لیکن ذاتی مجربات نے ہمیشہ اس غلط فیصلہ کی تکذیب کی، جس کی ایک معمولی نظیر یہ واقعہ بھی ہوسکتا ہے۔ فغفر اللہ لہ و تغمدہ بغفرانہ۔

حج کے سلسلہ میں ایک چیز موقعہ کے لحاظ سے یاد آئی، سیدالملت حالانکہ فریضۂ

حج سے بحمد اللہ فارغ ہو چکے تھے، لیکن اس کے بعد بھی حج و زیارت کی ہوک ان کے قلب مبارک میں اٹھتی رہتی تھی، خیال شاید یہ تھا کہ اپنے ذاتی مصارف سے اس عبادت کے ادا کرنے کا موقع بھی نکالنا چاہئے، کیونکہ آخری سفر حجاز سے پہلے جتنے سفر ان کے حجاز کے ہوئے قومی و ملی تھے، بہرحال میرا خیال یہی ہے، بھوپال سے حج کا سفر قلب کے اسی تقاضے کی تکمیل تھی، حج کا یہ ذوق بھی ان میں معلوم ہوتا ہے کہ بچپن کے اس ماحول ہی میں پیدا ہوا، جس میں انہوں نے آنکھیں کھولی تھیں، مطلب یہ ہے کہ نہ صرف ان کے والد ماجد حکیم سید ابوالحسن صاحب مرحوم بلکہ سید صاحب کی والدہ ماجدہ بھی حج و زیارت کے شرف سے فیض یاب تھیں، والدہ ماجدہ پر تو ان کے حجاز سے واپسی کے بعد یہ حال طاری ہوا کہ سادات بہار کی خواتین کا جو عام لباس اس زمانہ میں تھا، اس کو ترک کر کے قریب قریب وہی لباس اختیار فرمالیا تھا جو اس زمانہ میں خواتین عرب کے لباس سے زیادہ مشابہ تھا، گویا ہندیہ مستعربہ بن گئی تھیں، عربیت سے سید الملت کا لگاؤ ممکن ہے اس میں ان کی والدہ ماجدہ کے اس حال کو بھی داخل ہو۔

حواشی

(۱) دسنہ کو بعض لوگ دیسنہ بھی لکھتے ہیں لیکن عام طور پر تلفظ یہی اس کا دسنہ ہی کیا جاتا ہے، اور لکھنے والے املا بھی اس لفظ کا دسنہ کی شکل میں کرتے ہیں، خود سید صاحب کے قلم سے ''دیسنہ'' یعنی یا کے اضافہ کے ساتھ میری نظر سے گذرا ہے، شرفاء دسنہ کی موجودہ آبادی کی ابتداء اس مقام پر کب سے ہوئی یہ کہنا تو مشکل ہے، لیکن مشہور یہی ہے کہ یہاں کے سادات دوماں جائی سید بھائیوں کی اولاد ہیں جن میں ایک صاحب کا نام سید صدرالدین اور دوسرے بزرگ کا نام سید محمد جان تھا، اول الذکر کی غیر معمولی دینی حالت سے متأثر ہو کر بیان کیا جاتا ہے کہ بہار کے حاکم نے دلی سے جاگیر کا فرمان حاصل کر کے ان کی خدمت میں اس کو پیش کیا۔ سید صاحب ممدوح نے اس شاہی عطیہ کو قبول نہ فرمایا، سید جان محمد صاحب جو اس وقت موجود نہ تھے، ان کو جب اس کی خبر ملی تو اپنے بڑے بھائی کے اس طرز پر افسوس کرنے کے بعد حکومت میں دوبارہ کوشش کر کے فرمان کو حاصل کیا۔ اس فرمان کے رو سے کچھ زمین موضع دسنہ میں اور کچھ دوسری جگہ جاگیر میں داخل ہوئی، سید جان محمد صاحب نے اگرچہ یہ جاگیر اپنی

کوشش سے حاصل کی تھی، لیکن اپنے بڑے بھائی کی اولاد کو بھی برابر کا شریک قرار دے کر جاگیر کو دونوں بھائیوں کی اولاد میں تقسیم کر دیا، سید جان محمد کی طرف سے ایک زرعی قطعہ ''چک جان محمد'' کے نام سے ساحل گنگا کے کنارے ٹال نامی علاقہ میں اب تک کہتے ہیں کہ موجود ہے، دسنہ کے سادات اس وقت ان ہی دونوں بزرگوں کی اولاد ہیں، دسنہ کے زرعی قطعات جو عامہ یا ائمہ کے نام سے موسوم ہیں یہ شاہی جاگیر کا وہی حصہ ہے جو فرمان شاہی سے ملا تھا، واللہ اعلم بالصواب، میں نے سادات کے ساتھ ''الملوک'' کے لفظ کا اضافہ جو کیا ہے اس سے مراد یہی ہے کہ سادات کے ساتھ طبقہ شرفاء میں کافی تعداد ان لوگوں کی بھی دسنہ میں آباد ہے جو اپنے آپ کو ''ملک'' کہتے ہیں۔ ملک شرفاء بہار کا کافی سر برآوردہ طبقہ ہے، ان کی مستقل آبادیاں اس صوبہ میں پائی جاتی ہیں، ان میں بعضوں کا دعویٰ تو یہی ہے کہ وہ بھی خانوادہ سادات ہی سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن بعض لوگ شکل و صورت، رنگ روپ، صفات مردانہ کی بنیاد پر ان کو ''ترک'' قرار دیتے ہیں، نظریہ ان کا یہ ہے کہ فاتح بہار ملک محمد بن بختیار خلجی کے ساتھ یہ لوگ بہار میں داخل ہوئے، ملک کا لفظ سپہ سالار کے نام کا جیسے جزء تھا، اسی طرح دوسرے ترکی خلجی امراء بھی اسی خطاب سے مخاطب تھے، موروثی طور پر بھی خطاب ان میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، بہرحال ایک ایسی بحث ہے جس کا قطعی فیصلہ مشکل ہے اور دین کی راہ میں جب ''فلاں بن فلاں چیزے نیست'' کا اصول تسلیم کر لیا گیا ہے تو اس قسم کی باتوں میں زیادہ کنج کار کی ضرورت نہیں، ''کل امرئ بما کسب رهین'' یہی ٹھوس قرآنی حقیقت ہے۔

(۲) سید الملت رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کلی و جزئی معلومات کی فراہمی میں جہاں تک میرا خیال ہے مولوی ابوالکمال عبدالحکیم صاحب سے جتنی مدد مل سکتی ہے، شاید ان معلومات کو دنیا کسی ذریعہ سے حاصل نہیں کر سکتی، کاش ان معلومات کو سمیٹنے اور مرتب کرنے کا انتظام کیا جائے۔

(۳) مجھے یاد آتا ہے، غالباً سید الملت نے خاکسار سے خود ہی تذکرہ فرمایا تھا کہ فارسی زبان میں اپنے مولد و منشا دسنہ کی تاریخ مرتب فرما رہے ہیں، میں نہیں جانتا کہ فارسی زبان میں سید صاحب کی یہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچی یا نہیں، اردو اور عربی کے سوا فارسی میں سید صاحب کی دستگاہ کی شہادت یہی کتاب ادا کر سکتی ہے کاش! ڈھونڈھنے والے ان کے مسودات میں اس کتاب کو یا اس کی یادداشتوں کو تلاش کرتے۔ سید صاحبؒ کا خیال تھا کہ دسنہ جو اس وقت گنگا کی ایک معاون ندی جیرائن نامی کے مغربی ساحل پر آباد ہے کسی زمانہ میں بودھ متی کے ماننے والوں کی کوئی خاص مرکزی جگہ تھی، کھودنے سے بودھ زمانہ کی بعض چیزیں بھی کہیں کہیں برآمد ہوئی تھیں، دسنہ سے بجانب جنوب میل پون میل کے فاصلہ پر ایک تالاب بھی پایا جاتا ہے، جو دیسوا کے نام سے موسوم و مشہور ہے۔ آج کل دسنہ کے ہم سرحد گاؤں استھانواں کے اراضی میں یہ تالاب داخل ہو گیا ہے۔ ایک گڑھا بھی اسی کے آس پاس ڈھیم کی شکل میں ہے، جسے دیسوال راجہ کا گڑھ لوگ کہتے ہیں، دیس کا لفظ سب کے شروع میں ہے۔

[مولانا غلام محمد صاحب نے تذکرۂ سلیمان میں مذکورہ بالا کتاب کا ذکر کیا ہے۔ طلحہ]

(۴) دسنہ ضلع پٹنہ کے مشرقی حدود میں واقع ہے، اور اوکھدی ضلع مونگیر کا گاؤں ہے، یہ بھی سادات بہار کی مشور ومعروف بستی ہے، اچھے اچھے اہل علم وفضل یہاں پیدا ہوئے، اور اس وقت تک پیدا ہو رہے ہیں، یہاں قدیم عہد کے بعض صاحب دل بزرگوں کے مزار ہیں۔

(۴) بظاہر بیت بازی کے لفظ نے بچوں کی زبان پر یہ صورت اختیار کر لی صحیح تلفظ اس کا چاہئے تو یہی کہ بیت بازی ہو۔

(۵) مولانا قاسم صاحب جو بحمد اللہ وظیفہ یاب ہو کر اب دسنہ ہی میں خانہ نشین ہیں، دسنہ کے مشہور درویش عالم مولانا حافظ تجمل حسین صاحب کے صاحبزادے ہیں، حافظ تجمل حسین رحمۃ اللہ علیہ بھی دسنہ کی مشہور شخصیتوں میں تھے، بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم سے پہلے مرید ہوئے اور ارشاد وتربیت کا تعلق مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہٗ سے رکھتے تھے، اپنے عہد کے علماء میں حافظ صاحب کافی روشناس تھے، چند کتابیں لکھی ہیں، ان کے لطائف وظرائف کا ذکر ہم عصر علماء کی مجلسوں میں عموماً ہوا کرتا تھا، حضرت تھانوی کے ملفوظات میں بھی ہے بلکہ مکہ میں صبح کی نماز حرم میں ہو رہی تھی حافظ صاحب بھی نماز میں شریک تھے، اچانک نماز کے اندر خدا جانے ان پر کیا حال طاری ہوا کہ ’’بادشاہا جرم مارادر گزار‘‘ کے ساتھ چلانے لگے، حافظ صاحب کے صاحبزادے مولوی قاسم صاحب نے ندوہ اور غالباً دیوبند میں تعلیم پانے کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ کے نصاب کی بھی تکمیل کی، اسی لئے ندوی کے ساتھ عالوی کے لفظ کا بھی اضافہ ان کے نام کے ساتھ کیا گیا۔

بچپن اور طالب علمی کے کچھ واقعات

حضرت مولانا سید ابوظفر ندویؒ

علامہ سید سلیمان ندوی کی ولادت ۱۳۰۲ھ میں ہوئی، جیسا کہ ان کے والد ماجد حکیم سید ابوالحسن مرحوم کے سفینہ میں درج ہے، مقام ولادت صوبہ بہار ضلع پٹنہ کا ایک چھوٹا سا گاؤں دسنہ نامی ہے، جو بہار شریف سے تین چار کوس کے فاصلہ پر واقع ہے، جہاں زیادہ تر سادات آباد تھے، اور اس کے باشندوں کی بڑی تعداد تعلیم یافتہ ہونے کے سبب سے اس کی شہرت دور دور تک تھی، جس گھر میں علامہ کی ولادت ہوئی تھی، وہ گھر آج بھی مسجد سے متصل موجود ہے۔

آپ کا اصلی نام سید ابونجیب ہے کیونکہ خاندانی نام زیادہ تر ’’ابو‘‘ پر ہیں، چنانچہ ان کے چچا کا نام ابوتراب اور دوسرے کا ابویوسف، اور ان کے بڑے بھائی کا نام ابوحبیب تھا۔

آپ کے منجھلے چچا سید ابوتراب دہلی، لکھنؤ وغیرہ کا سفر کر چکے تھے، اور آج سے تقریباً ستر سال قبل جدید تہذیب سے متأثر ہو کر سرسید احمد خان کے ہم خیال ہو گئے تھے، انہی نے ان کا نام سلیمان رکھا تھا، کہ جب لندن سے واپس آئے گا تو لوگ اس کو ’’مسٹر سلومن‘‘ کہیں گے، چنانچہ اسی نام سے ان کی شہرت ہوئی، اور علامہ موصوف نے خود بھی اسی کو پسند فرما کر اپنا نام سید سلیمان قرار دیا۔

لطف کی بات یہ ہے کہ واقعی اپنے چچا کی زندگی ہی میں علامہ موصوف لندن گئے،

اس پر انہوں نے بڑی مسرت کا اظہار کیا کہ میری پیشین گوئی صحیح نکلی۔

آپ کا پدری سلسلۂ نسب امام موسیٰ رضا تک پہنچتا ہے، اور مادری امام زید تک۔

آپ کی عمر پانچ برس کی ہوگی کہ آپ کی بسم اللہ ہوئی، اور وہ مکتب میں بٹھا دئے گئے، آپ کے پہلے استاد کا نام مولوی مقصود علی تھا، مولوی صاحب موصوف خاکسار کے بھی پہلے استاد تھے، لیکن میں اس قدر کم عمر تھا کہ ان کی علمی قابلیت کا صحیح اندازہ اس وقت نہ لگا سکا، البتہ اس قدر یاد رہ گیا ہے کہ فارسی کی بڑی چھوٹی سب کتابوں کا درس دیتے تھے۔

مجھے ہندوستان کے دوسرے صوبوں کا حال نہیں معلوم، لیکن آج سے ستر پچھتر برس قبل، صوبہ بہار کے ضلع پٹنہ کے دیہاتوں میں مکاتب کا نظام میری ابتدائی عمر تک موجود تھا۔

گاؤں کا کوئی زمیندار کسی مولوی کو بہت معمولی تنخواہ پر اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے مقرر کرتا تھا، تنخواہ کے علاوہ ناشتے کھانے کپڑے اور دھوبی حجام کے مصارف سب کا بار زمیندار پر ہوتا، ہر موسم میں کچھ غلہ بھی زمیندار ان کو دیتا تھا، اس کے علاوہ گاؤں کے دوسرے بچوں کو بھی اس کے ساتھ تعلیم کی اجازت ہوتی تھی، ان کے والدین بھی مولوی صاحب کی اپنی اپنی استطاعت کے مطابق خدمت کرتے تھے، اس طرح مولوی صاحب کی زندگی خوش حالی سے بسر ہوتی تھی، لڑکوں کی تعداد بیس پچیس سے زیادہ نہیں ہوتی تھی، اور بعض بعض گاؤں میں متعدد مکتب ہوتے تھے۔

ان مکتبوں میں ہندو مسلمان دونوں کے بچے پڑھتے تھے، معلم عموماً فارسی دان مسلمان ہوتے، اردو کی تعلیم برائے نام ہوتی تھی، سارا زور فارسی ادب پر صرف ہوتا، اس زمانہ میں مسلمان شرفا خطوط بھی فارسی ہی میں لکھتے تھے، نصاب درس میں مندرجۂ ذیل کتابیں ہوتی تھیں۔

آمدنامہ، گفتگو نامہ، تعلیم عزیزی، کریما، مامقیما، گلستاں، بوستاں، یوسف زلیخا، اخلاق محسنی، سکندر نامہ، بہار دانش، سہ نثر ظہوری، رقعات عالمگیری، اور انشاء خلیفہ وغیرہ۔

تاریخ اور جغرافیہ کی تعلیم قطعی نہیں ہوتی تھی، البتہ حساب میں جمع تفریق، ضرب تقسیم تک کی تعلیم ہوتی تھی، خوش خطی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا، طلبہ عموماً ۱۴-۱۵/سال کے اندر نصاب ختم کر کے شہر چلے جاتے، جہاں عربی یا انگریزی مدارس میں داخل ہو جاتے۔

یہ مجھے معلوم نہیں کہ علامہ موصوف نے کتنے برس اس مکتب میں تعلیم پائی، مکتبی تعلیم ختم ہونے کے بعد موصوف کے بڑے بھائی حکیم سید ابوحبیب صاحب نے تعلیم دینی شروع کی، آہستہ آہستہ تھوڑے طلبہ یہاں بھی جمع ہو گئے، یہ مکتب بھی کچھ عرصہ تک چلا، اور ایسا یاد آتا ہے کہ ان کے حج کے لئے جانے کے سبب سے یہ سلسلہ ختم ہو گیا، ان مکاتب کی تعلیم میں بیت بازی بھی تھی، کبھی ایک ہی مکتب کے طلبہ دو جماعتوں میں تقسیم ہو کر بیت بازی کرتے، اور کبھی دو مکتبوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ ہوتا۔

علامہ سید سلیمان ندوی کے مکتب میں دو پارٹیاں تھیں، جہاں تک مجھے یاد ہے، ایک پارٹی کے امیر علامہ موصوف اور ان کے مشیر خاص مولوی حکیم سید نجم الہدیٰ صاحب ندوی تھے، اور دوسری کے مولوی محمد قاسم صاحب، یہ دونوں آج بھی بقید حیات ہیں، اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علامہ موصوف کو شاعری سے ایک خاص لگاؤ ہو گیا، اور ہزاروں اشعار ان کو زبانی یاد ہو گئے، خاکسار بھی باوجود کم سنی کے ان جلسوں میں عموماً شریک رہتا تھا۔

اسی سلسلہ میں علامہ نے ایک بیاض تیار کی تھی، جس کے سرورق کو رنگ سے خوشنما کر دیا تھا، اس میں ہزاروں منتخب اشعار درج تھے، میرے والد مرحوم کی وفات ۱۹۲۹ء تک یہ بیاض میرے ذاتی کتب خانہ میں موجود تھی، چونکہ بیت بازی میں حریف خود ساختہ اشعار بھی پیش کرتے تھے، اس لئے علامہ موصوف کو تقطیع کی طرف خاص توجہ کرنی پڑی، جس سے ان کو فن عروض پر اس قدر عبور ہو گیا تھا، کہ علماء میں اس کی مثالیں کم ہوں گی۔

علامہ موصوف کو کھیل کود اور اس قسم کے تفریحی مشاغل سے مطلق دلچسپی نہ تھی، ان کے احباب جب تاش یا شطرنج کھیلتے، تو وہ صرف تماشائی ہوتے تھے، یا اخبار وغیرہ پڑھنے

لگتے، اگر کبھی کسی کھیل میں شرکت کی تو وہ کبڈی ہے، جس کا رواج ہندوستان کے تمام صوبوں میں کسی نہ کسی شکل میں آج بھی موجود ہے۔

علامہ صغرسنی میں ایک کھیل کھیلا کرتے تھے، آپ کے والد، دادا، بھائی، بلکہ خاندان کے بیشتر بزرگوں کا پیشہ طبابت تھا، اس لئے گھر میں علاج معالجہ کا چرچا ہر وقت رہتا تھا، اس کی نقل میں کبھی کبھی مختلف قسم کے شیشیوں میں پانی بھر کر بچوں کا علاج کرتے تھے، ان کی بڑی ہمشیرہ جب پوچھتیں کہ یہ کیا کرتے ہو تو کہتے کہ بیماروں کا علاج کرتا ہوں، لوگ کہتے کہ یہ لڑکا آگے چل کر بڑا طبیب ہوگا، لیکن باوجود ان کے والد کی دلی تمنّا کے یہ پیشین گوئی پوری نہ ہوئی۔

عربی کی ابتدائی تعلیم اپنے برادر معظم حکیم سید ابوحبیب صاحب مجددی سے حاصل کرنے کے بعد دربھنگہ تشریف لے گئے، ان کے ہم مکتبوں میں سے صرف مولوی سید نجم الہدیٰ صاحب نے ان کا ساتھ دیا، وہاں کچھ عرصہ تک تعلیم پاتے رہے، افسوس ہے کہ ان کے کسی استاد کا نام حافظہ نے محفوظ نہیں رکھا۔

علامہ موصوف بچپن سے کم سخن اور خاموش طبیعت کے انسان تھے، جس سے ان کے استاد ان کو غبی اور کند ذہن سمجھتے تھے، اور ان کے تیز زبان ساتھیوں کو ذہین اور صاحب ذوق سمجھ کر ان کی طرف زیادہ توجہ کرتے تھے، اور پھر جب حصول فضل وکمال کے بعد دنیا میں ان کی شہرت ہوئی تو ان کی کم سخنی کی وجہ سے لوگ ان کو مغرور سمجھنے لگے، علامہ موصوف کو اس کا اندازہ ہوا، تو انہوں نے اپنے کو شگفتہ بنانے کی بے حد کوشش کی، اور آخری عمر میں تو واقعی اس قدر شگفتہ ہو گئے تھے کہ مجلس سے اٹھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

ایک لطیفہ سننے کے قابل ہے، علامہ موصوف اپنی شہرت کے شباب کے زمانے میں کسی تقریب سے حیدرآباد تشریف لے گئے، اتفاق سے اس وقت دربھنگہ والے استاذ وہاں موجود تھے، انہوں نے اخبار میں پڑھا کہ مولانا سید سلیمان صاحب تشریف لائے ہیں، اور فلاں جگہ مقیم ہیں تو شاہ سلیمان صاحب پھلواری کو سمجھ کر ان سے ملنے کے لئے

آئے، مگر ان کے بجائے ایک دوسرے سلیمان کو پایا، مجھے یاد نہیں کہ خود استاذ نے شاگرد کو پہچان لیا، یا تعارف کے بعد پہچانا۔

تعارف کے بعد استاذ نے کہا کہ سلیمان! تو تو بڑا غبی اور کند ذہن تھا، اس قدر بڑا آدمی کیسے بن گیا، تو احباب نے قہقہہ لگایا اور بات آئی گئی ہوگئی۔

دربھنگہ کی تعلیم کے کچھ دنوں کے بعد پھلواری شریف (متصل پٹنہ) کے مدرسہ میں داخل ہوئے، جناب شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کے بڑے صاحبزادے شاہ حسن میاں مرحوم آپ کے ہم عمر تھے اور غالبًا ہم جماعت بھی تھے، حسن میاں حسن صورت، اور حسن سیرت دونوں میں ممتاز تھے، ندوۃ العلماء کا جو سالانہ جلسہ عظیم آباد پٹنہ میں ہوا تھا اس میں خاکسار بھی باوجود کم عمری کے شریک تھا، اس وقت حسن میاں کی عمر بھی ۱۵-۱۴/ سال سے زیادہ نہ تھی اور علامہ موصوف کی بھی کم وبیش یہی عمر رہی ہوگی۔

جہاں تک مجھے یاد ہے اس جلسہ میں شرکت کے لئے علامہ موصوف کے والد حکیم سید ابوالحسن صاحب بھی تشریف لائے تھے، وہ اس جلسہ سے اتنا متأثر ہوئے کہ انہوں نے طے کیا کہ علامہ موصوف کو ندوہ بھیج دیا جائے، چنانچہ دوسرے سال وہ لکھنؤ پہنچ گئے، ان سے پہلے ان کے ہم مکتب مولوی محمد قاسم صاحب بن حضرت شاہ تجمل حسین صاحب اور مولوی عبدالسبحان پہنچ چکے تھے، غالبًا موصوف دوسری جماعت میں شریک ہوئے، کیونکہ جب میں ندوہ میں پہلی جماعت میں داخل ہوا تو وہ چوتھی جماعت میں تھے اور شرح وقایہ پڑھتے تھے۔

ندوہ میں ورزش کا بھی انتظام تھا، مگر ورزش قدیم طریقہ کی تھی، اور کشتی کے لئے اکھاڑا بنا ہوا تھا، اس کے آس پاس مگدر رکھے ہوتے، ڈھال اور لکڑی کی تلوار بھی تھی، لاٹھی چلانا بھی سکھلایا جاتا تھا، جس کو طلبہ شوق سے سیکھتے تھے، اس زمانہ میں مسٹر مکڈانل اودھ کے لفٹنٹ گورنر تھے، یہ مسلمانوں پر بڑے مہربان تھے، انہوں نے اس کی ابتداء اردو زبان کی جڑ کاٹنے سے شروع کی، اودھ کی عدالتی زبان اردو کو بدل کر ہندی کر دی تیسرا حملہ ندوہ

پر ہوا، اور چوتھا علی گڑھ پر، لیکن نواب محسن الملک جیسے سیاست دان نے تو کالج کو بچالیا، مگر غریب ندوہ چکر میں آ گیا، ملکڈانل صاحب نے اراکین ندوہ سے دریافت کیا کہ ندوہ میں ڈھال، تلوار، مگدر، کشتی کی مشق کیا جہاد کی تیاری کے لئے کرائی جاتی ہے، اس سے اہل ندوہ اس قدر گھبرائے کہ سب کھیل بند کر دیئے گئے اور پھر ایک عرصۂ دراز کے بعد ورزش کے لئے فٹ بال، کرکٹ، ہاکی اور شب جمعہ کو کبڈی کا رواج ہوا، لیکن علامہ موصوف نے کبھی بھی ان ورزشی کھیلوں میں دلچسپی نہیں لی، ورزشی کھیلوں کا وقت عصر سے لیکر مغرب تک تھا، علامہ موصوف یہ وقت رسالہ، اخبار یا کتب بینی میں صرف کرتے، اور وہ دارالاخبار کے جس میں ہندوستان کے اکثر اخبارات اور رسالے آیا کرتے تھے، ناظم مقرر ہوئے، اس سے انہوں نے خود بھی فائدہ اٹھایا، اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے، کچھ دنوں کے بعد انہوں نے ایک علمی پارٹی تیار کر لی جس کے ممتاز ممبر مشہور شاعر جلیل جانشین امیر مینائی کے صاحبزادے مولوی صدیق حسن صاحب اور عثمان پاشا تھے، جو شیخ پورہ ضلع مونگیر کے باشندے تھے، اسی زمانے میں ایک ادبی انجمن تہذیب الاخلاق کے نام سے قائم کی، جس میں طلبہ کو تحریر اور تقریر کی مشق کرائی جاتی، جمعہ کے بعد اس کا جلسہ ہوتا، مہتمم صاحب اور کبھی کوئی دوسرا مدرس اس کا صدر ہوتا، بعض دفعہ آخری درجہ کا کوئی موقر طالب علم اس فرض کو انجام دیتا، اس انجمن کی نظامت جہاں تک مجھے یاد ہے اکثر انہی کے ہاتھ میں رہی، وہ بہترین مقررین میں تھے، لیکن ان کی تقریر میں جوش وخروش نہ ہوتا اور نہ وہ جذبات کو ابھارنے والی ہوتی، بلکہ زیر بحث مسئلہ کو دلائل اور امثال کے ذریعہ سنجیدگی کے ساتھ دل نشین کرنے کی کوشش ہوتی، ایک مرتبہ ''محنت'' پر تقریر کی تھی، جس سے یہ خاکسار اس قدر متاثر ہوا کہ اسی دن سے فٹ بال اور کرکٹ کے بجائے کتابوں سے زیادہ دلچسپی لینے لگا، جس سے کچھ لکھنا پڑھنا آ گیا۔

اب علامہ ممدوح نے مضمون نگاری بھی شروع کر دی تھی، اس زمانہ میں مولوی عبدالحلیم صاحب شرر لکھنوی کے ناولوں کی بڑی دھوم تھی، اور مشہور رسالہ ''دلگداز'' ماہوار

نکلتا تھا، جس میں اس زمانہ کے مذاق کے مطابق تاریخی، علمی اور ادبی مضامین ہوتے تھے، اس قسم کے ایسے رسالے اور ناول وہ بہت پڑھتے، ابتدائے شباب سے ان کی آنکھیں خراب تھیں اور بار بار ڈاکٹروں نے ان کو ترک تعلیم کا مشورہ دیا تھا، وہ ترک تو کیا کرتے، رات کے ایک ایک بجے تک کتابوں کے مطالعہ میں مشغول رہتے۔

اس زمانہ کا بہترین اردو رسالہ ''مخزن'' لاہور تھا، جس کے ایڈیٹر شیخ عبدالقادر بارایٹ لا تھے، لکھائی چھپائی، کاغذ کی عمدگی کے علاوہ ایک خالص ادبی رسالہ تھا، اور اردو داں طبقے میں بہت مقبول تھا، علامہ ممدوح کا پہلا مضمون اسی رسالہ میں شائع ہوا۔

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ابتدائی تعلیم کے زمانہ میں علامہ ممدوح بیت بازی میں پیش پیش تھے جس سے ان میں شعری ذوق پیدا ہو گیا تھا، جو لکھنؤ آکر اور تیز ہو گیا تھا، ندوہ کے طلبہ میں مولوی رکن الدین دانا سہسرامی، سید عبدالغفور شرر بہاری، مولانا فاروق چریاکوٹی کے صاحبزادے، ملا مبین وغیرہ شاعری کرتے تھے، اس زمانہ کے اساتذہ میں داغ، امیر، جلیل، ریاض ومضطر وغیرہ بقید حیات تھے، لکھنؤ میں گذشتہ ادبی سرگرمیاں پوری طرح موجود تھیں، عشرت لکھنوی کا نام طلبہ میں زیادہ معروف تھا، ''پیام یار'' نامی رسالہ طرحی اور غیر طرحی غزلوں کے ساتھ ہر ماہ نکلتا تھا، مرثیہ کی مجلسیں اور مشاعرے بکثرت ہوتے تھے، علامہ موصوف ان مشاعروں میں اکثر شرکت کرتے، آخر خود بھی شعر کہنے لگے اور انہیں اپنے احباب، خاص طور سے مولوی صدیق حسن اور عثمان پاشا کو سنا کر داد لیتے تھے۔

علامہ موصوف نے ایک بیاض بھی تیار کی تھی، اس کے ایک جانب عربی اور دوسرے جانب اردو اشعار تھے، جس وقت یہ بیاض میرے ہاتھ آئی، اس وقت میں متنبّی پڑھتا تھا، اس کو میری بدذوقی سمجھئے کہ ان کے عربی اشعار مجھے پھیکے نظر آئے، متنبّی نے جس مضمون کو صرف دو مصرعوں میں ادا کیا تھا، علامہ موصوف نے بہ تغیر الفاظ چار مصرعوں میں کیا تھا، (ناظرین اس کا لحاظ رکھیں کہ میں ان کے اوائل زندگی کا حال لکھ رہا ہوں) میری بدمذاقی کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس کا ایک عربی شعر بھی مجھے یاد نہ رہا، مگر ان کے اردو اشعار مجھے

بہت یاد ہوگئے تھے، جوان کے دیوان یا بیاض سے نقل کئے تھے۔

وہ اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے تھے، اور اپنی غزل بھی سناتے تھے، ایک مرتبہ ایک مشاعرہ کی خبر شام کو ملی، رات کو مشاعرہ تھا، غزل کہنے کی کوشش کی، اور صرف ایک شعر کہنے پائے تھے کہ احباب آگئے، اور ان کے ساتھ چل پڑے، اس زمانہ میں وہ ڈاسن کا جوتہ، علی گڑھ نما پائجامہ، کرتا، یا کف دار قمیص، شیروانی، چشمہ اور ترکی ٹوپی استعمال کرتے تھے، اور ہاتھ میں چھڑی لیکر باہر نکلتے تھے، اسی شان سے مشاعرہ میں پہنچ کر یہ بیٹھ گئے، ان کی صورت شکل اور لباس دیکھ کر شمع ان کے سامنے بھی آئی، پہلے تو بہت پریشان ہوئے، لیکن انتقال ذہن نے پریشانی سے بچالیا، انہوں نے یہ معذرت کی کہ مجھے مشاعرہ کی مطلق خبر نہ تھی، ابھی احباب نے اطلاع دی، فوراً اٹھا چلا آیا، البتہ ایک شعر ذہن میں آیا ہے، وہ عرض کرتا ہوں۔

حاجت ہی کیا ہے آپ کو صاحب نقاب کی　　　سر سے قدم تلک ہے ردائے حیا پڑی

یہ شعر لکھنؤ کے رنگ کا تھا، خوب داد ملی۔

اس زمانہ کا ایک دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے، مولانا فاروق چریا کوٹی (جن کی شاگردی کا فخر بندہ کو بھی حاصل ہے) کے ندوہ سے مستعفی ہونے کے بعد نائب کے طور پر جناب مفتی عبداللطیف صاحب مقرر ہوئے، (بندہ کو ان سے بھی تلمذ کی نسبت ہے) یہ فقہ حنفی کے بہت بڑے ماہر تھے، اور اس میں ان کو بڑا غلو اور مزاج میں بے حد تقشّف تھا، ان کو بہت کم کسی نے مسکراتے ہوئے دیکھا، احکام کی تعمیل کرانے میں اس قدر سخت تھے کہ عدول حکمی تو بڑی بات ہے تاخیر بھی روا نہ تھی، طلبہ ہی میں سے بعض کو انہوں نے جاسوس بنا رکھا تھا، جن کے ذریعہ طلبہ کی مخفی باتیں ان کو معلوم ہوجاتیں، ان کی حکومت میں معافی کی کوئی دفعہ ہی نہ تھی، وہ شخصی حکومت کا مکمل نمونہ تھے، طلبہ ان کے نام سے تھراتے تھے، بعض طلبہ سمجھتے تھے کہ جن ان کے تابع ہے، جو طلبہ کے پرائیوٹ حالات سے ان کو باخبر کردیتا ہے، ایک دن معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کہیں باہر جانے والے ہیں، یہ خبر سن کر طلبہ نے ڈرامہ کی

تیاری شروع کردی، اور ان طلبہ کو خاص طور سے شریک کیا گیا جن کی نسبت جاسوسی کا خیال تھا، چنانچہ رات کو کھیل شروع ہوا، علامہ موصوف انگریز جج بنے، مقدمہ شروع ہوا، ڈرامہ کا قصہ مجھے یاد نہیں رہا۔

ڈرامہ ختم ہونے کے قریب تھا کہ غل مچا، مفتی صاحب آگئے، ہر شخص اپنے اپنے کمرہ میں پہنچ گیا، اس ذکر کا اصل منشا یہ ہے کہ اس ڈرامہ میں بھی علامہ موصوف کا انتخاب ایک اعلیٰ عہدہ کے لئے کیا گیا، جس کے لئے اعلیٰ قابلیت کی ضرورت تھی، اس انتخاب سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت بھی وہ اپنے ہم عصروں میں اتنے ممتاز تھے کہ سب کی نگاہ ان ہی پر پڑی، دوسری قابل تعریف بات یہ ہوئی کہ مفتی صاحب کو اس کی بھنک لگ گئی تھی، مگر وہ مجرموں کو گرفتار نہ کرسکے، جس کے سرغنہ سید سلیمان تھے۔

استاذ محترم علامہ شبلی نعمانیؒ کی تشریف آوری کے بعد ان کا رنگ ہی بدل گیا، دارالاخبار، دارالمطالعہ وغیرہ سے دست بردار ہوگئے، ہفتہ وار ادبی انجمن میں بھی بہت کم حصہ لیتے، اور اب ان کا زیادہ وقت استاذ محترم کی خدمت میں گذرتا، خصوصًا عصر سے مغرب تک اردو کی ادبی کتابوں کا شوق سرد پڑ گیا، اب زیادہ تر عربی کتابوں کا مطالعہ ہوتا، جس میں تاریخ وادب کا حصہ زیادہ تھا، مضامین بھی علمی اور تاریخی ہونے لگے۔

استاذ محترم علامہ شبلی نعمانیؒ نے تربیت کے لئے چند ہونہار طلبہ کو منتخب کیا تھا، جس میں سید سلیمان، عبدالسلام، حافظ عبدالصمد، عبدالواجد، قمرالدین وغیرہ تھے، یہ لوگ وہاں پہنچ جاتے، علامہ شبلیؒ کے پاس عربی کے متعدد اخبارات ورسائل "اللواء، المؤید، الهلال، المقتطف" وغیرہ آتے تھے، وہ کسی ایک طالب علم سے کوئی مقالہ پڑھوا کر سنتے، پھر اخبار لے لیتے، اور فرماتے کہ تم اپنی عربی میں اس کو بیان کرو، جہاں تک مجھے یاد ہے، اس میں علامہ سلیمان اور عبدالواجد صاحب زیادہ ممتاز تھے۔

استاذ محترم کی صحبت کا اثر یہ ہوا کہ ان میں تلاش اور تحقیق کا مادہ پیدا ہوتا گیا، اور مضامین میں گہرائی آنے لگی اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ متقدمین کی معصومیت کا جو رعب ان پر

چھایا تھا، وہ اٹھ گیا، چنانچہ متعدد کتابوں پر تنقید لکھی، اس سلسلہ میں ہندوستان کے بعض قدیم مشاہیر علماء کی غلطیاں نکالیں، جس سے ان کے حلقہ میں ایک شور مچ گیا۔

علامہ موصوف بہت ذہین تھے، ان کا حافظہ بھی بہت قوی تھا، پشاور سے لے کر چین کی سرحد تک خاکسار کو جن جن اصحاب علم سے ملنے کا اتفاق ہوا، ان میں مولانا انور شاہ کشمیری دیوبندی (محدث) مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ سید سلیمان ندوی کو قوت حافظہ میں بے نظیر پایا۔

ایک دفعہ میں نے ابن بطوطہ کے سفرنامہ کے حوالہ سے مالابار کے حالات لکھے، نظر ثانی کے وقت علامہ موصوف نے مجھ سے کہا تم نے غلط لکھا ہے، میں نے سفرنامہ کا اردو ترجمہ لاکر پیش کردیا، دیکھ کر فرمایا صحیح نہیں ہے، عربی ایڈیشن میں دیکھو، اس کو دیکھ کر فرمایا، دیکھو مترجم نے ضمیر کا مرجع غلط قرار دے کر ترجمہ کیا ہے، غور کیا تو واقعی صحیح تھا۔

استاذ محترم شمس العلماء مولانا ابوالفضل حفیظ اللہ صاحب اس جماعت کو جس میں علامہ موصوف تھے، درس قرآن دے رہے تھے، اسی اثناء میں آنریبل سید شرف الدین جج کلکتہ ہائی کورٹ تشریف لے آئے، اور درجہ میں بیٹھ گئے اور "فوجدك ضالا فهدیٰ" کی ایسی تفسیر کی خواہش کی، جس سے لفظ "ضالاً" سے جو شبہ پیدا ہوتا ہے وہ دور ہوجائے، جہاں تک مجھے یاد ہے، درجہ میں صرف سید سلیمان ایسے تھے جنہوں نے لغت، محاورہ اور ربط کے لحاظ سے ایسا ترجمہ وتشریح کی جس سے جج صاحب موصوف کو تسکین ہوگئی۔

ایک دفعہ پٹنہ میں خدابخش خان مرحوم چیف جسٹس حیدرآباد سے ملنے کے لئے گئے، خاکسار بھی ساتھ تھا، وہ اس مشہور کتب خانہ (پبلک اورنٹیل لائبریری) کے اس سائبان میں بیٹھے تھے، جس سے متصل بازار کی سڑک تھی، اس وقت موجودہ بلڈنگ تیار نہیں ہوئی تھی، میز پر کچھ کتابیں تھیں، اور وہ کسی خاص کام میں مصروف تھے، ہم لوگ کرسی پر بیٹھ گئے، اور باتیں ہونے لگیں، اثنائے گفتگو میں آیۃ الکرسی کے متعلق گفتگو ہونے لگی، یہ مجھے یاد نہیں ہے کہ آیۃ الکرسی کی ایک تفسیر جو فیضی کی تھی، یا خود ان کی تھی، یا کسی مفسر نے کسی

کتاب میں لکھی تھی، علامہ موصوف کو سنائی، انہوں نے جو اصلاح دی، یا جو بات کہی اسے سن کر جج صاحب پھڑک اٹھے، اور دیر تک تعریف کرتے رہے۔

علامہ موصوف اردو، فارسی، عربی کے علاوہ عبرانی زبان سے بھی واقف تھے، وہ جب دکن کالج پونہ میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے، تو ایک یہودی سے اس کو سیکھا تھا، اور ارض القرآن لکھنے میں اس سے مدد لی تھی، انگریزی لکھ اور بول نہیں سکتے تھے، لیکن اخبار اور کتابیں پڑھ لیتے تھے۔

ندوہ سے فارغ ہونے کے بعد علامہ موصوف بڑی کشمکش میں مبتلا ہوگئے، ان کے والد ماجد، ان کے خسر اور بڑے بھائی کی خواہش تھی کہ وہ خاندانی پیشہ یعنی طب کی تعلیم حاصل کریں، لیکن خود ان کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی، استاذ محترم علامہ شبلیؒ کی بھی یہی رائے تھی کہ طب کی تعلیم کے بجائے وہ علمی کاموں میں مصروف ہوں، چنانچہ انہوں نے استاذ سے جب اس کا تذکرہ کیا تو استاذ نے ان کے خسر کو ایک خط لکھا کہ سید سلیمان کو ان کی علمی تحقیقات میں مصروف رہنے دو۔

پھر اتفاق ایسا ہوا کہ استاذ محترم کسی ضرورت سے پٹنہ تشریف لے گئے، اور مولوی ابویوسف صاحب (سلیمان صاحب کے خسر) ان سے ملنے گئے، اس مسئلہ پر دونوں کی گفتگو ہوئی، آخر میں استاذ محترم نے فرمایا ان کے والد سے کہہ دو کہ سید سلیمان کو ہمیں دے دیں، والد کو یہ پیغام ملا تو استاد کی شفقت کو دیکھ کر خاموش ہوگئے لیکن طب اور تصوف دونوں لائنوں سے علاحدہ ہوجانے کو خاندانی روایات کے خلاف سمجھ کر آخر عمر تک پسند نہیں کیا، اس میں شبہ نہیں کہ اگر وہ طب کی تعلیم حاصل کرتے تو بھی اپنی ذہانت اور قوت حافظہ کی بدولت بہترین طبیب ہوتے، لیکن ضلع پٹنہ کے باشندوں کے علاوہ ان کو کوئی نہ جانتا، اور عالم اسلامی ان کی بہترین تصانیف سے محروم رہ جاتا۔

انہوں نے سب سے پہلی ملازمت ندوہ ہی میں کی، ایک ادیب کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا، "الندوہ" کے نائب ایڈیٹر بھی رہے، اسی زمانہ میں آسی مدراسی مرحوم کے

بڑے صاحبزادے قاری عبدالولی عربی زبان میں ایک ماہوار رسالہ ''البیان'' نکالتے تھے، علامہ اس کے بھی ایڈیٹر تھے، اور ابتداء میں اسی کے ذریعہ حجاز، عراق، شام اور مصر وغیرہ میں ان کا تعارف ہوا۔

ان کی پہلی شادی ان کے چھوٹے چچا کی لڑکی سے ہوئی تھی، جس سے تین بچے پیدا ہوئے، دوسری سے کوئی اولاد نہیں تھی، اور تیسری سے متعدد اولادیں ہوئیں، جن میں اس وقت چار لڑکیاں، اور ایک لڑکا سلمان سلمہ موجود ہے، آپ نے ۷۱ سال کی عمر میں بمقام کراچی وفات پائی، اور ان کی وفات سے نہ دسنہ ضلع پٹنہ (بہار) کا کوہ نور گیا، بلکہ ہندوستان و پاکستان کی علمی دنیا اس کی ضیاباری سے محروم ہوگئی۔

سیرۃ السید کے انمول سبق

حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ ''سید سلیمان'' نام کے ایک طالم علم کی حیثیت سے دارالعلوم (ندوہ) میں ۱۳۱۸ھ کے آخر (غالباً ذی الحجہ) میں داخل ہوئے، اور راقم ہذا دوسرے ہی سال ۱۹ھ کے شوال میں، اس طرح بچپن اور نوعمری کے ابتدائی سالوں کو چھوڑ کر ان کی پوری زندگی کے ہر دور کو دور ونزدیک سے دیکھنے، جاننے اور سمجھنے کے مواقع حاصل رہے، آخری دور (قیام پاکستان) میں بھی دو مہینے کے قریب بہت قریب سے چشم وگوش دونوں کو دید وشنید کی سعادت میسر رہی، ڈھائی ہفتے تو کراچی میں خود ان کا مہمان رہا۔ ملتان میں خیرالمدارس کے سالانہ جلسۂ دستار بندی میں یک جائی کا شرف حاصل رہا، اور پانچ ہفتے کے لگ بھگ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب مدظلہ کی خدمت میں لاہور میں حاضری رہی، تو اس دوران میں کئی بار یونیورسٹی کی کمیٹی اور جامعہ اشرفیہ کے سالانہ اجتماع کے سلسلہ میں تشریف لائے، اور خواجہ تاشی کے رشتہ سے مستقل حضرت ممدوح (۱) کے وہ بھی مہمان ہوئے۔

ندوہ میں نہ صرف طالب علمانہ معیت ورفاقت رہی، بلکہ جب استاد مقرر ہوئے تو شاگردی کی دولت بھی ملی، استاذ مرحوم ومحترم علامہ نعمانی کی مجالس میں سالہا سال ان کے پیچھے صف نعال میں شریک رہا، سب سے طویل دور ان کا دارالعلوم (ندوہ) اور دارالمصنفین کی معتمدی ونظامت کا رہا، اس کم وبیش چوتھائی صدی کے دوران میں دونوں

اوران کے گوناگوں معاملات سے باضابطہ خاکسار کو بھی تعلق رہا، ''سیرت سلیمان'' کے جلی وخفی، نمایاں اور غیر نمایاں نقوش سب سے زیادہ اسی عہد میں ثبت ہوتے رہے، مکاتبت میں مرحوم زیادہ مستعد نہ تھے، پیش قدمی تو بلاضرورت شدید شاذ ہی فرماتے، جواب بھی بار ہا ہفتوں میں مرحمت ہوتا، خود مجھ کو اپنے قلبی تغیرات کی بنا پر حفاظت مکتوبات کا بھی ہمیشہ اور پورا اہتمام نہیں رہا، پھر بھی وفات کے بعد پرانے کاغذات جوالٹے تو سید المکاتیب کا ذخیرہ بھی ڈھائی سو سے زیادہ ہی نکلا۔

نصف صدی سے بھی زیادہ روابط کے اس تسلسل اور تنوع کی بنا پر اس میں شک نہیں کہ سیرت السید کا بڑا کثیر و مستند سرمایہ اس بے مایہ کے پاس ہونا چاہئے تھا، اسی توقع میں ہندوستان و پاکستان کے بعض ارباب رسائل کا حکم واصرار ہوا کہ ان کے رسالوں کی خصوصی اشاعتوں اور مستقل سیرت کی تالیف میں کوئی بڑا اور خاص حصہ لے سکتا ہوں۔

لیکن اس حسن ظن کے بدلنے پر ان کو کس طرح آمادہ کروں، اور کیوں کر یقین دلاؤں کہ خود زندگی کے جس عالم سے گزر رہا بلکہ جس پر زندگی ختم کر رہا ہوں وہ بجھی ہوئی آگ کے ایک ڈھیر سے زیادہ نہیں، خصوصًا جب سے اپنی ناسمجھی کی سمجھ میں یہ آگیا ہے کہ اسلامیت اور انسانیت کسی کا بھی بیڑا کاغذ کی ناؤ سے پار نہیں لگ سکتا، اور زبان وقلم کی رائج الوقت وبا سے ملک وملت کے کاموں میں فلاح سے زیادہ فساد ہی کا مشاہدہ دن ورات ہوتا رہتا ہے، اس وقت سے یقین فرمائیں کہ خود بھی اس وبا کے تعدیہ سے پوری طرح محفوظ نہیں تاہم مسلمان اور انسان دونوں کے دن پر دن بگاڑ کو بناؤ سے بدلنے کی تدبیر اس کے سوا نظر نہیں آتی کہ خود مسلمان جن پر ساری دنیا کی ہدایت وامانت کی ذمہ داری ہے، وہ زبان وقلم کم چلائیں، اور انفرادی واجتماعی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے شعبہ وزاویہ میں مسلمان بن بنا کر زیادہ دکھلائیں، یہ حقیقت اس بذات خود سراپا ناکارہ کے لئے دن دوپہر کے سورج سے بھی بڑھ کر اتنی روشن وبیّن ہو چکی ہے کہ لکھنا بولنا یونہی کیا آتا ہے، رسمی مواقع پر اور بھی زبان گنگ اور قلم کند ہو جاتا ہے، خصوصًا تکلف وآورد سے ایک سطر بھی لکھنا پہاڑ ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ واقعاتی وتاریخی حافظہ پیدائشی طور پر حصہ میں بہت کم پڑا، اور اب تو ناپید ہونے کے برابر ہے، لفظی روایت کسی بات کی گھنٹہ بھر بعد بھی مشکل ہی سے کہ سکتا ہوں، کسی گذشتہ واقعہ ومعاملہ کی جزئیات وتفصیلات ذہن میں ڈھونڈھے نہیں ملتیں، زیادہ تر بس ایک معنوی، وہ بھی دھندلا سا خاکہ دماغ میں رہ جاتا ہے، خود سید صاحب مرحوم کا قلم وفیات میں جیسی جیسی تاریخ وار جزئیات کے ساتھ متوفی کی مصوری فرمایا کرتا تھا، کسی موقع پر پاکستان ہی میں بڑی حیرت سے میں نے پوچھا کہ حضرت یہ آپ کے حافظہ کی کرامت ہے، یا کوئی یادداشت وروزنامچہ اس اہتمام سے ضبط فرماتے رہتے ہیں؟ جواب میں ان کا محبوب مسکرانا تو یاد ہے لیکن جواب کیا ملا، یا سرے سے کچھ ملا بھی؟ یہ بالکل یاد نہیں آرہا۔

ایسی صورت میں دوستوں کے حکم پر معذرت وندامت کے سوا پیش ہی کیا کرسکتا تھا، البتہ دارالمصنفین میں حضرت مرحوم کے مسند نشیں برادر عالی قدر شاہ معین اقدس سلمہ کو یہ ''جیتے جی مرحوم'' خدا جانے کیسے اتنا یاد آگیا کہ ان کے حکم پر حکم کا تار نہیں ٹوٹ رہا ہے، آخر جب یہاں تک نوبت پہنچی کہ سید صاحب کی بارگاہ میں آپ کا مضمون نہایت ضروری ہے، خواہ اس کے انتظار میں پرچہ کی اشاعت میں تاخیر کرنا پڑے، تو ذہن پر دباؤ زیادہ پڑا، اور ان سطروں تک پہنچا ہوں، والا تمام من اللّٰہ۔

سید صاحب کے علمی وعملی کمالات میں سب سے اونچا مقام ان کی تصنیفی وقلمی یا ذہنی ودماغی خدمات کو حاصل ہے، ذہن وذہانت میں ان کی طالب علمی کے متعدد (۲) رفیق ومعاصر متوقد الذہن ان سے بڑھ چڑھ کر تھے، اور کہا جاتا تھا کہ ان کے سامنے سید صاحب کا چراغ جلنا مشکل ہے، لیکن ہر وصف کا کمال اس کا نقطۂ اعتدال ہوتا ہے، متوقد یا بھڑکتے ہوئے ذہنوں کے علوم وافکار کو اکثر جھلس ہی جاتے دیکھا، ذہن کا کوئی متوازن تخلیقی کارنامہ ذہانت کی نرم ومعتدل آنچ ہی چاہتا ہے، مرحوم کا سبق آموز ذہنی کمال ان کا ذہنی توقد نہیں توازن تھا، چلتا ان کا ذہن ان کے جسم کی طرح متانت ہی کی چال تھا، لیکن پڑتا ہر قدم مضبوط وہموار زمین پر، بہت زیادہ ذہین وذکی آدمی ہضم کم کرتے ہیں،

البتہ ذہانت کے زور سے اگلتے زیادہ اور جلد ہیں۔

سید صاحب کو طالب علمی ہی کے زمانہ سے پڑھتے اور کتب بینی کرتے اپنے ساتھیوں کے مقابلہ میں زیادہ پایا، ہرطرح کی چیزیں پڑھتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ خوب چباچبا کر ہضم کرتے، طلسم ہوش رُبا تک کو اس توجہ سے پڑھا تھا کہ چندہ کے ایک وفد میں ساتھ تھا، یاد نہیں کیا صورت پیش آئی کہ کئی میل پیدل چلنا پڑا، غالباً کچھ پانی بھی برس رہا تھا، اس عالم میں وہ طلسم ہوش ربا اس طرح سناتے جارہے تھے، جیسے کتاب پڑھ رہے ہوں، راستہ تفریحی سفر بن گیا، شاگردی کی سعادت کے بعد سے خدمت میں حاضری زیادہ ہونے لگی تھی، جب حاضر ہوتا، کچھ نہ کچھ پڑھتے لکھتے ہی پایا، آخر تک یہ رنگ دیکھا کہ کوئی معمولی اخبار ورسالہ یا کوئی گری پڑی کتاب بھی سامنے آگئی تو اسی وقت اٹھا کر دیکھنے لگتے، ذرا بھی کوئی بات دلچسپی کی پاتے تو ایسا معلوم ہوتا، کہ خالی وقت گذاری کے طور پر نہیں توجہ کے ساتھ پڑھ رہے ہیں۔

طبیعت اَخاذ بہت تھی، ہرادنیٰ واعلیٰ کتاب ورسالہ اور ہر کہ ومہ کی باتوں سے مطلب کی بات اخذ کر لیتے، اور حسب موقع کام لیتے، فوراً قابل قبول نہ نظر آتی تو غور فرمانے پر جب جتنا جزء بھی کسی کی بات کا ان کا دل ودماغ قبول کرتا، تو قبول ہی نہیں، اعتراف بھی بڑی کشادہ دلی سے فرماتے، ایک آدھ مثال خود اپنے تجربہ کی یاد آگئی، میں کہا کرتا ہوں کہ یقینی موت ہے یا زندگی؟ زندگی تو اتنی غیر یقینی کہ یقین پل بھر کا نہیں اور موت اتنی یقینی کہ بن آئے نہ رہے، تیاری یقینی چیز کے لئے زیادہ کرنی چاہئے، یا غیر یقینی کے لئے؟ فرمایا کہ یہ بات تمہاری ایسی جی کو لگ گئی کہ اس سے کام لیتا رہتا ہوں، حیدرآباد میں وجود ہی رنگ کے ایک بڑے صاحب حال وقال بزرگ حضرت مولانا محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، شیخ اکبر کے مسلک پر مخلوقات کی توجیہ معلومات الٰہیہ کی تجلیاتی نمو وظہور سے بڑے جوش وخروش سے فرماتے، نئے پرانے دونوں طبیعتوں کے اہل علم بہت متأثر ہوتے جن میں ہمارے مولانا گیلانی اور ڈاکٹر میر ولی الدین جیسے مشہور ومعروف اصحاب

علم وقلم تک داخل ہیں، بلکہ دونوں ماشاءاللہ مجاز وخلیفہ ہیں، علماء کو شکار فرمانے کے خصوصًا بڑے حریص تھے، اور چھاپہ تمامتر آیات واحادیث ہی سے مارتے، سید صاحب کا میلان ایک تو ابتداء میں اہلحدیث کی طرف زیادہ رہا، دوسرے زیر تربیت اپنے مجددی مسلک کے بڑے بھائی کے رہے، اسلئے وجودیت کے نام ہی سے چوکنا ہوتے، تاہم جب آخری مرتبہ حیدرآباد تشریف لے گئے تو وہی اپنی اخذ واستفادہ کی طالب علمانہ صفت وسیرت کی بنا پر خاکسار اور مولانا گیلانی کی ترغیب وتعریف سے کئی بار حضرت ممدوح سے ملے، اور ان کے حال سے کافی متأثر ہوئے۔

میں نے مولانا کی وجودیت کو سمجھنے کے لئے سید صاحب کو قرآن مجید کی ان آیات کی طرف خاص طور سے توجہ دلائی جن میں خلق وخلاقیت کو علم کے ساتھ غیر منفک طور پر وابستہ ٹھہرایا گیا ہے، مثلاً "الا يعلم من خلق وهو الخلاق العليم" وغیرہ، اور کچھ جدید فلسفیانہ وعقلی نظریات ورجحانات سے بھی اس کی تشریح کی، بڑی دلچسپی سے سنا، پھر کچھ دن بعد فرمایا کہ بھائی ان آیات سے تم لوگوں کی وحدۃ الوجود تو ابھی سمجھ میں نہیں آرہی ہے لیکن تمہاری گفتگو کے بعد سے علم وخلق کی وابستگی کی آیات پر غور کرتا رہا، اس میں شک نہیں ہے کہ دونوں کا ربط بہت تفکر وتدبر کے لائق ہے۔ (اوکما قال)

ادنیٰ طالب علم سے لے کر علمی شہرت وعظمت کے اوج کمال تک اشخاص اور کتابوں دونوں سے کھلے دل ودماغ کے ساتھ اخذ واستفادہ کا یہی کمال کہنا چاہئے کہ ان کو زندگی بھر لفظاً ومعناً سچا طالب علم بنائے رہا، ان کے گوناگوں کمالات میں وہبی صلاحیتوں سے بہت زیادہ کسبی طور پر ان صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کا دخل رہا، فطری ذہانت وذکاوت، طباعی وجودت والے دنیا میں کم نہیں ہوتے، ندوہ میں سید صاحب سے پہلے ان کے ساتھ اور بعد ایک سے بڑھ کر ایک ذہین وطباع داخل وفارغ ہوتے رہے، لیکن "سید سلیمان ندویؒ" ہونے میں سب پیچھے رہے، بڑا راز اس کا ان کے کسب وطلب کا کمال ہی تھا، ان کی طالب علمانہ اور عالمانہ زندگی کی سیرت کا یہ بڑا قیمتی سبق ہے۔

علمی ذوق وشوق کی عام فضا ندوہ میں استاذ محترم (علامہ نعمانیؒ) کے دور میں پیدا ہوئی، لیکن سید صاحب جہاں تک دیکھا، سنا، اس سے پہلے بھی کتاب کے کیڑے تھے، کھیل کود میں کوئی نمایاں شرکت تو قطعًا یاد نہیں آتی، نہ میل جول، اور سیر وتفریح کی زیادہ عادت تھی، یہی رنگ طبیعت کا آخر تک رہا کہ خاص تعلق کے لوگوں تک بھی ''دلے بر ندش'' ہی پہنچ پاتے، گویا یکسوئی ان کا طبعی امر تھا، جو علم وعمل کی ہر راہ میں کسب کمال کی شرط ہے۔

سید صاحب کی طالب علمی کا زمانہ بڑا مسموم تھا، طلبہ کا کمروں میں چھپ چھپ کر تاش کھیلنا، راتوں کو پھاٹک پھاند پھاند کر ٹھیٹر جانا معمولی باتیں تھیں، پھر رات دن ساتھ رہنے والے طالب علموں میں ایک کا حال دوسرے سے کب تک چھپتا ہے، بایں ہمہ سید صاحب کی اس زہریلے ماحول سے تاثر کی کوئی بات دیکھنا کیا سننا بھی قطعًا یاد نہیں، بس ایک ہی بات کی شہرت تھی کہ پیاران کا زیادہ بند رہتا، مراد بکرے کا گوشت، اور گھی کے تار والا پیالہ ہے، جو اس زمانہ میں پانچ روپیہ ماہوار میں مستطیع وغیر مستطیع سب ہی طالب علموں کو دو وقت ملتا تھا، کسی کے پیالہ میں تار نہ ہوتا تو دستر خوان ہی پر صدائے احتجاج بلند ہوتی، نماز کی غیر حاضری پر منتظمین نے سب سے کارگر سزا اس عزیز پیالہ کا بند کر دینا ہی قرار دے رکھی تھی، اور مسجد بہتوں کو اس تار والے پیالہ کی کشش ہی پہنچاتی۔

ایک اور اصطلاح پوستین یعنی کاہل کی چلی ہوئی تھی، غالبًا بہار سے آمد کی ہوئی اور بہاری طالب علموں ہی کی چلائی ہوئی، بے تکلف احباب غریب سید صاحب پر اس کو خوب چست کرتے، ان کے پیالہ کی قربانی کا ذمہ دار زیادہ تر اسی کو خیال کیا جاتا، یہ چیز زندگی کی اکثر عادتوں میں کم وبیش زندگی بھر ان کی رفیق رہی، خطوں کا مہینوں جواب نہ دینا، کہیں جانے آنے یا سفر کا ارادہ کر کے بارہا پورا یا وقت پر پورا نہ ہونا، اکثر اس طبعی خصوصیت کا مظہر ہوتا، پوستینی اور کتب بینی میں بھی کچھ طبعی مناسبت معلوم ہوتی ہے، جس کا تجربہ راقم پوستین کو خود اپنی آخر زندگی میں خصوصًا ہو رہا ہے، اپنے مذاق کی کتابیں وغیرہ تو صبح سے رات تک پڑھتا رہ سکتا ہوں، کتاب ومضمون کی صورت میں کچھ لکھتا بھی رہ سکتا ہوں، لیکن

عجیب بات ہے کہ خط کا ایک کارڈ بھی طبیعت پر جبر کر ہی کے لکھا جاتا ہے، جگہ سے حرکت کرنا، اس کا تو یہ حال ہو گیا ہے کہ صبح یا شام مشی کی عادت کم وبیش چالیس سال سے جاری ہے، وہ تو عادت ہی کی بدولت چلی جاتی ہے، باقی کسی سے ملنے یا کسی اور کام سے کہیں جانا ہوتا ہے تو دنوں، ہفتوں اور بارہا مہینوں ٹالتا رہتا ہوں، اس ناکارہ کا تو ذکر ہی کیا، سید صاحب کی طرح بعض دوسرے اکابر علم وقلم کا بھی یہی حال دیکھا سنا، مولانا عبدالحمید فراہی رحمۃ اللہ علیہ جید عالم اور اپنے رنگ کے یگانہ مفسر ہی نہ تھے، بڑے صاحب تقویٰ وتقدس بزرگ تھے، انکے چھوٹے بھائی نے خود اپنی اور مولانا ممدوح کی اس ''پوستینی'' کی بڑی دلچسپ اور مزہ دار نوعیت سنائی کہ ہم دونوں بھائیوں کے دو اصول ہیں، ایک کا یہ کہ جو کام کل ہو سکے آج نہ کرو، اور دوسرے کا یہ کہ جو دوسرے سے ہو سکے خود نہ کرو، مزاج کی سنجیدگی بھی کچھ نہ کچھ سست روی کا رنگ اختیار کر لیتی ہے، سید صاحب کی غیر معمولی سنجیدگی ان کا بڑا نمایاں وصف تھا، جلد بازی سے کسی کام میں بھی ذہن وجسم کسی سے بھی کام لینا گویا جانتے ہی نہ تھے۔

اسی کی برکت تھی کہ ندوہ میں اعمال کے ساتھ عقائد کی سستی کا جب ایک تیز سیلاب آیا، تو سید صاحب اپنی جگہ سے اس سیلاب کی عین زد میں ہو کر بھی زیادہ نہ ہلے، راقم ہذا روشن خیالی میں اپنے کو ان سے بہت آگے پاتا، نقل کی کوئی بات عقل کی کسوٹی پر پوری اترے بغیر مان لینا بڑی بے عقلی جانتا تھا، پھر بھی سید صاحب کے علم وعقل کا اتنا قائل تھا کہ اپنے شکوک وشبہات ان ہی کے سامنے زیادہ پیش کرتا، ایک مرتبہ جبر وقدر کے متعلق اچھی طرح یاد ہے کہ ان کی تفہیم وتوجیہہ سے خوب تشفی ہو گئی، گو بعد میں شرح صدر الحمد للہ کہ خود کتاب اللہ سے نصیب ہوا، کہنا یہ ہے کہ سید صاحب ندوہ کے دور روشن خیالی وعقل پرستی میں بھی عقل پرست کبھی نہیں ہوئے۔

''نقد ہر سود در جیب زیاں انداختہ'' گو عقائد وایمانیات کی سستی وکمزوری سے بڑھ کر کوئی ضرر وزیاں نہیں، تاہم ندوہ میں علم وقلم کا ذوق وشوق اور دور دورہ اسی دور کی یادگار

ہے،اس ذوق وشوق کی بدولت نہ کہ دینداری کے جذبہ سے اخلاقی مفاسد کا زور بھی کم ہوا، جس میں کچھ بھی صلاحیت ہوتی تقریر وتحریر،ادب وانشاء،اردو،عربی یا دونوں کے میدان میں اتر پڑتا،بعضے غریب صلاحیت وعقل دونوں سے کورے کچھ نہیں تو نخاس سے ٹوٹی پھوٹی میز کرسی خرید کر روزانہ قلم کاغذ لے کر بیٹھ ضرور جاتے،اور بوزنہ صفت نقالی ہی سے اپنی تشفی کرتے،زیادہ چلن تاریخ اور ادب کا تھا،دونوں کی صلاحیت ومناسبت سے قطعاً محروم ہونے کے باوجود کتب خانہ جا کر ابن خلدون وابن خلکان خود میں بھی بوزنہ وار ہی دیکھا کرتا،عربی میں زبردستی مقرر بننے میں اتنی کامیابی حاصل کی کہ ایک دن استاد محترم (علامہ نعمانی) نے خود اپنے سامنے تقریر کرائی،اور پسند فرمائی،تقریر کا موضوع بھی عجیب وغریب،اب بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں میونسپلٹی اختیار کیا تھا،مگر صلاحیت کے خلاف زبردستی کے دن چل سکتی تھی،نہ مؤرخ بن سکا،نہ ادیب،نہ مقرر،نہ عربی کا،نہ اردو کا،طبیعت کو نسبۃً عقلیات سے کچھ لگاؤ پایا،وہ بھی زیادہ عقلیات جدیدہ سے،جس کی شد بد عربی رسائل،خصوصاً ''المقتطف'' سے شروع ہوئی،دین ومذہب کا جوڑ عقلیات میں کلامیات سے زیادہ لگتا ہے،اور جس طرح ''الفاروق''،''المامون'' کا مصنف تاریخ پسندوں کا آئیڈیل بنا،اسی طرح ''الکلام'' اور ''علم الکلام'' کا مصنف،اس عقل کے دیوانہ کا بن گیا تھا۔

ہمارے ''سید القلم'' کی قلم رو سے ماشاءاللہ کلامیات وعقلیات کی اقلیم بھی باہر نہ تھی،ضابطہ کا شاگرد تو یوں بھی ان کا ہو چکا تھا کہ استاذ مقرر ہونے پر میری جماعت کا بھی ایک سبق ان سے متعلق تھا،غالبًا ادب کی کسی کتاب کا،ساتھ ہی اس زمانہ میں جب وہ مدرسہ سے باہر مع اہل وعیال ایک چھوٹے سے مکان (موجودہ مرکز دعوت وتبلیغ کے قریب) قیام فرماتے،تو میری حاضریاں زیادہ ہونے لگی تھیں،ان حاضریوں میں کس نوع کا استفادہ زیادہ کرتا تھا،یہ بالکل یاد نہیں،اپنی اس وقت کی طلب وذوق کو دیکھتے قرین قیاس یہی ہے کہ کلامی وعقلی چیزوں میں زیادہ مستفید ہوتا ہوں گا۔

ندوہ کی تاریخ کا یہی وہ دور ہے جس میں ایک طرف علامہ نعمانیؒ جیسے صاحب علم

وقلم کی تربیت میں ہونے والے علامہ ندوی کے علم وقلم کے وہبی وکسبی جوہر روز بروز کھل رہے تھے،اور دوسری طرف حرف شناس راقم ہذا کی نیازمندیاں بھی اسی زمانہ سے سید صاحب کی خدمت میں بڑھیں۔

اس عہد میں مرحوم سے متعلق دہرانے والا وہی سبق برابر ملتا رہا کہ ذہنی ووہبی صلاحیتوں والے اور وہ بھی ندوہ میں ان کے برابر کے یا بڑھے ہوئے موجود تھے،لیکن کسب، طلب،اخذ واستفادہ کی دھن اور لگن میں انکا ہمسر کوئی معلوم نہیں،جب ان کے قیام گاہ کے چھوٹے سے بیرونی کمرہ میں حاضر ہوتا،فرش پر لیٹے بیٹھے کتاب یا قلم ہی سے مشغول پاتا،یا کبھی کبھی کسی بچہ کے ساتھ پدری شفقت کا حق ادا کرنے میں،شبلوی مجالس میں اور بھی بہت سے طلبہ واساتذہ ہوتے تھے،لیکن سید صاحب کا شاید ہی کسی مجبوری میں کوئی دن ناغہ جاتا ہوگا،اور خاص طور پر عام مجلس کے علاوہ اپنے مضامین کی اصلاح وغیرہ کے سلسلہ میں دوسرے خاص اوقات میں بھی سب سے زیادہ حاضر ہونے والوں میں وہی تھے۔

ملک میں چھوٹی بڑی سیکڑوں دینی درسگاہوں کے ہوتے ندوہ نے ایک نیا ''دار العلوم'' قائم کر کے دینی تعلیم وتربیت کے جن نئے مقاصد کا بیڑا اٹھایا تھا،ان میں سب سے نمایاں وقت کا ایک اہم دینی مطالبہ ایسے علماء کا پیدا کرنا تھا،جو عصری تقاضوں اور علوم وفنون سے آگاہ ہوں،اور ان کے مقابلہ میں دین کی علمی وعملی خدمات کا حق ادا کر سکیں،اس مقصد عظیم خصوصاً جدید علوم وفنون کی تعلیم کے لئے جیسا سامان،سرمایہ درکار تھا،ندوہ کو کبھی میسر نہ آیا،بے سروسامانی کے دیکھتے،اس نے طلبہ میں نفس مقصد کی روح پھونکنے میں جتنی کامیابی حاصل کی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظاہری ساز وسامان بھی اگر کسی معتد بہ درجہ میں فراہم ہوتا تو اسلامی نقطۂ نظر سے دینی ہی نہیں،نبوی یا سیاسی وقومی قیادت کا مرکز ہندوستان کیا شاید سارے عالم اسلامی کا آج ندوہ ہی ہوتا۔

پھر بھی بہت سے ندویوں نے اس روح سے چونک کر ذاتی شوق وشغف اور کوششوں سے جس حد تک ندوہ کے مقصد کو پورا کر سکتے تھے کیا،اور جماعتی حیثیت سے

ندوی قلم نے جدید طبقات میں جو اعتبار پیدا کیا، اور کم وکیف دونوں طرح جو خدمات انجام دیں کسی دوسرے مدرسہ وادارہ میں اس کی مثالیں شاذ ونادر افراد ہی تک ملتی ہیں، وہ بھی اعتراف کرنا چاہئے کہ ندوہ ہی کی آواز بازگشت ہے، دارالمصنفین جیسے ایک مستقل ومستند تصنیفی ادارہ اور تربیت گاہ کو ندویوں ہی نے وجود بخشا، اور کون نہیں جانتا کہ اس وجود کا آغاز وانجام سید صاحب ہی کی ذات تھی، نری کتب فروشی یا کتب سازی کے علاوہ اب خالص تحقیقی وتصنیفی ذوق یا اس کی تربیت وتعلیم کے جو کچھ بچے کھچے آثار رہ گئے ہوں، ان کو اسی ذات والاصفات کے باقیات صالحات میں شمار کرنا چاہئے۔

راقم سطور نے کسی کتاب کے دیباچہ یا مقدمہ میں مرحوم کے اس مرتبہ ومقام کے مدنظر ان کو دارالمصنفین کا ''سید الطائفہ'' لکھا تھا، لیکن آج جب ماضی ومستقبل کی طرف نگاہ جاتی ہے، تو ان کی ہستی دارالمصنفین ہی نہیں ندوہ اور ندویت کی پوری ساٹھ سالہ تحریک وتاریخ کی سید الطائفہ نظر آتی ہے، ماضی میں تو ظاہر ہے کہ ندویت کے نام وکام میں اس مقام تک رسائی کسی نے نہیں پائی، مستقبل میں بھی امید بخش آثار وعلائم نہیں، زبان خلق کا یہ ''خدائی نقارہ'' ہی معلوم ہوتا ہے کہ مطلق ''علامہ ندوی'' یا ''مولانا ندوی'' سے ندویت کا یہ فرد فرید سید الطائفہ مراد ومفہوم ہوتا رہے گا، بظاہر آئندہ ندوہ میں ''سلیمان'' کے نقش ثانی کے ابھرنے کی توقع نہیں، والغیب عند اللّٰہ۔

اسلام کی علمی وقلمی خدمات کا سب سے عظیم الشان وعالی مقام کارنامہ سید صاحب کا بالکل بجا طور پر سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا جاتا ہے، لیکن حضور کی سیرت کیا خود حضور کے دشمنوں نے بزعم خود بڑی سے بڑی داد تحقیق کے ساتھ نہیں لکھی، دشمنوں کو جانے دیجئے، دوستوں یا مسلمانوں کے متعلق سوال ہے کہ دین کی کوئی چھوٹی بڑی خدمت اگر دل کے اخلاص اور ایمان کے قلبی داعیات ومحرکات کے ساتھ انجام نہ دی گئی ہو تو اسلام کے ترازو میں اس کا کیا وزن ہوگا؟ وہاں تو ہر چھوٹے بڑے عمل کی قیمت اسی حساب سے لگے گی جس حساب سے وہ کفر وشرک ہی نہیں، ریا ونفاق، مال ودولت، جاہ

وشہرت کی گندگیوں اور آلائشوں سے پاک دل ودماغ سے کیا گیا ہوگا، خود اسلام کی کتاب نے حصر کے ساتھ اسی کا تو مطالبہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول صرف اس کو نصیب ہوگا، جو اس کی رضا، جزا یا آخرت کی فوز وفلاح کے سوا نام ونمود، مال ومنال وغیرہ تمام ناپاکیوں سے پاک وصاف، دل لے کر حاضر ہوگا ''الا من اتی اللّٰہ بقلب سلیم''۔

تصوف کے نام کو بہت سے اچھے خاصے اہل علم افراد وجماعتوں نے محض کسی خاص تعصب وتوہم یا مزاجی خشکی وتوہب کی بنا پر اپنی چڑھ بنالی ہے، ''ندویت'' بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، حالانکہ تصوف کے اس عنوان کا مسمی ومعنون قلب کو قلب سلیم بنانے یعنی اس کی صحت وسلامتی یا باطنی رذائل سے صفائی کے سوا کیا ہے، قلب کے اس تصفیہ وتزکیہ سے تقویٰ کی زندگی اور اللہ تعالیٰ سے احسانی نسبت پیدا ہوتی ہے جب تک قلب دنیا کی ہوا وہوس کا بت خانہ بنا ہوا ہے، اس وقت تک سچ یہ ہے کہ کفر وشرک ہی نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا، اخلاقی وباطنی رذائل اکثر کفر وشرک ہی کے چھپے ہوئے شعبے ہوتے ہیں، آخر خود قرآن ہی نے ''ھوی'' کو بھی ''الٰہ'' یا معبود کہا ہے، ''مَنِ اتَّخذَ اِلٰھَهُ ھَوَاهُ'' تو ہوا پرستی کے ساتھ خدا پرستی کیسے جمع ہوسکتی ہے، اگر ریا ونفاق کا روزہ نماز، روزہ نماز نہیں، تو تحریر وتقریر، تالیف وتصنیف کی نام نہاد دینی خدمات کی تہ میں بھی خدانخواستہ جاہ وجلال یا نفس ونفسانیت کے جذبات شریک ہوں تو خدا ورسول کی راہ میں یہ شرک کے سوا کیا ہوگا؟

دین کے معروف ومسلّم خدمت گذاروں تک کو دیکھا جاتا ہے کہ ان کا قلم کسی مسئلہ ومعاملہ میں ایک دوسرے کی تردید وتنقید پر چلتا ہے، تو شاید ہی کوئی قلم باہمی بغض وحسد میں تنقیص وتحقیر کی ذاتیات تک نہ اتر آتا ہو، بلکہ اس نمک مرچ کے بغیر قلم میں زور ہی نہیں آتا، حال ہی میں دیکھا کہ ایک دینی ہی جماعت کی کسی کتاب میں دوسری جماعت کی خدمات کا ذکر واعتراف نہ تھا، اس پر قلم میدان میں آگیا، کیسی چھوٹی اور اوچھی بات! دور ونزدیک سے بہت سے نئے پرانے اہل قلم کو جاننے پہچاننے کا موقع ملتا رہا، مگر اس طرح کی نفس ونفسانیت کے مظاہروں سے پاک ایک مثال بھی ذہن میں نہیں، تھوڑی

بہت اگر ہے تو انہی کی جنہوں نے:

پیش مرد کاملے پامال شو

کی تھوڑی ہمت پائی، ورنہ عام طور پر تو خالص دینی مقاصد کے نام پر رسالے نکالنے والوں، مضامین لکھنے والوں اور کتابیں تصنیف کرنے والوں کے دل میں تو یہ سوال بھی شاید پیدا ہوتا ہوگا کہ کسی خدمت وعمل کے دینی یا مقبول ہونے کی پہلی شرط مقصد وارادہ یا قلب ونیت کی سلامتی وصحت ہے، صحیح نیت کے بغیر دین کی نگاہ میں کسی عمل کا اعتبار ودرجہ نہیں، "إنّما الأعمال بالنّيات" بخاری شریف کی پہلی حدیث ہے۔

قلم والوں کا بڑا دعویٰ اپنے علم وفہم کا ہوتا ہے لیکن دین کی فہم بھی تقویٰ ہی سے پیدا ہوتی ہے، اور تقویٰ کا سرچشمہ قلب ہی ہے، حضور نے قلب ہی کی طرف اشارہ فرما کر تکرار واصرار کے ساتھ فرمایا کہ تقویٰ یہاں ہے تقویٰ یہاں ہے، "التّقوىٰ ههنا، التقوىٰ ههنا"، خود قرآن مجید نے ہدایت یابی کی کہ وہی صحیح فہم قرآن ہے، شرط پہلے قلم ہی پر جو لگائی وہ نہ قلم کا مرد میدان ہوتا نہ کتابوں کا حمّال ہوتا، بلکہ متقی ہوتا "هدًى للمتقين"۔

ایک طرف اپنے علم ونظر کی حد تک ایک "اتقی الناس" اور اس کے علم وعمل، فہم وفراست کو سالہا سال دیکھ کر یہ حقیقت دل میں بیٹھ چکی تھی کہ دین خالی کتاب وقلم سے ہرگز نہیں پیدا ہوتا، نہ علم میں نہ عمل میں، اور دوسری طرف اس مرض کا شدید مریض ہوں کہ کسی شے وشخص کی کوئی خرابی وخامی چھوٹی ہو یا بڑی دیکھی نہیں جاتی، راستہ میں گر کوئی نل کھلا اور پانی ضائع ہوتا دیکھتا ہوں، تو جب تک اس کو بند نہ کرلوں، قدم آگے بڑھایا نہیں جاتا، تو پھر گھر یا ہر عزیزوں، دوستوں، ملنے جلنے والوں میں دین ودنیا کی کوئی کمی وکوتاہی دیکھ کر کیسے رہا جاسکتا ہے، خود علم وعمل، ظاہر وباطن ہر طرح کے نقائص وذمائم کا مجسمہ ہوں، اور ان کی دینی ودنیوی مضرتوں کو دن رات محسوس کرتا رہتا ہوں اس لئے اور بھی ہمدردی کا احساس تیز ہوگیا ہے، بالکل جس طرح دمہ کا کم وبیش چالیس سال سے مریض ہوں، اور اس کی تکلیف میں راستہ چلتے بھی کسی کو مبتلا دیکھ لیتا ہوں تو یہاں تک ہوا کہ گھر لوٹ آیا اور عارضی افاقہ کی

جو مشہور ومجرب دوائیں ہمیشہ پاس رہتی ہیں، لے جاکر پہلے کھلا دیا، جب چین پڑا،

اپنا یہ مرض اس لئے عرض کردینے کی ضرورت پڑی کہ سید صاحب کے علمی وقلمی کمالات ہی نہیں، بہت سے فطری وذہنی، اخلاقی وقلبی فضائل کا زندگی کے مختلف حالات ومعاملات میں جو تجربہ سالہا سال ہوتا رہا تھا، ان میں بس یک ہی آنچ کی کسر نظر آتی کہ کسی مرد کامل صاحب نظر تک پہنچ جائیں، ایسے صاحب علم وفضل کے لئے وہ نظر اشرف صرف تھانہ بھون میں نظر آئی، اور آخر اپنے اسی مرض "خیر خواہی" سے سے مضطر ہوکر دھیرے دھیرے ادھر متوجہ کرنا شروع ہی کردیا، ابتداء غالباً تھانہ بھون ہی کی کسی حاضری کے دوران میں ہوئی، وہیں یہ تقاضا قلب میں تیز ہوجاتا تھا کہ میرے جیسے بے علموں سے زیادہ اور بہت زیادہ یہ آستانہ سید صاحب جیسے اکابر علم وقلم کے استفادہ کا ہے کہ ان کے افادات کا سونا یہاں کی ایک آنچ میں انشاء اللہ کندن ہوجائے گا، الحمد للہ ایسا ہی ہوا۔

بہتوں کو حیرانی رہی کہ مرحوم نے ایک ہی جست میں ندوہ سے دیو بند تک کا فاصلہ کیسے طے فرمایا، راز سننے سنانے اور سبق لینے کا ہے، سید صاحب ماشاء اللہ صوفی پیدا ہی ہوئے تھے، خدا رسی سے مانع کفر کے بعد، بلکہ کفر کی بھی جڑ کبر ہے، ابلیس کو ابلیس ابا واستکبار ہی نے بنایا، "اَبىٰ واستكبر و كان من الكافرين"، خصوصاً جو کبر علم اور اس سے بڑھ کر قلم کے زعم سے پیدا ہوتا ہے اس کے "حجاب اکبر" کی مثالیں ایسی ایسی خود مشاہدہ میں آئیں کہ بس اللہ ایسے علم وقلم سے پناہ میں رکھے، اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ حضرات صوفیہ کے یہاں اس شیطانی خودی وخودرائی کے مٹانے پر اتنا زور کیوں ہے، حضرت حکیم الامت ہی فرمایا کرتے تھے کہ اس ارادہ کا حاصل بس خود کو مٹا دینا ہے، خدا وبندہ کے درمیان سب سے بڑا حجاب "خودی" ہے:

تو خود حجاب خودی حافظ از میان برخیز

مرحوم معصوم نہ تھے ان کی زندگی کا جو رخ طالب علمی سے لے کر آخر تک کم وبیش ہر نوع کے سابقہ میں سب سے زیادہ معصوم نظر آیا وہ یہی کہ خودرائی وخود پسندی دور دور نظر

نہیں آئی، طالب علمی میں ان کا شمار ممتاز اور آگے چل کر ممتاز ترین طلبہ میں رہا لیکن نیچے سے نیچے درجہ کے طالب علموں کے ساتھ بھی کسی برتاؤ میں کوئی امتیاز ظاہر نہ ہوتا، عام طور پر دوسرے طلبہ ہم چشموں میں کچھ بھی امتیاز رکھتے، تو اس کو دبا نہ سکتے، چندہ کے وفدوں میں بارہا ساتھ ہوا، رئیس وفد سید صاحب ہی ہوتے، مگر یاد نہیں کہ کسی موقع پر کسی طور وطریق سے بھی دوسرے رفقاء پر اپنا رئیس ہونا ظاہر ہونے دیتے۔

طالب علم سے جب استاد ہوئے تو خود اپنا ایک ایسا تجربہ سناتا ہوں کہ آج بھی اس کی شرم سے گڑ جاتا ہوں، ایک سبق میری جماعت کا بھی ان سے متعلق ہوا، اب میرا شمار بھی کچھ اچھے طلبہ میں تھا، غالباً اسی کا غرور تھا کہ اس سبق میں جانا چھوڑ دیا کہ کل تک جس سے طالب علمانہ ہمسری کا دعویٰ تھا آج اس کی استادانہ برتری کیسے قبول کرلوں، سید صاحب اس کم ظرفی کے جواب میں ضابطہ سے کام لیتے تو سزا دلوا سکتے تھے، سرکشی سے باز نہ آتا تو مدرسہ سے نکلوا سکتے تھے، مگر ان کی عالی ظرفی نے اس سب کے بجائے کس طرح کہوں کہ کیا کیا نئے استاد نہیں پرانے طالب علم بھائی بن کر الٹے خود ہی سمجھا بجھا کر کسی طرح منا لیا! مرحوم کی شفقت ومحبت کا یہ پہلا، بیج تھا جو دل میں پڑا، پھر آخر تک بحمد للہ پھلتا پھولتا رہا، دخل اس میں ان ہی کی بے نفسی کو زیادہ رہا۔

آگے چل کر دار المصنفین اور دار العلوم ندوہ کے جب تک وہ ناظم ومعتمد رہے، اور میری رکنیت یا ضابطہ کا کچھ تعلق رہا، ایک موقع بھی خیال میں نہیں کہ اپنے مزاج ومذاق کے خلاف بات کو بھی پوری توجہ سے سنا ہو اور سمجھ میں آتے ہی بے تامل قبول نہ فرما لیا ہو، حالانکہ بعض دوسرے احباب جو ہر طرح مرحوم کے خورد نہیں، احقر سے بھی عمر میں بہت کم، ان کے مقابلہ میں کوئی بات میری مان لینا چاہتے، تو دیکھا کہ کبھی کبھی میرے ساتھ ان کو بھی سختی سے اور بگڑ کر جواب دیتے، بعض بڑے صالح اور بہت کم عمر دوستوں بلکہ کبھی کے شاگردوں تک کا یہ تجربہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کوئی علمی وقلبی یا جماعتی وتحریکی بڑائی عطا فرمادی، تو اپنی رائے ورنگ کے خلاف بات کا قبول کرنا کیا سننا بھی توجہ سے گوارا نہیں

کرتے، یا جواب جاہلان باشد خموشی کا زبان حال سے اعلان کرتے ہیں، باقی اپنی کسی رائے سے خوش دلی سے رجوع کرتے، یا کسی کوتاہی کا برملا اعتراف واعتذار، اس کا تجربہ تو آج کے مشاہیر علم وقلم سے شاذ ہی ہوتا ہے لیکن سید صاحب کی روح ایسے مواقع پر کیسی بے چین ہو جاتی تھی۔

اس زیر تحریر مضمون ہی کے لئے ان کے کچھ پرانے محفوظ خطوط دیکھنے لگا، ان میں ایک ایسا معذرت نامہ ملا کہ آج ان کی روح عالم آب وگل میں مل جاتی تو بے تابانہ قدموں میں گر جانے کا جی چاہتا تھا، غالباً دار المصنفین ہی کے کسی معاملہ میں میری نسبت کچھ غلط فہمیاں ان کو پیدا ہو گئیں، ان سے ایسا متأثر ہوئے کہ خود مدعیٰ علیہ کو صفائی کا موقع دیئے بغیر ایک بڑا طویل شکایات نامہ تحریر فرما دیا، فوری تأثر کے بعد نظر ثانی پر واللہ اعلم کیا محسوس فرمایا، اور کتنے بے قرار ہوئے کہ میرے جواب کا انتظار بھی نہ فرما سکے، معذرت نامہ نہیں ان کی اخلاقی کرامت کا یہ بڑا یادگار کرامت نامہ ہے:

''پرسوں نرسوں میں نے آپ کو ایک طویل خط لکھا تھا، مقصود یہ تھا کہ مدت سے میرے دل پر ایک بوجھ تھا، وہ ہلکا ہو جائے، مگر دیکھتا ہوں کہ اس خط کے لکھنے کے بعد دوسرے قسم کا بوجھ بڑھ گیا، میں نے رات اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ میرے دل میں کسی مسلمان کی طرف سے غبار نہ پیدا ہو، بایں وجہ جو کچھ میں نے لکھا تھا، اس کو ایک راز سربستہ کی طرح دفن فرما دیجئے، اور مجھے معاف کیجئے کہ میں گو اپنے جانتے صرف اخلاص سے اور آئندہ کے لئے حسن معاونت کی خاطر لکھا تھا، مگر میرا دل مجھے ملامت کرتا ہے کہ تجھ سے آخر صبر نہ ہو سکا، اب اس کی تلافی یہی ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں، اور میری اس تحریر کو بھی میرے گذشتہ اعمال بد کا ایک جزو ہی سمجھ لیں، اس وقت مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں، اس وقت کا احساس یہی ہے، کوشش کروں گا، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا کہ میرا یہی احساس قائم رہے''۔

اس ''می آرم اعتراف گناہ نبودہ'' کے بعد بھی ''سید القلوب'' کو چین نہ آیا، آگے فرماتے ہیں کہ:

''میں بے چینی سے آپ کے لطف آمیز ومحبت آمیز خط کا انتظار کروں گا آپ کا یہ بڑا بھائی کم ہمت ہے، اپنی کم ہمتی سے ایسا کر گزرا ہے، اور شاید عمر میں اس کا پہلا قصور ہے، آپ کا بڑا احسان ہوگا، اگر آپ اس تحریر کو نسیًا منسیًا سمجھیں..... آپ کا مجھ پر بڑا کرم ہوگا''۔

اب یاد کیا آسکتا ہے کہ اس سراپا کرامت ''کرامت نامہ'' کا جواب کیا عرض کیا، مگر اپنے نفس کو ٹٹولتا ہوں تو اس کی موٹائی سے خیال یہی ہوتا ہے کہ بہت زور لگانے اور تکلّف وتصنّع سے کام لینے پر بھی جواب میں ان کی بے نفسی کا مقابلہ ہرگز نہ ہوسکا، اپنی نالائقیوں اور کوتاہیوں کی معافیاں ان سے اور دوسروں سے مانگنے کی توفیق، الحمدللہ بارہا ملی، اور ملتی رہتی ہے لیکن شکستگی اور فروتنی کے اس بلند مقام تک رسائی چھوٹوں کیا کسی بڑے کے مقابلہ میں بھی یاد نہیں، سن وسال، علم وفضل، جاہ ومرتبت ہر لحاظ سے بڑے سے بڑے اور استاد تک ہوکر اپنے کم ہمت بڑا بھائی ہونے کا جس طرح اظہار فرمایا ہے، ذرا کوئی چھوٹا سے چھوٹا بھی یہ ہمت کر کے دیکھے، تو حضرت مرحوم کی قدر وکرامت معلوم ہو۔

سید صاحب کی بے نفسی کا یہی وہ فطری جوہر تھا، جس نے اس راقم بے بساط جیسے کی توجہ دلانے پر علم وفضل کی ساری ندوی شہرت وعظمت کو ایک خانقاہ نشین دیوبندی کے قدموں پر بے تکلف نثار کر دیا، کچھ غیبی کشش پہلے سے بھی تھی جس کا ایک والا نامہ میں اس طرح اظہار فرمایا کہ:

''مولانا گیلانیؒ نے مجھے لکھا ہے کہ سنا آپ نے بھی ایک دیوبندی کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا ہے، میں لکھنے والا تھا کہ ہاتھ گو اب بھی دیا ہو نہ دیا ہو مگر دل تو اس کو دس بارہ برس پہلے دے چکا تھا، پھر مجھے فخر یہ ہے کہ آپ لوگوں نے مولانا تھانوی کو اپنی طرف کھینچا اور مجھے خود مولانا تھانویؒ نے بار بار اپنی طرف کھینچا، (بمعالم رویا)''۔

اس بیعت وارادت کی نہ خود حکیم الامت کے ہاں کوئی خاص اہمیت تھی، نہ میں نے کبھی صلاح نیک کے سلسلہ میں اس کی طرف کوئی اشارہ کیا، اشارہ وتصریح دو ہی باتوں کی بار بار کرتا رہا، ایک تو یہ کہ فہم دین بھی محض کتابی تعلیم وتعلم سے پیدا نہیں ہوتی، دوسرے یہ کہ بظاہر بڑی سے بڑی خدمت دین کا بھی صحیح معنی میں خدمت دین یا عنداللہ مقبول ہونا قلب ونیت کی سلامتی کے بغیر مشتبہ ہی رہتا ہے، اور تزکیۂ باطن کی یہ دولت کسی ''مُزکی'' کی صحبت وتربیت کے بغیر میسر آنا الشاذ کالمعدوم ہے۔

سید صاحب ماشاء اللہ علمی وفطری طور پر اس حقیقت کی تصریح وتفصیل کے محتاج نہ تھے، منقولہ بالا والا نامہ ہی میں ہے کہ:

''میں آپ کا ممنون ہوں کہ مجھے ہر وقت صلاح نیک دیتے رہے، آخر وہ وقت آیا کہ دس بارہ برس سے جو چیز نظری طور سے سمجھ میں نہ آتی تھی، وہ عملاً سمجھ میں آگئی، اور اب تلافی مافات میں مصروف ہوں ''لعل اللّٰہ یرزقنی صلاحًا''۔

اس دور از صلاح کی ''صلاح نیک'' کا تعلق زیادہ تر عملی قدم اٹھانے ہی کی طرف ملتفت کرنے سے رہا، تھانہ بھون کے دوران حاضری میں قدرۃً اس کا خیال زیادہ ہوتا، جولائی واگست ۳۸ء کی حاضری میں کچھ طویل قیام کی سعادت حاصل تھی، تو ذرا کھل کر اور اصرار سے لکھا کہ بس اب میری اس حاضری کے زمانہ میں ہمت فرما کر آہی جائیں، اصرار کی وجہ خصوصیت کے ساتھ یہ تھی کہ حضرت علیہ الرحمہ کا سلسلۂ علالت طول پکڑتا جارہا تھا، ڈر تھا کہ کہیں یہ آفتاب ارشاد وتربیت لب بام نہ ہو، مقامی اور پرانے علاج اور معالجوں سے کوئی نمایاں نفع نہ ہو رہا تھا، بالآخر علاج کی غرض سے لکھنؤ آنا طے پایا، ۱۰؍اگست کو تھانہ بھون سے روانہ ہوکر رات کو سہارنپور میں قیام فرمایا، اور دوسرے دن لکھنؤ تشریف فرما ہوگئے، زندگی میں پہلی اور آخری دفعہ ریل کے ایک ہی ڈبہ بلکہ ایک ہی بنچ پر معیت سفر کی سعادت بھی نصیب ہوگئی، آداب نو کے کتنے اور کیسے کیسے سبق ملے۔

سید صاحب کی خدمت میں اس دفعہ میرا عریضہ خاص طور پر تفصیل واصرار کا

ضرور تھا، پھر بھی قبول کی امید کم تھی، لیکن قلوب میں جس کے ہاتھ میں ہیں اس کو پلٹتے کیا دیر لگتی ہے، تھانہ بھون پہونچ ہی گئے، البتہ ایک دن بعد، ذوق طلب کو کچھ اور تیز ہونا تھا۔

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک　　آتشِ عشق تیز تر گردد

میرے عریضہ کا جواب بھی تھانہ بھون ہوتا ہوا لکھنؤ میں ملا کہ:

''لفافہ ملا۔ میں آپ کے حرف حرف سے متفق ہوں، ابھی صبح انشاء اللہ علی گڑھ کے لئے روانہ ہوتا ہوں، خوشی ہوئی کہ آپ ۲۵؍اگست تک وہاں (تھانہ بھون میں) رہیں گے، انشاء اللہ شاہدرہ لائن ریلوے سے ۱۱؍اگست کی شام کو پہنچتا ہوں، دو روز ٹھہروں گا اور بقدر ظرف فائدہ اٹھاؤں گا''۔

تھانہ بھون میں مطلوب کو نہ پا کر سیدھے لکھنؤ کی راہ لی ایک ہی آنچ کی تو کسر تھی، چار ہی دن میں رُخ پلٹ گیا، واپسی پر تحریر فرمایا کہ:

''لکھنؤ میں چار ہی روز صحبت رہی، مگر مولانا کی شفقت میری عقیدت کو بڑھاتی رہی، اور آخر ان کی ہدایت کے بموجب، اور آپ کا مشورہ تو پہلے سے یہی تھا، باب مکاتبت وا ہے، اور اب تو وہی وہ ہیں،

آتے ہیں نگاہوں میں خیالوں میں دلوں میں

معائنہ سے بڑھ کر تصور میں مکالمہ تک نوبت آتی ہے،

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

بہر حال اب اپنی طرف سے سفر شروع کر دیا ہے، منزل پر پہنچانا جس کا کام ہے وہ پہنچائے گا، دعا کیجئے.....''

مولانا کے مواعظ و رسائل پڑھتا ہوں، اکثر علمی مسائل بھی اپنے ہی مذاق کے مطابق پائے، اور احوال و کیفیات میں ان سے نئی نئی گرہیں کھلتی ہیں، افسوس کہ اتنے دنوں کیوں غافل ومحروم رہا''۔

زیادہ تر یہی افسوس راقم کو بھی اپنے خوردانہ حدود سے تجاوز کر کے بار بار عرض

واصرار کا باعث ہوتا رہا، یہ بے علم وعمل نامہ سیاہ جو ہر تنکے کا سہارا ڈھونڈھتا ہے، اپنے حق میں اس کو رحمت حق کا ایک بڑا سہارا جانتا ہے کہ حضرت مرحوم کی زندگی بھر کی خدمات علم وعمل کو مقبول ومقبول تر بنانے والا انشاء اللہ ان کی زندگی کے قلبی انقلاب کا یہی آخری دور یا حسن ختام ثابت ہوگا۔

صد کتاب و صد ورق درنا رکن　　جان و دل را جانب دلدار کن

کے عالم میں اور مکتوب میں فرماتے ہیں:

''برادرم مکرم! میری عمر اب ساٹھ کے قریب آگئی، میں دنیا کو نہ چھوڑوں، دنیا خود مجھے چھوڑ رہی ہے، اب نہ دار المصنفین سے زیادہ دلچسپی ہے نہ ندوہ سے، اور نہ علمی مقالات وتصانیف سے، چونکہ میری روزی قلم سے وابستہ ہے، اور گھر میں اثاثہ بھی نہیں، اس لئے لاچار پھرتا ہوں، خدا تعالیٰ ہمت دے کہ ترک تعلق کر سکوں، آپ بھی میرے لئے دعا فرمائیں''۔

دار المصنفین میں ہیں تو فکر لوگوں کو اب خالی مصنف بنانے کی نہیں، احقر کی اس بارے میں ایک درخواست کے جواب میں ارقام ہے کہ:

''میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ رفقا میں وہ فضا پیدا ہو جس کی تمنا آپ کو ہے، مگر ظاہر ہے کہ مجھی میں کیا ہے، جو دوسروں پر اثر ہو، حضرت کی باتیں ان کو سناتا ہوں، اور ان کی تصنیفات کی طرف متوجہ کرتا ہوں''۔

ہر بہانہ سے حضرت علیہ الرحمہ کی کتابوں کی طرف رفقاء کو مائل فرمانا چاہتے ہیں، ایک ذرا آزاد مزاج رفیق قدیم کا ذوق حضرت کی ادبیت کا ذائقہ چکھا کر اس طرح بدلنا چاہتے ہیں کہ اب وہ ادبیت کی تلاش میں ان (حضرت) کی تصنیفات پڑھیں گے، اور ممکن نہیں کہ یہ بالواسطہ مطالعہ ان کے دل کے اندر گھر نہ کرے آگے کیسے درد دل کی آواز ہے!

''برادرم! صمیم قلب سے دعا کیجئے کہ دار المصنفین کی یہ چھوٹی سی برادری صراط مستقیم کو پا کر اس پر قائم رہے، اور ہم لوگوں کی عمر بھر کی محنت ہمارے لئے وبال آخرت بننے

کے بجائے باعث برکات وخیرات ہو"۔

یہ چھوٹی سی برادری حضرت مرحوم کی پوری وفاداری کا حق جب ہی ادا کرسکتی ہے کہ ان کی سب سے بڑی زندہ یادگار دارالمصنفین میں ایمان واخلاص کی وہی روح اپنے تمام نجی تعلقات اور ادارہ کی خدمات میں پیدا کرے جس کے خود حضرت مرحوم اپنے وہاں کے آخری دور قیام میں ساعی ومتمنی تھے، قلب وباطن کی صلاح وسلامتی کی روح کے بغیر جب خالص دینی اعمال تک جاہ ومال، ریا ونفاق وغیرہ سے آلودہ ہوکر خالص دنیا طلبی سے زیادہ ناپاک ہوجاتے ہیں تو علم وقلم کی بظاہر اعلیٰ سے اعلیٰ خدمات بھی اس روح کے بغیر محض دین کی چھاپ لگا دینے سے وبال آخرت کے سوا کیا بن سکتی ہیں۔

الحمدللہ کہ سید صاحب رحمہ اللہ کے اس انقلاب حال کی برکت سے دارالمصنفین کے بہت سے حضرات نظری طور پر قلب وقالب دونوں کی صلاح وفلاح کی اہمیت سے خوب آشنا ہوچکے ہیں، لیکن عملی طور پر نفس وشیطان سے زندگی کی آخری سانس تک بھی مامون ومطمئن نہ ہونا چاہئے، یہ غفلت انتہائی ہلاکت تک پہنچا سکتی ہے، ہر عمل وحرکت میں قلب کی نگرانی مرتے دم تک جاری رہنا ضروری ہے، پھر علم وقلم کی خدمت تالیف وتصنیف سے لے کر طباعت واشاعت تک کے ہر چھوٹے بڑے خادم کے لئے وبال آخرت کے بجائے انشاء اللہ تمامتر باعث خیر وبرکت ہی ہوگی، اور خود حضرت مرحوم کی ایسی خیر جاری یادگار جو ان کی روح کے لئے ابدی سرور وسکون کا سرمایہ ہوگی۔

سید صاحب "بطنی سید" ہی نہیں ماشاء اللہ بڑے "بطنی سعید" تھے، بظاہر ان کی روزی قلم سے وابستہ ضرور رہی، تاہم انہوں نے خالص روزگار بنا کہ قلم شاید ہی کبھی چلایا ہو، بطنی سعادت ہی کی بدولت علمی کبر وغرور کا بھی کوئی شائبہ ان میں مشکل ہی سے نظر آتا تھا، انتہا یہ کہ راقم الحروف کی علمی خصوصاً علوم دین کی بے بضاعتی سے ناواقف نہ تھے، پھر فن سیرت میں کسی فنی وعلمی بصیرت سے اور بھی محروم ہی رہا، چہ جائے کہ خود سید صاحب جیسے اس فن کے مسلم ماہر ومحقق کے سامنے، مگر سیرت کی پانچویں جلد نکلنے پر خصوصیت کے ساتھ

کیا تحریر فرمایا کہ:

"آپ نے سیرت کی پانچویں جلد پڑھی بھی، آپ لوگوں سے اس لئے نہیں پوچھتا کہ تحسین مقصود ہے، بلکہ اس لئے کہ میں محسوس کروں کہ غلط نہیں چل رہا ہوں، سہارا چاہتا ہوں، تعریف نہیں"۔

جب تھانوی علم وعمل کی روشنی میں اس بے علم وعمل کی آنکھوں پر سے بھی جہل مرکب کے کچھ پردے ہٹے تو نہ صرف ظاہری وباطنی گونا گوں علمی واخلاقی بیماریاں علاج طلب نظر آئیں، بلکہ ندویت اور روشن خیالی کے عہد کا ایمانی واعتقادی اضمحلال بھی سامنے آیا، تو بعض ایسی تحریریں جن کا تعلق کچھ دینی مباحث سے تھا، حضرت علیہ الرحمۃ کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ خود ہی پیش کردیں کہ ضلال واضلال دونوں کی ممکن تلافی وتدارک کی ہدایت فرمائی جائے، سیرت ہی کی تیسری جلد میں معجزات پر میرا ایک مضمون شریک تھا، جس میں کوئی بات حضرت کو اصلاح ورجوع کی نظر آئی، اور اس کے اعلان کا ایما فرمایا، میرے نفس نے تو خود الحمدللہ مطلق کشمکش نہیں کی اور معارف میں اشاعت کے لئے سید صاحب کو ایک تحریر بھیج دی۔

وہی ایک آنچ کی کسر اپنی اس علمی بے نفسی کے باوجود جس کا اپنا ہی تجربہ ابھی اوپر ہی عرض کرچکا ہوں، اس کے شائع کرنے میں لیت ولعل فرماتے رہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دارالمصنفین خصوصاً سیرت کے علمی وتصنیفی وقار کا اس میں استخفاف محسوس فرما رہے ہیں، بالآخر میرے اصرار پر فرمایا کہ ایسا ہی ہے، تو دوسرے ایڈیشن میں نظر ثانی کرلینا میں نے عرض کیا کہ اس کی نوبت خدا جانے کب آئے، اور حضرت کا منشا فوری اصلاح واعلان کا معلوم ہوتا ہے، تب بادل ناخواستہ وہ بھی میری خاطر سے شائع فرمایا۔

حضرت کے یہاں اہل قلم کا یہ ایک بڑا امتحان ہوا کرتا تھا، کہ اپنی قلمی غلطیوں یا لغزشوں کے اظہار میں نام نہاد علمی وقار شان تو مانع نہیں ہوتی، نیز شیخ کے مقابلہ میں اپنی رائے کے فنا کرنے پر کہاں تک آمادگی ہے، ایک ایسے ہی شیخ التفسیر اور تفسیری مصنف جو

اپنی تربیت واصلاح کے لئے مکاتبت شروع بھی کر چکے تھے اس امتحان ہی کے سلسلہ میں نکل بھاگے، عام طور پر تو فنا کو آخر مقام کہا جاتا ہے، لیکن حکیم الامت کی حکیمانہ رائے میں فنا ہی اول مقام تھا، اور تائید میں عارف روم کا یہ شعر پڑھا کرتے:

ہیچ کس را تا نہ گردد او فنا　　نیست رہ در بارگاہ کبریا

کوئی عقلمند مریض طبیعت معالج کی تشخیص وتجویز کے مقابلہ میں اپنی رائے لگانا اور چلانا چاہے تو اس کا علاج شروع ہی کیسے ہوسکتا ہے، اور آخر مقام فنا ہونے کی حکیمانہ توجیہ یہ فرماتے تھے کہ اس سے مراد باطنی امراض کا فنا ہونا ہے کہ وہ علاج کے بعد آخر ہی میں فنا ہوتے ہیں، بہر حال حضرت کے ہاں اس راہ میں مجنون ہونا شرط اول قدم تھا۔

سید صاحب ایک تو فطری طور پر خودرائی سے بہت دور تھے، دوسرے اس حقیقت کو خوب سمجھ لیا تھا کہ شیخ کا مقام نبی کے وارث وقائم مقام کا ہے، گو وہ نبی کی طرح معصوم نہیں ہوتا، ہم اگر علم وعمل، زہد وتقویٰ، فہم وفراست، خوف وخشیت میں اس کا درجہ طالب سے بلند اور بہت بلند ہے، تو لازماً طالب کے مقابلہ میں خطا ولغزش سے محفوظ بھی زیادہ اور بہت زیادہ ہوگا۔

جس کسی کو ہم نے اپنے سے اعلم اور اتقی واصلح جان لیا، تو پھر اس کی رائے کو اس وقت تک نہ ماننا جب تک خود ہماری رائے کے موافق نہ ہو خود اپنی ہی رائے پر اصرار کے سوا کیا ہے، اسی کا نام خودرائی ہے، ورنہ پھر مذموم ''خودرائی'' کا مصداق ہی کیا رہتا ہے، حضرت کے نزدیک تو اس خودرائی کا رائی بھر بھی باقی رہنا راہ کا پہاڑ تھا، پھر دین کے مسائل ومعاملات کا تعلق تو بواسطہ یا بلاواسطہ تمام تر عالم غیب کے غیبیات سے ہے، دنیا کے معاملات جن کا تعلق اسی عالم شہادت کے مشاہدات وتجربات سے ہے، ان میں بھی اگر زیادہ علم وبصیرت والے کے مقابلہ میں آدمی کو اپنی ہی رائے پر اڑا رہنے کا حق دے دیا جائے، تو عملاً زندگی کا سارا کارخانہ معطل اور نظم وضبط درہم برہم ہوکر رہ جائے۔

اس ذرا طویل جملہ معترضہ کا مدعا یہ ہے کہ سید صاحب رحمۃ اللہ میں قلب وباطن

کے تزکیہ وترقی کا بڑا قیمتی فطری جوہر ان کی یہی خوبی تھی کہ بڑوں کیا چھوٹوں کی بات کو بھی قبول کرنے کی آمادگی میں جتنا ان کے ظرف کو عالی پایا، اتنا کم کسی کے ظرف کو پایا، بڑی حد تک اسی استعدادی کمال نے ان کو کہنا چاہئے کہ مرید ہوتے ہی پیر بنادیا، اجازت وخلافت کے لئے ان کے پیر کا مسلک یہ تھا کہ خاص صورتوں میں بالفعل کمال کے بجائے متوقع کمال یا قوی استعداد ہی کو کافی تصور فرماتے تھے، اس راہ میں قدم رکھتے ہی حضرت مرحوم جو اس تیزی سے چل پڑے، اس کا بڑا راز یہی تھا کہ شیخ کے مقابلہ میں ان کو خودرائی یا انانیت کی ایک ٹھوکر بھی شاید ہی لگی ہو۔

اندازہ فرمایئے کہ کہاں تو سیرت میں خاکسار کے صرف ایک ضمنی باب کی صرف چند سطروں کے ردوبدل اور ترمیم وتصحیح میں جھجک تھی، اور کہاں مرشد تھانوی تک پہنچتے ہی ایسے بدلے کہ حضرت کے اشارہ ہی سے اپنی تصنیفات کے ہزاروں صفحات کی نظر ثانی پر تل گئے، اور رمضان مبارک ۶۳ھ کے والا نامہ فرماتے ہیں:

''ادھر جب سے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا ایما ہوا تھا، جس سے متعلق اشعار معارف میں چھاپ دیئے ہیں، یہ خیال غالب رہا ہے کہ اپنی تصنیفات پر نظر ثانی کرکے رکھ جاؤں، پھر جب چھپیں، چنانچہ سیرت جلد اول پر نظر ثانی آدھی سے زیادہ ہوگئی ہے، اور وہ چھپ بھی رہی ہے''۔

اس سے (۳) بڑھ کر یہ کہ سیرت کا وہی احقر کا حصہ جس کی چند سطروں کے تغیر وتبدل میں تامل تھا، اب اس گرامی نامہ میں اس کی نظر ثانی کی کتنی تاکید پر تاکید ہے اور کیوں نہ ہو کہ اب تقویٰ کی نظر مصنف اور امت دونوں کی آخرت پر ہے۔

''اسی سلسلہ میں سیرت کی تیسری جلد معجزات والی بھی آتی ہے، اس میں جو حصہ آپ کا ہے اس کو آپ کے پاس بھیجتا ہوں، زبانی بھی کہہ چکا ہوں.....آپ مہربانی فرماکر اس پر نظر ثانی فرماکر بھیج دیں، لیت ولعل یا حوالۂ غفلت نہ کریں''۔

آگے یاد رکھنے کی بات اس غفلت سے بچانے کی وجہ ہے کہ ''اس میں آپ کا

فائدہ ہے، اور امت کا بھی''، وہی آخرت پر نظر کہ مصنف خدانخواستہ اپنے اور امت کے ضلال واضلال کا باعث نہ بنا رہے۔

یہ امت کے ''سید المصنفین'' کی خاص تصنیفی وعلمی کایا پلٹ کی ایک جھلک تھی، کچھ عام قلبی انقلاب کا بھی نظارہ ہو جائے۔

باطنی انقلاب نمائشی نہیں ہوا کرتا، اس کا اثر سب سے زیادہ ذاتی وخانگی زندگی پر پڑا کرتا ہے،.....اچھے اچھے خاندانی علماء ومشائخ کو دیکھا کہ اپنی اولاد کے معاملات میں دنیا کے سامنے دین کو بے تکلف نظر انداز کر جاتے ہیں، لڑکی، لڑکوں کا رشتہ تلاش کرنے میں بھی نظر دین سے زیادہ کیا، کہنا چاہئے کہ تمام تر، دنیا ہی پر رہتی ہے لیکن حضرت مرحوم کا دل بدلنے کے ساتھ نظر بھی ایسی بدلی کہ اپنی صاحبزادی سلمہا کی نسبت کی خبر دیتے ہوئے سب سے پہلی خوشخبری یہ سناتے ہیں کہ آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ میں اپنی منجھلی لڑکی کی نسبت ایک ایسے نوجوان صالح سے کر رہا ہوں جو حضرت مولانا تھانوی کے متوسلین میں ہیں، پھر اس سلسلہ میں نکاح ورخصتی وغیرہ سے فراغت اور وطن (دیسنہ) سے اعظم گڑھ واپسی کے ارادہ پر ارقام ہے۔

''تھانہ بھون کا بھی قصد ہے، حضرت میرے ہر معاملہ حتی کہ ذاتی معاملہ سے بھی خبر دار ہیں، یہ میرا جوش محبت ہے کہ والد شفیق کی طرح ان کو ہر معاملہ لکھے بغیر چین نہیں ملتا''۔

حرف حرف راقم نالائق کی ترجمانی فرما دی، اس کا بھی حضرت کی زندگی بھر یہی حال رہا کہ ذاتی وخانگی معاملات کی چھوٹی سے چھوٹی.... باتوں کی بھی اطلاع دیئے بغیر رہا نہیں جاتا تھا، حد یہ کہ ایک مرتبہ مہترانی نے اسٹرائک کر دی تو وہ بھی لکھ بھیجا، پھر جس معاملہ میں جو ایما وارشاد ہوتا تھا، اس کے خلاف الحمدللہ کہ قدم اٹھانے کا جی ہی نہ چاہتا، پورے انشراح کے ساتھ اتباع کی توفیق ملتی، اس کا راز بھی سیرۃ النبی ﷺ کے راز شناس سے معلوم کریں۔

''میرا مذاق یہ ہے کہ شیخ وقت قائم مقام نبی ہے، ان امور میں جو مختص بالنبوۃ نہیں''۔

سیرت نبویؐ کے مسلم محقق وماہر اور ادا شناس سے بڑھ کر وقت کے قائم مقام نبی کو پہچاننے کا دعویٰ کون کر سکتا ہے، یاد رہے کہ مرحوم صرف اپنا شیخ نہیں، شیخ وقت فرما رہے ہیں، پھر عام وخانگی امور تک میں جو اتباعی وابستگی ہے، اس کی وجہ بیان فرماتے ہیں کہ:

''جس طرح نبی کی یہ شان ہے کہ لا یؤمن أحدکم حتی أکون أحب إليه من والده وولده ونفسه (۴)، (أو کما قال) اس کا عکس شیخ (کے ساتھ معاملہ) میں بھی ہونا چاہئے، آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ والی روایت خوب لکھی، آپ نے کہاں دیکھی''۔(۵)

اس گرامی نامہ کی پشت پر اپنے اس حال کا کچھ تازہ قال دو غزلیں بھی نقل فرمائی ہیں، ایک کا عنوان ''فراق شیخ'' ہے، اور دوسری کا ''انتظار جواب'' اہل ذوق شریک کیف ہوں،

دل میں کیا کیا آرزوئے دید ہے — مومنوں کو انتظار عید ہے
میکدہ، مسجد میں یاد آیا کیا — روز افزوں نشۂ توحید ہے

حضرت جامع المجددین علیہ الرحمہ کی تجدیدی جامعیت تو ایک دن دوپہر کا واقعہ ہے، آج بھی جو چاہے حضرت کے کارناموں کو کتابی صورت میں مطالعہ کر کے خود معلوم کر لے سکتا ہے، پھر بھی بعض قلوب پر ''جامع المجددین'' کا عنوان گراں تھا، وہ حضرت سید صاحب جیسے دین کے دیدہ ور کی زبان سے اسی غزل میں خاتم المجددین ہونے کی شہادت سن لیں۔

اس سے پایا روئے ملت نے فروغ — ختم اس پر دورۂ تجدید ہے

انتظار جواب کا پورا لطف ان کو آئے گا جن کو خاتم المجددین کی خدمت میں مکاتبت کی کچھ سعادت حاصل رہی ہے۔

دن گنے جاتے ہیں قاصد کے لئے — انتظارِ نامۂ محبوب ہے

شعر کی شعریت تو شعر وشاعری والے جانیں، لیکن واقعہ کی واقعیت کا اگلا شعر

لفظ لفظ حکایت ہے، مشکل ہی سے کوئی علمی وعملی اشکال یا ظاہری وباطنی مرض کا سوال ہوتا ہوگا، جس کا جواب تیر بہدف یا نسخۂ اکسیر ثابت نہ ہوتا ہو۔

نسخۂ اکسیر ودا روئے شفا — تیرے ہاتھوں کا لکھا مکتوب ہے

بقول مولانا دریابادی سلّمہٗ کے بس جی چاہتا تھا کہ لکھنے والے کی انگلیاں چوم لے، ایک اور شعر ''اشرف المجالس'' کے بادہ خواروں کے لئے:

مہر ہو یا قہر ہو جو کچھ بھی ہو — ہر ادا محبوب کی محبوب ہے

سب سے آخر کے شعر میں ''کوئی سالک ہے'' کے نیچے اس بدنام کا نام سوالیہ نشان کے ساتھ تحریر ہے،

اندرون حلقۂ پیر مغان — کوئی سالک ہے کوئی مجذوب ہے

(کیا عبدالباری؟)

۲۸/مارچ کو اس میخانہ (تھانہ بھون) میں ایک عشرہ کی سرمستیوں کے بعد واپسی کی اطلاع ایک کارڈ پر صرف اس شعر سے فرمائی،

نہ من تنہا دریں میخانہ مستم — جنید وشبلی وعطار شد مست

راقم احقر کو ''علامہ ندوی'' نہیں بلکہ ''جنید وشبلی'' کے یار میخانہ کی ''مستی'' کے کچھ یادگار سبق سنا دینا زیادہ مدنظر تھا، یہ نشہ ان کی علمی وتصنیفی زندگی سے لے کر خانگی وذاتی معاملات تک پر بھی جس درجہ چھا گیا تھا، اس کا ہر سبق مستقل درس ہے، اور سب سے بڑھ کر بڑا اور اس علم وقلم والوں کے لئے۔

علامہ ندوی نہ صرف عام علوم دین کے علامہ بلکہ فن سیرت کے خاص طور پر وقت کے سب سے بڑے علامہ تھے، جن کی ''سیرۃ النبیؐ'' کا کوئی جواب تو کیا ہوتا، اس کے بعد سے سید الاوّلین والآخرین علیہ التحیۃ والتسلیم کا کوئی چھوٹا بڑا سیرت نگار اس سے مستغنی نہیں رہ سکا، اور نہ آئندہ رہ سکتا ہے، پھر سوچنے کی بات ہے کہ جنید وشبلیؒ والے میخانہ میں پہونچ کر کوئی تو بات ان کو ایسی ملی کہ اپنے سارے تصنیفی دفتر کے ساتھ اس سیرت تک کو

نظر ثانی سے مستثنیٰ نہ پا سکے۔

باقی نج کی زندگی میں تو اس مستی کا رنگ یہاں تک دیکھا کہ ایک رفیق کی سالہا سال رفاقت میں لباس اور رہن سہن میں کچھ تکلف وتنعم آ گیا تھا، وہ بھی اب اتنا ختم ہو گیا تھا کہ لاہور میں ایک بڑی محبت والے عزیز شاگرد دوست نے میری دعوت کی، سید صاحب بھی لاہور میں موجود تھے، میری ہی وساطت سے ان سے درخواست کی، پہلے کی ان سے کوئی تکلفی کیا شاید شناسائی تک نہ تھی، مگر جب وہ لینے آئے تو جس طرح محض کرتے ٹوپی میں بیٹھے تھے، اسی طرح بے تکلف ساتھ ہولئے ورنہ عادۃً ایسے مواقع پر صافہ وشیروانی پہن لیا کرتے تھے، اور بھی کراچی ولاہور وغیرہ میں اس سے بھی زیادہ تکلف کے مواقع، جلسوں وغیرہ تک میں ان کی ذاتی زندگی نمود ونمائش، آرائش وزیبائش سے دور ونفور ہو چکی تھی، بلکہ بعض دوسرے علم ودین کا نام لینے والوں میں جاہی ونمائشی عادات وتکلفات دیکھ کر بہت متاسف ہوتے تھے کہ بناؤ سنگار علم کی شان ہے نہ دین کی، پاکستان میں بہت سے شروع شروع میں پہنچ جانے والوں کو جہاں ملازمت اور معاشی کاروبار وغیرہ کے اموال غنیمت ہاتھ آئے، وہاں بعض مولاناؤں کو لیڈری کی دولت ہاتھ لگی، ایسے ہی ایک مولانا لیڈر کا برسبیل تذکرہ کسی سفر میں رفاقت کا خود اپنا یہ تجربہ نہایت تاسف کے ساتھ بیان فرمایا کہ ریل میں پہلے صبح صبح بعد غسل روزانہ نیا لباس تبدیل کر لیتے، تب اسٹیشن پر منتظر استقبال ومشتاق دید مجمع میں نمودار ہوتے، علم ودین کا نام لگا کر واقعتًا یہ خفیف الحرکاتی بڑی شرمناک معلوم ہوتی ہے، علماء کو تو طالب علمانہ وضع ہی زیب دیتی ہے۔

بات وہی ہے کہ نفس کا تزکیہ، وَيُزَكِّيهِمْ، کتابی تعلیم وتعلم پر بھی مقدم ہے، اور یہ کسی ایسے اور ''مزکی'' ومربی ''وارث نبی'' کی صحبت وتربیت کے بغیر عملاً ناممکن ہے، جو خود ''مزکّی'' یا تربیت یافتہ نہ ہو، بلا ایسی صحبت وتربیت کے نفس ونفسیات کی بیماریوں کا علاج کیا ہوگا، ان کو بیماریاں سمجھنے والے ہی نام نہاد علماء ومشائخ تک میں کتنے ہوتے ہیں، تعجب کی بات در حقیقت نفس ونفسانیات کا وبائی عموم نہیں، بلکہ تزکیہ وتربیت سے غفلت کا عوام

میں نہیں خواص میں عموم ہے، خالص علمی و دینی ہی نہیں، دنیوی وسیاسی خدمت گذاروں کے لئے بھی دوسروں کی مذمت سے پہلے اور ساتھ ساتھ خود اپنی اصلاح اور تزکیۂ نفس کی فکر ناگزیر ہے، دن رات کا مشاہدہ ہے کہ دین ودنیا دونوں کے غیر صالح مصلحین کے ہاتھوں اصلاح سے کہیں زیادہ افساد کی خدمات انجام پارہی ہیں۔

دین کی بنیادی حقیقت یوم دین یا آخرت کا ایمان ویقین ہے، آخرت کو پیش نظر رکھے بغیر علم وعمل کے کسی انفرادی کمال یا اصلاحی خدمت کا دین کی میزان میں قطعاً کوئی وزن نہیں، وہاں پوچھ نہ تہذیب وتمدن کی ترقیوں کی ہوگی، نہ حکومت وسیاست کی ہنگامہ آرائیوں کی، نہ علوم وفنون کے کارناموں کی، نہ خطابت ومقرری کی زبان آوریوں کی، نہ انشاء وقلم کی زور آزمائیوں کی اور نہ تصنیف وتالیف کے انباروں کی، وہاں تو ہر ہر فرد کے ظاہر وباطن کے ہر ہر قول وعمل، ہر ہر فکر ونظر، ہر ہر ارادہ ونیت کے متعلق سب سے پہلے پوچھا، اور دیکھا یہ جائے گا کہ اس میں خدا کی رضا وآخرت کا کیا اور کتنا حصہ تھا، ومن اراد الآخرة وسعیٰ لها سعیها وهو مؤمن فأولئك كان سعيهم مشكورًا۔

علامہ سلیمان کو آخر آخر میں جس فکر ونظر نے حضرت سلیمان بنایا، وہ ''یہاں'' کی نہیں ''وہاں'' کی فکر تھی، حقیقت دین کی یہی یافت ان کی ساری علمی وعملی یادگاروں کو قابل یاد بناسکتی ہے، اس کو بھول بھلا کر اُن کی ہر یادگار ان کو یاد کرنا نہیں بھلانا ہوگا، اس یافت کو خود ان ہی کے اس یادگار انقلاب کے سیدھے سادے دو مصرعوں میں یاد رکھیں،

ہم ایسے رہے یا کہ ویسے رہے ''وہاں'' دیکھنا ہے کہ کیسے رہے

''وہاں'' کے ساتھ ''یہاں'' کے لئے بھی جو بات سب سے زیادہ یاد رکھنے کی ہے، آگے ہی وہ بھی سن لیں کہ ''کن فی الدنیا کأنك غریب''،

حیات دو روزہ کا کیا عیش وغم سفر کا بھی کیا جیسے تیسے رہے

بس اللہ تعالیٰ ان کے اس حال وقال کو امت کے عوام وخواص کا بھی حال وقال بنادیں، اسی میں دین ودنیا دونوں کا بناؤ ہے، اور یہی ان کی علمی وعملی زندگی کے آخری

انقلاب کا سب سے گرانقدر سبق ہے۔

حال کے کسی صدق میں صاحب ''صدق'' نے ایک بڑی سچی بات کہہ کر ڈالی، تلخ ہو یا شیریں لیکن جو یہ حقیقت ہے کہ ادھر دس بارہ سال سے سید صاحبؒ ''خالص ندوی'' نہ رہے تھے، مگر اس نالائق ''ندوی'' کی سمجھ میں تو ان ہی ۱۰،۱۲؍سال میں سید صاحب ''پورے ندوی'' بنے، ندوہ کے اصل بانیوں نے علوم دین کا ایک نیا دار العلوم اس لئے ہرگز نہیں کھڑا کیا تھا کہ اس کے علماء کی تقریر وتحریر، خطابت، صحافت میں زور وکمال پیدا ہوکر ایمان وعمل صالح کی ظاہری وباطنی زندگی میں ضعف واضمحلال پیدا ہوجائے، اور دین کا سارا زور سمٹ سمٹا کر زبان وقلم میں رہ جائے بلکہ ان کا مقصد علم کے ساتھ اعمال کی تحسین بھی تھا۔

مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری ۱۰،۱۲ سال میں ''ندویت'' کی اس خلا وخامی کی تلافی وتدارک فرمایا، ندوی برادری بھی اگر اپنے سب سے بڑے فخر ندویت بھائی کے اس یادگار انقلاب باطن سے سبق لے تو اس کے علم وقلم کی داد مخلوق سے ملے یا نہ ملے، لیکن خالق سے ان شاء اللہ بھرپور مل کر رہے گی، دین نام ہی اس باطنی انقلاب کا ہے کہ ہر چھوٹے بڑے علمی وعملی انفرادی واجتماعی کام میں نظر مخلوق ودنیا سے ہٹ کر خالق وآخرت پر ہوجائے، ندوہ کے ''سید الطائفہ'' نے یہ نظر پیدا کرکے ''ندویت'' ہی کی تکمیل نہیں فرمائی، بلکہ دین کا نام لے کر سارے قلم چلانے والوں کو سب سے بڑا سبق دے کر گئے ہیں، اسلام اپنی تعلیمات کی خالی زبان وقلم سے داد لینے نہیں آیا، زبان سے بڑھ کر دلوں کو بدلنے یا قالب سے زیادہ قلب کے انقلاب کی دعوت لے کر آیا ہے، الٰہ آباد کے عارف اکبر نے زبان وقلم کی اس بیدار پر اپنے رنگ میں کس لطف وخوبی کے ساتھ متنبہ فرمایا ہے۔

داد قرآن کی نہ دو بھائی عمل اس پر کرو
پیش درگاہ خدا واہ کی حاجت نہیں

زبان وقلم سے تو اپنی فاسد تعلیمات کی داد دینے میں اہل باطل بھی خصوصاً آج

کل کے ہم سے پیچھے نہیں آگے اور اتنے آگے ہیں کہ اس محاذ پر اُن سے بازی لے جانا ناممکن ہی ہے، اسلام کا اصل محاذ عمل صالح کی زبان ہے، جس کے سامنے قلم کی زبان کا کوئی طلسم نہیں ٹھہر سکتا، اور عمل صالح ''صالح'' جب ہی ہوتا ہے جب کہ اس کا سرچشمہ قلب باطن کی طہارت ہو، اگر قلب صالح درست نہیں تو پھر صالح کی ہر سعی وسرگرمی فساد ہی فساد ثابت ہوتی ہے،"إذا فسد فسد الجد كلّه" دلوں کے اس فساد کا آج سے بڑھ کر ہمہ گیر فسادات کی صورت میں دنیا کی تاریخ نے شاید ہی پہلے کبھی ثبوت فراہم کیا ہو۔

اقلیم دل بزور مسخر نمی شود
ایں فتح بے شکست میر نمی شود

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ کا حکم تھا کہ مرحوم کی سیرت کے سلسلہ میں ان کی طالب علمی کے رنگ وروش کی تفصیل خصوصیت کے ساتھ کروں، اپنی نالائقی اس معاملہ میں اوپر ابتدا ہی میں عرض کر چکا ہوں، اتفاق سے اسی زمانہ میں مولوی جوّاد علی خاں صاحب عالی راقم الحروف کے قریب ہی ٹھہرے ہوئے تھے، وہ سید صاحب کے نہ صرف ہم مدرسہ بلکہ بے تکلف ہم درس اور ہم سبق رہے ہیں، قلم میں بھی کچھ قدم ساتھ چلے، پھر:

او بصحراء وقت وما در کو چہا رسوا شدیم

بہرحال مولانا دریابادیؒ کی فرمائش میں نے اپنے پورے اصرار کے ساتھ خانِ عالی کی طرف منتقل کردی کہ وہ پورا حق ادا کرسکیں گے، مگر جواب ان کا بھی اس مضمون کے ختم ہونے پر اس عذر ہی کا آیا کہ مرحوم ومغفور کے متعلق حافظہ کی معذوری سے سوچ بچار کے باوجود کوئی مواد حاصل نہ کرسکا، بجز ان معمولی باتوں کے کہ:

''اگر کوئی ہم سبق کبھی سختی سے گفتگو کرتا تو اس کا جواب نرم الفاظ میں دیتے اور خاموش ہو جاتے، کبھی سخت کلام یا لب ولہجہ سخت نہ ہوتا، درسی کتابوں کی تکرار میں لب ولہجہ زوردار البتہ ہوتا اور بیان کی قوت وروانی سے شرکاء کے دل پر تکلم کا رعب بیٹھ جاتا''۔

''متانت ہر انداز پر غالب رہتی، کبھی ٹھٹا مار کر ہنستے نہ تھے، بے تکلفی میں ظرافت سے باز نہ آتے، اس میں بھی متانت قائم رہتی، کوئی ناگواری ہوتی تو اس کی غمازی چشم وابرو ضرور کرتے، مگر زبان پر قابو رہتا''۔

آپ نے دیکھا کہ نوجوانی اور طالب علمی کے اس چند سطری آئینہ میں خدوخال کی وہی جھلک موجود ہے، جو آگے چل کر پوری سیرت کے قد آدم آئینہ میں اُبھر کر گھر باہر، اپنے پرائے سب کے سامنے جلوت وخلوت میں آتی رہی "اللّٰهم صلّ على سيدنا محمد ومن اله على سيدنا سليمان بارك وسلّم".

حواشی

(۱) حضرت مفتی صاحب حضرت تھانوی کے اجل خلفاء میں ہیں، مطعنا اللہ بطول بقاۂ۔

(۲) مثلاً سید ظہور احمد وحشی شاہجہاں پوری

(۳) اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ مرشد کے ارشاد سے برملا بہت سے معتقدات سے رجوع کیا، اور اس شان سپردگی سے کیا کہ سنا جاتا ہے حضرت تھانوی سید صاحب کے اس والہانہ انداز عقیدت پر وجد کیا کرتے تھے۔

یہ شہادت صاحب ''برہان'' مولانا عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی سلمہٗ نے تازہ برہان (رجب ۷۳ھ) میں ادا فرمائی، راقم ہذا کے علم میں نہ تھی، آگے مولانا سلمہٗ خود اپنی نسبت لکھتے ہیں کہ حضرت سید صاحب کی جگہ میں ہوتا تو شاید اتنے بڑے ایثار کے لئے تیار نہ ہوتا، وہ کیا کسی کے لئے بھی اپنے زعم علم سے ایسی دست برداری آسان نہیں، اسی سے تو مرشد تھانوی کے ہاں اس کی اتنی قدر وقیمت تھی۔

(۴) کوئی شخص تم سے ایمان (کا حق ادا کرنے والا) نہ ہوگا، جب تک وہ مجھ کو اپنے والد، اولاد اور خود اپنی ذات سے زیادہ دوست ومحبوب نہ رکھے۔

(۵) یاد نہیں آرہا، کیا روایت تھی، شاید اس کا تعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ومحبت ہی سے رہا ہوگا۔

آہ سید صاحب!

علم واخلاق کی دنیا اجڑ گئی

مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ

رفتی واز رفتن تو عالمے تاریک شد
تو مگر شمعی چو رفتی بزم برہم ساختی

آہ گذشتہ مہینہ ۲۲؍نومبر [۱۹۵۳ء] کی رات کو کراچی ریڈیو اسٹیشن سے یہ جانکاہ خبر بجلی بن کر گری کہ حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۲؍اور ۲۳؍کی درمیانی شب کو ساڑھے سات بجے اس جہان فانی کو الوداع کہا۔ یہ خبر وابستگان دامن سلیمانی کے لئے ایسی ناگہانی اور ہوش ربا تھی کہ کچھ دیر تک سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ہوگیا، مگر مشیت الٰہی پوری ہوکر رہی اور بالآخر یقین کرنا پڑا کہ اس مسیحا نفس نے بھی جان جاں آفریں کے سپرد کردی جو عمر بھر اپنی زبان وقلم سے مردہ دلوں میں روح حیات پھونکتا رہا اور امراض ملت کا وہ ماہر طبیب اٹھ گیا، جس نے اس کے ناتواں جسم میں نئی طاقت وتوانائی پیدا کی۔ وہ چشمۂ فیض خشک ہوگیا جس کی آبیاری سے دین وملت کا چمن سیراب تھا۔ وہ شیخ کامل اُٹھ گیا جس نے دلوں کی دنیا منور کی۔ وہ شمع خاموش ہوگئی جو نصف صدی تک علم وفن کی ہر مجلس میں ضیابار رہی۔ وہ تاجدار رخصت ہوگیا جس کا سکہ علم وفن کی پوری اقلیم میں رواں تھا۔ اسلامی علوم کا وہ امام ومجدد اٹھ گیا، جس نے ان کو نئی زندگی بخشی۔ مذہب اسلام کا

وہ متکلم اور اسلامی تاریخ وتمدن کا وہ محقق اٹھ گیا جس نے ان کو ان کی اصل شکل اور نئے لباس میں جلوہ گر کیا۔ پیغام محمدی کا وہ شارح وترجمان خاموش ہوگیا جس نے اپنی دینی بصیرت سے اس کے اسرار وحکم بے نقاب کئے اور اس کی ذات جامع الصفات پر علوم کی جامعیت کا خاتمہ ہوگیا۔

لیس من اللّٰہ بمستنکر — أن یجمع العالم في واحد

وہ مذہب وسیاست، علم وفن، وسیاست، علم وفن، تالیف، وتصنیف، تعلیم وتدریس، تقریر وتحریر، انشاء وخطابت، وعظ وپند، ارشاد وہدایت، ہر مجلس کا صدر نشیں اور اپنے علمی کمالات میں ائمہ سلف کی یادگار تھا۔ تفسیر وحدیث، فقہ وکلام، مغازی وسیرت، طبقات وتراجم، تاریخ وجغرافیہ، شعر وادب جملہ فنون پر اس کی نظر مجتہدانہ اور اس کے زبان قلم کی روانی وحکمرانی یکساں تھی اور ان میں وسعت ودقت نظر، فہم وبصیرت، تلاش وتحقیق اور مہارت فن کی ایسی یادگاریں چھوڑیں جو مدتوں علمی دنیا کی رہنمائی کرتی رہیں گی۔ اس کے علمی کمالات کا لوہا دنیائے اسلام کے نامور علماء اور یورپ کے مستشرقین تک مانتے تھے۔

وہ جدت وقدامت کا سنگم، اسلامی علوم کے ساتھ جدید افکار وتصورات، نئے رجحانات اور عہد حاضر کی تحریکات سے پوری طرح واقف اور تلاش وتحقیق اور نقد ونظر کے جدید طریقوں کا بھی ماہر تھا۔ اس دور کا وہ پہلا متکلم ہے جس نے اسلامی علوم اور مذہبی عقائد وخیالات پر فکر وتدبر اور ان کی تعبیر وترجمانی کا ایسا حکیمانہ طریقہ اختیار کیا کہ دین ومذہب، نقل وروایت اور سلفیت وقدامت کی روح کو پوری طرح برقرار رکھتے ہوئے ان سے عقل ودرایت اور جدت وروشن خیالی کی نقیض مٹادی اور ان کو ان کا معاون ومددگار بنادیا اور مذہب اسلام، اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب وثقافت کے معترضین اور نکتہ چینوں کی جہالت کا پردہ چاک کرکے ان کو ایسے حکیمانہ اور دلنشیں انداز میں پیش کیا کہ مخالفین ومنکرین بھی ان کی عظمت ماننے پر مجبور ہوگئے اور علمائے امت نے بھی اس کو تحسین

کی نظر سے دیکھا اور اس طرز فکر اور طریقۂ تعبیر کی ایسی شاہ راہ قائم کردی کہ آج اس راہ کے سارے راہ رو اسی راستہ پر گامزن ہیں۔

اس کی ذات میں روشن ضمیری و روشن دماغی، ذوق کے تنوع، علوم کی جامعیت، عقائد میں رسوخ و پختگی، اعمال میں استقامت، ثقاہت، قلب و نظر کی وسعت، مسلک میں اعتدال و توازن، لوچ اور نرمی، حسن مذاق اور لطافت مزاج کا ایسا عجیب وغریب اجتماع تھا کہ طبقۂ علماء میں اس کی نظیر مشکل سے ملے گی اور اس مسلک اعتدال کا وہ مبلغ بھی تھا۔ اس لئے مختلف مشرب و مسلک کے مسلمانوں میں وہ مقبول رہا۔

اس کا مزاج و مذاق ابتدا سے دینی تھا۔ کسی دور میں بھی اس کا قدم جادۂ مستقیم سے نہ ہٹا اور عمر کے ساتھ ساتھ یہ رنگ برابر بہرا ہوتا گیا اور آخر میں تو ''سیرت النبی'' کی برکت اور سلوک و تصوف کے فیض سے ہو بہو سلف صالحین کی تصویر اور سراپا کیف واثر بن گیا تھا۔ اس کی صحبت میں بیٹھ کر، اس کی باتیں سن کر اور اس کی صورت دیکھ کر ایمان میں تازگی پیدا ہوتی تھی۔ اس کے اعمال واخلاق خلق عظیم کی عملی تفسیر تھے۔ وہ فطرتاً پاک دل، پاک طینت، سراپا شرافت وانسانیت، سراپا خلق ومروت، سراپا مہر ومحبت اور سراپا جمال تھا۔ عزیزوں کا معاون ومددگار، دوستوں کا ہمدرد وغمگسار اور غریبوں اور بے کسوں کا ہمدم وغمخوار تھا۔ ضبط وتحمل کا پہاڑ، ایثار وقربانی کا پیکر اور عفو ودرگذر کی تصویر تھا۔ اس کو خدا نے حقیقی بڑائی بخشی تھی۔ اس لئے مصنوعی اور خود ساختہ بڑائی کے پیچھے کبھی نہیں پڑا اور دنیاوی جاہ واقتدار کی ہوس سے ہمیشہ دور اور کبر ونخوت سے نفور رہا۔

اس کی پوری زندگی ایثار وقربانی اور حلم وعفو کا نمونہ تھی اور یہ وصف حد اعتدال سے بڑھ گیا تھا۔ اس کا سینہ بے کینہ اور اس کا دل ایسا شفاف ومجلّٰی آئینہ تھا جس میں دشمن کے لئے بھی گرد کدورت کی گنجائش نہ تھی۔ اس نے قدرت واختیار کے باوجود کبھی دشمنوں سے بھی انتقام نہیں لیا اور بد اندیشوں کے ساتھ بھی ہمیشہ بھلائی کی اور اس کے لئے ہر نقصان گوارا کیا اور بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کیا۔ اس لئے وہ محبوب القلوب تھا اور

اس کی عزت ومحبت دلوں میں جاگزیں تھی، جو عنداللہ اس کے مقبول ہونے کی سب سے بڑی سند ہے۔ قلم اس کے کمال وجمال کی مصوری سے عاجز ودرماندہ ہے۔ اس کی جو تصویر کھینچی جائے گی وہ ناقص وناتمام ہی ہوگی۔

ہر چند مدحت می کنم لیکن ازاں بالاتری

ملک وقوم، دین وملت اور علم وفن کا کوئی رخ اور کوئی پہلو بھی اس کے خدمات سے خالی نہیں ہے۔ اس راہ میں اس کے کارنامے بڑے عظیم الشان اور گوناگوں ہیں۔ اس لئے اس کی موت درحقیقت ایک حادثہ نہیں مجموعۂ حوادث ہے، اور اس کا ماتم ایک شخص، ایک وصف، ایک کمال، ایک قوم اور ایک ملک کا ماتم نہیں، بلکہ دین ومذہب کا ماتم ہے، ملک وملت کا ماتم ہے، فضل وکمال کا ماتم ہے، علم وفن کا ماتم ہے، خلق وشرافت کا ماتم ہے اور پوری ملت اسلامیہ اس کے غم میں سوگوار ہے کہ آج غزالی ورازی، ابن تیمیہ وابن قیم، رومی وسنائی، شاہ عبدالحق اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی یادگار دنیا سے اٹھ گئی اور شبلیؒ کی مسند ویران ہوگئی۔ ایسی ہستیاں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔

سرود رفتہ باز آید کہ ناید　　نسیمے از حجاز آید کہ ناید
برفت از بزم عرفاں آں حکیمے　　دگر دانائے راز آید کہ ناید

اس نے علم وادب کی ہر شاخ اور ہر موضوع پر ہزاروں صفحات لکھے، مگر اس کی عمر عزیز کا بڑا دور اور بہترین حصہ آستان نبوی کی خدمت گذاری میں بسر ہوا۔ اس کا سب سے بڑا علمی ودینی کارنامہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک ہے جو سوانح نبوی کے ساتھ پیغام محمدی کا بھی خلاصہ عطر ہے۔ دارالمصنفین میں اس کی تصنیفی زندگی کا آغاز اسی مبارک کام سے ہوا تھا اور ابھی جلد ہفتم زیر تالیف تھی کہ اسی پر اس کا خاتمہ ہوگیا اور رحمۃ للعالمین کا مداح وسیرت نگار یہ سوغات لے کر خود اس کے حضور میں حاضر ہوگیا۔

خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

بار الہا! تیرے دین متین کا خادم، تیرے پیغام کا شارح ومبلغ، تیرے محبوب نبی کا

جگر گوشہ وسیرت نگار تیرے حضور میں حاضر ہے۔اس کے طفیل میں اس کو اپنے دامن رحمت سے ڈھانک لے۔اس کو شہداء وصدیقین کا درجہ عطا اور اس کی تربت کو اپنے انوار رحمت سے معمور ومنور اور جنت الفردوس کے پھولوں سے معطر فرما۔اللّٰھم صیب علیہ شأبیب رحمتك ورضوانك یا أرحم الراحمین.آمین۔

اے خدا کے مقبول بندے!الوداع،اے استاد شفیق!الفراق.

علامہ سید سلیمان ندویؒ اور تبلیغی جماعت

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ

حضرت مولانا الحاج سید سلیمان ندویؒ خلیفہ حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ کی شرکت لکھنؤ کے قیام میں پھر بھوپال کے قیام میں پھر پاکستان کے قیام میں ان تبلیغی اجتماعات میں بہت کثرت سے ہوئی ہے، حجاز کے تبلیغی اجتماعات میں بھی حضرت سید صاحبؒ کی شرکت ہوئی ہے اور تقریریں بھی فرمائی ہیں، مولانا الحاج ابوالحسن علی میاں صاحب نے جو حضرت دہلوی کی سوانح لکھی ہے اس پر حضرت سید صاحب کا مبسوط مقدمہ ہے جس کے متعلق سید صاحب کی سوانح ''تذکرہ سلیمان'' میں لکھا ہے کہ یہ بلند پایہ مقدمہ بھی اپنی جامعیت، علمیت اور افادیت کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہے۔بیس صفحات میں اتنے اہم مضامین کی وسعتوں کو سمیٹ لینا یہ حضرت ہی کا حصہ تھا، صرف عنوانات کے شمار ہی سے اس کی گونا گونی کا اندازہ لگایئے جو یہ ہیں۔امت مسلمہ کا فریضہ، دولت وسلطنت مقصود اول نہیں، امت مسلمہ جانشین ہے، تعلیم وتزکیہ میں تفریق، تعلیم وتزکیہ کی یکجائی، فلاح دونوں کی یکجائی میں ہے۔مزاج نبوت قوام ملت ہے، صاحب سوانح اس معیار سے، سلسلۂ ولی اللہی، صاحب سوانح کا سلسلۂ نسب، اس عہد میں تبلیغی ناکامی کے وجوہ، انبیاء کے اصول دعوت، (تذکرہ سلیمان)، یہ تو اجمالی عنوانات ہیں۔ان میں سے عنوان نمبر ۸ ''صاحب سوانح اس معیار سے'' کے ذیل میں مقدمہ میں لکھا ہے کہ ''آئندہ اوراق میں جس داعی حق اور دعوت حق کی تصویر کھینچی گئی ہے میری آنکھوں نے اس کے چہرے کے

خدوخال کا مشاہدہ کیا تھا، اس کے ظاہر وغائب کے حالات دیکھتا اور سنتا رہا، اور جن کو یہ سعادت حاصل نہیں ہوئی ان کو ان اوراق کے پڑھنے سے اس کی پوری کیفیت معلوم ہوجائے گی۔ اور اسی ضمن میں اس کے اصول وطریق دعوت اور خود حقیقت دعوت کے سارے حالات واضح ہوجائیں گے“۔

اسی مقدمہ کے عنوان نمبر۱۵ انبیاء کے اصول دعوت کے ذیل میں تحریر فرمایا: ”تبلیغ ودعوت کے ان اصولوں میں سے جو آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں نمایاں معلوم ہوتے ہیں۔ ایک عرض ہے یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس کا انتظار نہیں فرماتے تھے کہ لوگ آپ کی خدمت میں خود حاضر ہوں بلکہ آپ اور آپ کے داعی لوگوں تک خود پہنچتے تھے اور حق کی دعوت دیتے تھے یہاں تک کہ کبھی کبھی لوگوں کے گھروں تک خود پہونچ جاتے تھے۔ اور کلمۂ حق کی دعوت پیش فرماتے تھے۔ مکہ معظّمہ سے سفر کر کے طائف تشریف لے گئے اور وہاں عبد یالیل وغیرہ رئیسوں کے گھروں پر جا کر تبلیغ کا فرض ادا فرمایا حج کے موسم میں ایک ایک قبیلہ کے پاس تشریف لے جاتے اور ان کو حق کا پیغام پہنچاتے۔ اور ان کی ترشی وتند جوابوں کی پرواہ نہ فرماتے تھے۔ آخر اسی تلاش میں یثرب کے وہ سعادتمند ملے جن کے ہاتھوں سے اسلام وایمان کی دولت مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ کو منتقل ہوئی، صلح حدیبیہ کے بعد جب ملک میں امن وامان واطمینان ہوا تو اسلام کے سفیر مصر وایران اسلام کا پیغام لے کر پہونچے۔ اور مختلف صحابہ نے عرب کے مختلف صوبوں اور قبیلوں میں جا کر اسلام کی تبلیغ کی، حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ منورہ گئے، حضرت علی اور معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے یمن کا رخ کیا، یہی حال ہر دور کے علماء حق اور ائمۂ دین کا رہا۔ اس سے معلوم ہوا کہ داعی اور مبلغ کا خود فرض ہے کہ وہ لوگوں تک پہنچے اور حق کا پیغام پہونچائے، بعض صاحبوں کو خانقاہ نشینوں کے موجودہ طرز سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ان خاصان حق کا ہمیشہ سے یہی طریقہ رہا ہے حالانکہ یہ سراسر غلط ہے، ان بزرگوں کی سیرتوں اور تذکروں کو کھول کر پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ کہاں کے رہنے والے تھے فیض

کہاں پایا اور جو پایا اس کو کہاں کہاں بانٹا اور کہاں جا کر زیرزمین آرام کیا اور یہ اس وقت کیا جب دنیا ریلوں، لاریوں، موٹروں اور سفروں کے دوسرے سامان راحت سے محروم تھی۔ معین الدین چشتی علیہ الرحمۃ سیستان میں پیدا ہوئے، چشت واقع افغانستان میں دولت پائی اور راجپوتانہ کے کفرستان میں آکر حق کی روشنی پھیلائی، فریدالدین گنج شکر علیہ الرحمۃ سندھ کے کناروں سے دہلی تک اور دہلی سے پنجاب تک آئے گئے۔ اور ان کے مریدوں میں حضرت نظام الدین سلطان الاولیاء علیہ الرحمہ اور پھر ان کے خلفاء کے احوال اور ان کے سفر کے مقامات اور ان کے مزارات کی جائے وقوع کو دیکھئے کہ وہ کہاں کہاں ہیں، کوئی دَکن میں ہے، کوئی مالوہ میں ہے، کوئی بنگال میں ہے، کوئی صوبجات متحدہ میں ہے“ (مقدمۂ سوانح) سید صاحبؒ اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

”از بھوپال یکم ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ

عزیزم مکرم حیاکم اللہ تعالیٰ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مکی زندگی سے مدنی زندگی بمشکل کامیاب ہوسکتی ہے، اور پچھلے فرسودہ نظام زندگی کی بنیاد پر تجدید کی دیواریں کھڑی نہیں ہوسکتی ہیں، خود مسلمان بننا دوسرے مسلمانوں کو مسلمان بننے کی دعوت دینا وقت کی اہم پکار ہے۔ اور اس فرض کو نفرت کے بجائے محبت کے جذبہ سے انجام دینا سب سے اہم ہے“۔

(تذکرہ سلیمان)

اسی سوانح میں دوسری جگہ لکھا ہے کہ ”حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی جماعت کا ایک بڑا مرکز بھوپال بھی تھا اور تبلیغی حضرات کئی وجوہ سے حضرت والا سے خاص تعلق رکھتے تھے اس لئے جب تک حضرت بھوپال میں مقیم رہے تبلیغی کاموں کی گویا سرپرستی فرماتے رہے اور غالبًا حضرت ہی کے ایماء سے مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی بڑی گرمجوشی سے تبلیغی وفود میں حصہ لیتے رہے اور اپنے مواعظ حسنہ کے ذریعہ ریاست کے چپہ چپہ تک اسلام خالص کی دعوت پہونچائی۔

صاحب سوانح ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''وصال سے صرف چار یوم قبل مغرب کے بعد جب حضرت والا حسب معمول نماز سے فارغ ہو کر چارپائی پر لیٹے تھے کہ سفیر شام مع چند رفقاء کے تشریف لائے....اس کے بعد سفیر صاحب نے جماعت تبلیغ کے متعلق حضرت والا کی شخصی رائے دریافت فرمائی، ارشاد ہوا کہ تبلیغی جماعت دین خالص کی داعی ہے''۔

(تذکرہ سلیمان)

مولانا الحاج علی میاں صاحب حضرت دہلویؒ کے لکھنؤ کے سفر کی تفاصیل لکھتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ سید سلیمان صاحبؒ ایک روز پہلے لکھنؤ تشریف لا چکے تھے اور مولانا کے ساتھ ہی مقیم تھے سید صاحب کو اس سے چند گھنٹے پہلے کے لئے تھانہ بھون کے اسٹیشن اور تھانہ بھون سے کاندھلہ تک ریل میں مولانا سے گفتگو کا اتفاق ہوا تھا، اور آپ نے اگلے روز پھاٹک حبش خاں کے جلسہ میں مولانا کی دعوت کی ترجمانی اور اپنے خیالات کا اظہار فرمایا تھا، اس موقع پر آٹھ نو دن شب و روز ساتھ رہا.....آخری روز جمعہ کے دن جو خاص مصروفیت کا تھا امیر الدولہ اسلامیہ کالج تشریف لے گئے جہاں ایک بڑا اجتماع آپ کے انتظار میں تھا وہاں پہلے مولانا سید سلیمان صاحبؒ نے ایک پر اثر تقریر کی، آپ کے بعد مولانا نے ارشاد فرمایا''۔ (سوانح حضرت دہلوی)

یہ ناکارہ بھی حضرت دہلویؒ کی معیت میں ندوۃ العلماء میں مقیم رہا۔ سید صاحبؒ بہت اہتمام سے حضرت دہلویؒ کی نجی تقاریر میں اور اجتماعات میں نہایت ہی سکون و وقار کے ساتھ شریک رہتے اور بہت غور سے تقاریر خاص طور سے نجی مجالس کی سنتے۔ ایک دفعہ میرے سامنے حضرت دہلویؒ سے فرمایا تھا کہ آپ کے ارشادات میں مجھے حضرت حکیم الامتؒ کے ارشادات کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

سوانح یوسفی میں لکھا ہے کہ ۴۹ء میں مولانا سید سلیمان ندویؒ حج کو تشریف لے گئے، مولانا سید سلیمان ندویؒ سے عرب کے علماء بہت پہلے سے واقف تھے ان کے حجاز پہنچنے سے تبلیغی جماعت کے افراد نے بڑا فائدہ اٹھایا اور کئی ایسے اجتماع کئے جن میں عرب

کے علماء بکثرت شریک ہوئے اور حجاز و یمن اور شام و عراق کے علاوہ سوڈان، مصر، مراکش، ٹیونس کے علماء بھی شریک ہوئے۔ اس سلسلے کا پہلا اجتماع حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان میں ہوا تھا، اور سید صاحب نے ایک ایسے اجتماع کو خطاب کیا جس میں مصر، سوڈان، مراکش، ٹیونس کے فاضل علماء اور خواص جمع تھے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے نہایت اچھے پیرائے اور علمی اسلوب میں بڑے سلجھے ہوئے انداز سے دعوت و تبلیغ پر روشنی ڈالی اجتماع کے اختتام پر سب ہی علماء اور خواص نے اپنے اپنے پتے دیئے، علماء نے کام کو خوب سراہا اور اس کام سے اپنے تعلق کا اظہار کیا۔ (سوانح)

مفتی زین العابدین صاحب مفتی اعظم لائلپور نے اس سفر حج کا قصہ اپنے گرامی نامہ میں تفصیل سے لکھا ہے وہ لکھتے ہیں کہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ جب ۱۹۴۹ء میں ہند سے حجاز تشریف لے گئے ہم مکہ معظمہ تین دن مسلسل حاضر ہوتے رہے، تیسرے دن حضرت نے پوچھا آپ کہاں کے ہیں تو بندہ نے عرض کیا کہ پنجاب کا ہوں، حضرت عثمان رحمۃ اللہ علیہ سے ڈابھیل میں دورہ پڑھا پھر امرتسر میں پڑھاتا رہا، اس کے بعد سات چلّے تبلیغ میں لگائے، پھر ایک سال نظام الدین گذارا، پھر ان حضرات نے یہاں ۱۹۴۷ء میں بھیج دیا، اب یہاں اس طرح حجاج میں اور بقیہ وقت یہاں کے عربوں میں کام کرتے رہتے ہیں۔ اس پر فرمایا کہ تیرا نام بمبئی میں معلوم ہوا تھا۔ اور یہ بھی کہ یہاں کے امیر جماعت تم ہو۔ میں نے عرض کیا مجھے ہی امیر بنا رکھا ہے تو فرمایا کہ میرا یہاں کا پورا وقت آپ کے حوالہ ہے، میں خود کوئی پروگرام نہیں بناؤں گا، چنانچہ اس پر اس شدت سے عمل فرمایا کہ ایک دن میں مدرسہ صولتیہ میں لیٹا ہوا تھا، ایک ساتھی نے آ کر اٹھایا کہ شیخ عمر بن حسن رئیس امر بالمعروف نجد شیخ عبداللہ بن حسن شیخ الاسلام حجاز کے بھائی تشریف لائے ہیں، میں حیران ہو کر اٹھا، ان سے باہر آ کر ملا، پھر اندر لے گیا تو انہوں نے ارشاد فرمایا، میں شیخ سید سلیمان الندوی کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کو اپنے یہاں کھانے کی دعوت دی تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ میں یہاں کا وقت تبلیغ میں دے چکا ہوں، میرے امیر سے

پوچھیں اگر وہ قبول کرلیں تو مجھے قبول ہے، چنانچہ میں اسی وقت شیخ عمر بن حسن کی کار میں ان کے ساتھ بیٹھ کر سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور حضرت سے استفسار کر کے ان کی دعوت قبول کی۔ اور ان کے چلے جانے کے بعد میں نے عرض کیا کہ حضرت ان بڑے لوگوں سے تو براہ کرم آپ خود طے فرمالیا کریں تو فرمایا بالکل نہیں جو طے کرنا ہوگا تجھے کرنا ہوگا۔ فقط۔

جناب الحاج عبدالوہاب صاحب روح رواں تبلیغ پاکستان اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں: ''سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ تو ہمارے ساتھ ہر اتوار کو تشریف لے جاتے تھے، اور بندہ کی باتوں کو سنتے تھے، اور بندہ کا نام ''بُلبل ہزار داستان'' رکھا ہوا تھا۔ فرماتے تھے کہ جب تم لوگ آجاتے ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ دنیا میں خیر ہی خیر ہے، اور جب تم چلے جاتے ہو تو سمجھتا ہوں کہ دنیا میں شر ہی شر ہے''۔

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ

للناس هم ولى اليوم همان

فقد الجراب وقتل الشيخ عثمان

ہم ابھی غم عثمانی (شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ) کو بھلانے نہ پائے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی یہ نشانی (یعنی حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ) بھی ہم سے کھو گئی۔ إنا للّٰه وإنا إليه راجعون۔

آپ ایک آفتاب علم وعمل تھے جو غروب ہوگیا۔ آپ زہد وتقویٰ کا مینار تھے جو گر گیا۔ حضرت سید صاحبؒ بہت ہی ارفع اور خاص مقام پر فائز تھے، آپ بیک وقت عظیم محقق، مدبر، مورخ، مصنف اور عاف تھے حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے مخصوص ترین خلفاء میں سے تھے، آپ کو حضرت حکیم الامتؒ سے انتہائی درجہ عقیدت ومحبت تھی جب بھی حضرت صاحبؒ کا تذکرہ چلتا آپ پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ آپ ایک جامع کمالات تھے۔ مذہب وسیاست میں یکساں مہارت حاصل تھی اور ان کی قیادت پر ہر طبقہ اعتماد کرتا تھا۔ آپ جیسی جامع شخصیات کہیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں، آپ کی شفقتیں اور عنایتیں ہمیشہ یاد رہیں گی۔ تھانہ بھون کے زمانہ سے ہی آپ سے بے تکلفانہ مراسم رہے، آپ کی مجلس میں معارف ولطائف کا دفتر کھل جاتا تھا۔ تھانہ بھون کی تاریخ کھل جاتی یا مسائل حاضرہ پر عالمانہ تبصرہ ہوتا حضرت سید صاحبؒ اپنے چھوٹوں کے ساتھ

بھی عظمت واحترام کا معاملہ فرماتے تھے، قیام پاکستان کے بعد جب آپ اتفاقی سفر سے دارالعلوم کراچی تشریف لائے تو مستقل قیام کے سلسلہ میں کوئی فیصلہ نہیں ہو رہا تھا دونوں ملکوں کے علماء ومشائخ اپنے ملک میں اس متاع گرانمایہ کو رکھنا چاہتے تھے۔ احقر نے باتوں ہی باتوں میں حضرت سید صاحبؒ سے عرض کر دیا کہ حضرت دارالاسلام میں آکر پھر ہندوستان جانا سمجھ میں نہیں آتا۔ حضرت کا کمال شفقت دیکھئے کہ احقر کی اتنی سی بات پر حضرت کو پاکستان میں مستقل قیام اور ہجرت کے بارے میں شرح صدر ہو گیا اور مستقل ٹھہرنے کا ارادہ فرمالیا۔

اسی طرح سے احقر نے حضرتؒ سے شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ کی رحلت کے بعد جمعیت علماء اسلام کی صدارت قبول کرنے کے لئے درخواست کی تو اولاً تو حضرت نے انکار فرمایا پھر احقر کے اصرار کرنے پر فرمایا کہ ''جمعیت فلاں شخص کی ہر رائے کو خواہ صواب ہو یا خطا (اس کے اثر کی وجہ سے) قبول کرے گی اس لئے صدارت قبول کرنا مشکل ہے، احقر نے عرض کیا، ہمارے اکابر کا مسلک یہ ہے کہ حق بات قبول کریں اور غلط کو رد، اس پر حضرت سید صاحبؒ خاموش رہ گئے گویا صدارت قبول فرمالی۔ علاوہ ازیں احقر ہی کی درخواست پر حضرتؒ نے تعلیمات اسلامی بورڈ کی صدارت منظور فرمائی تھی، بہرحال حضرتؒ کی عنایات بے شمار ہیں حضرتؒ کے بعد ان کی تالیفات مقالات، خطبات ومکاتیب ایک گنج گرانمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرتؒ کو درجات عالیہ نصیب فرمائیں۔ آمین

حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مولانا سید سلیمان ندویؒ سے ہمارے خاندان کے ایسے گونا گوں تعلقات اور ایسے عزیزانہ روابط تھے کہ وہ کسی دور میں بھی ہم لوگوں کے لئے اجنبی اور نامانوس نہیں تھے، وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نہ صرف تعلیم یافتہ اور فاضل بلکہ اس کے لئے سرمایۂ افتخار ونازش تھے، وہ میرے والد کے عزیز شاگرد اور بھائی صاحب کے ایسے دوست تھے، جو عمر میں بڑے اور فضیلت وشہرت میں بڑھے ہوئے تھے، ہماری درس گاہ کے ایک طرح کے مربی وسرپرست بھی تھے، میرے استاذ مولانا خلیل عرب صاحب کے ساتھ بھی ان کا تعلق کچھ ایسا ہی تھا کہ عرب صاحب کی طرف سے احترام کا معاملہ بھی تھا اور بے تکلفی ومزاح وظرافت کا معمول بھی، عرب صاحب نے اس دور میں ندوہ میں تعلیم پائی تھی، جب سید صاحب وہاں کے اساتذہ میں شامل تھے، اگر عرب صاحب کو ان سے پڑھنے کی نوبت آئی بھی ہوگی تو برائے نام، اس کے بعد جب دیکھا دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ معاملہ خوش طبعی وبے تکلفی کا دیکھا، سید صاحب اپنے بے تکلف احباب میں بڑے ظریف نکتہ سنج، سبک روح اور خوش مذاق تھے، لیکن ان کے مذاق میں بھی ایک علمی وادبی شان ہوتی تھی، عرب صاحب بھی باوجود اس کے کہ ان کا زیادہ تر سابقہ عربی سے تھا، اردو کا اچھا مذاق رکھتے تھے، اور لکھنؤ میں طویل مدت گزارنے کی وجہ سے زبان کی باریکیوں اور مزاح وظرافت کی نزاکتوں سے واقف تھے، کہ ذرا سی بے احتیاطی سے مذاق کس طرح ابتذال

اورخوش طبعی کس طرح اشتعال کے حدود میں داخل ہوجاتی ہے۔

سید صاحب کو اول اول قریب سے خواجہ رشید الدین مودودی مرحوم کی کوٹھی پر دیکھا، وہ جب لکھنؤ تشریف لاتے تھے، اکثر انھیں کی کوٹھی پر قیام کرتے تھے، خواجہ سید رشید الدین جو اچھے صاحب کے نام سے یاد کئے جاتے تھے، خواجہ سید نور الحسن خاں مرحوم کے داماد تھے، اوران کے برادرخورد نواب سید علی حسن خاں مرحوم ناظم ندوۃ العلماء ان کے برادر نسبتی تھے، اچھے صاحب کا بنگلہ نواب نور الحسن خاں مرحوم کی کوٹھی (جو بھوپال ہاؤس کے نام سے معروف تھی) کے بغل میں تھا، ۱۹۲۳ء، ۱۹۲۴ء، ۱۹۲۵ء میں بھائی صاحب کا قیام جو اس وقت میڈیکل کالج لکھنؤ میں زیر تعلیم تھے، اسی کوٹھی میں رہتا تھا، اور میں مہینوں ان کے ساتھ قیام کرتا تھا، میری عمر اس وقت ۱۱، ۱۲؍سال کی تھی، سید صاحب جب اچھے صاحب کے یہاں تشریف لاتے تھے، تو ہم لوگ ان کو قریب سے دیکھتے تھے لیکن اس وقت کی کوئی بات ذہن میں نہیں ہے، ۱۹۲۶ء، ۱۹۲۷ء سے ہم لوگ بازار جھاؤلال منتقل ہوئے اور بھائی صاحب نے مطب شروع کیا، ہمارا اور عرب صاحب کا مکان آمنے سامنے تھا، اسی زمانہ میں میری عربی تعلیم عرب صاحب کے یہاں شروع ہوئی، اس دور میں سید صاحب اور مولانا مسعود علی صاحب، بھائی صاحب یا عرب صاحب سے ملنے کبھی کبھی تشریف لاتے اور کچھ دیر صحبت رہتی، سید صاحب کا نقشہ اسی وقت سے آنکھوں میں ہے، سراپا وقار، مجسم متانت، قد میانہ، مائل بہ پستی، چہرہ سے معصومیت اور شرافت نمایاں، دیکھ کر دل شہادت دیتا تھا کہ ان میں دوسروں کو ایذا پہنچانے اور دل دکھانے کی صلاحیت ہی نہیں، لباس نہایت صاف ستھرا جس پر کہیں نکتہ چیں اور دور بیں کو بھی کوئی دھبہ یا شکن نظر نہ آئے، ہر چیز نفاست اور نستعلیقی پر دال، شیروانی کسی قدر لانبی، عمامہ سر پر نہایت سفید اور صاف اور اس کے پیچ نہایت خوبصورتی سے دیئے ہوئے، فرمایا کرتے تھے کہ میں نے عمامہ کی عادت تمہارے والد کو دیکھ کر اختیار کی، آواز پست جو قرب کے باوجود بغیر قدر دانی اور شوق کے سنی نہ جاسکے، بالعموم کم گو اور بقدر ضرورت بولنے والے، آنکھوں سے حیا اور ذہانت کا

اظہار، کچھ نہاں کچھ آشکار، جب کہیں تشریف لاتے مخالف اور موافق فضل وکمال کے معترف اور ان کے منکر دونوں احترام پر مجبور ہوجاتے، ہمارے استاد خلیل عرب صاحب ان کے فضل وکمال کے کچھ زیادہ معتقد نہ تھے، بلکہ کسی حد تک ناقد لیکن ان کو بھی ان کا ہمیشہ احترام ہی کرتے دیکھا۔

۱۹۲۹ء سے میرا دار العلوم ندوۃ العلماء سے باقاعدہ استفادہ اور طالب علمی کا تعلق قائم ہوا، اس وقت سید صاحب دار العلوم کے معتمد تعلیم تھے، ندوہ کے جلسۂ انتظامی کے علاوہ بھی تشریف لاتے اور کئی کئی دن قیام کرتے، کبھی کبھی درجوں اور طلباء کے جلسوں میں بھی تشریف لے آتے، ایک مرتبہ طلباء کا عربی جلسہ ہو رہا تھا، جب میری تقریر کی باری آئی تو میں نے اپنی عادت کے مطابق حاضرین کو مخاطب کرکے بلا کسی خطبۂ مسنون کے تقریر شروع کردی، سید صاحبؒ نے ٹوکا اور وہ حدیث یاد دلائی جس میں فرمایا گیا ہے کہ جو تحریر وتقریر حمد و ثنا سے شروع نہ کی جائے وہ ناقص اور عیب دار ہے، میرے لئے بڑی دشواری پیش آئی کہ اسی وقت حمد وثنا کے مناسب الفاظ اور موضوع کی رعایت سے خطبہ پڑھوں جس کے لئے میں نے تیاری نہیں کی تھی، میں کچھ دیر خاموش رہا، اور پھر تقریر شروع کردی، سید صاحب نے پھر ٹوکا، میں نے کہا کہ میں نے آہستہ سے پڑھ لیا ہے، سید صاحب مسکرائے اور فرمایا:

"کذا قال الشارح، کذا قال الشارح".

ستمبر ۱۹۳۰ء میں علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی دار العلوم میں ادب عربی کے استادِ اعلیٰ ہوکر آئے، اور نہ صرف دار العلوم میں بلکہ ایک طرح سے ہندوستان میں (جہاں تک عربی زبان کا تعلق ہے) ایک نئے دور کا آغاز ہوا، ہلالی صاحب نے غالباً ۱۹۳۱ء کے آخر میں ایک سفر مشرقی اضلاع بنارس، اعظم گڑھ، مئو، مبارکپور کا کیا، انھوں نے ازراہ کرم وشفقت مجھے اپنی رفاقت اور معاونت کے لئے انتخاب فرمایا اور میں اس پورے سفر میں ایک خادم اور ترجمان کی حیثیت سے ان کے ساتھ رہا، رمضان کا زمانہ تھا، اور دسمبر یا جنوری کا مہینہ، اس سفر میں کئی روز دار المصنفین میں قیام رہا، یہ میری دار المصنفین کی پہلی حاضری

تھی، افطار تو سب ساتھ ہی کرتے تھے، البتہ سحری کے لئے ہم دونوں کو سید صاحب کے دولت کدہ پر جانا ہوتا تھا، دونوں یگانہ فاضلوں کو دیر دیر تک علمی وادبی گفتگو کرتے سنا، اسی سفر میں دارالعلوم سے ایک عربی رسالہ کے اجراء کا فیصلہ ہوا جس کے نگراں وسرپرست سید صاحب اور ہلالی صاحب اور ایڈیٹر ہمارے دوست مولانا مسعود عالم صاحب ندوی منتخب ہوئے، یہ سید صاحب کے پرانے علمی وادبی ذوق کی تجدید اور ایک عربی رسالہ نکالنے کے دیرینہ خواب کی تعبیر تھی، اس رسالہ کا پہلا شمارہ محرم ۱۹۵۱ھ، مئی ۱۹۳۲ء کو نکلا، اس کا افتتاحیہ سید صاحب نے لکھا اور خوب لکھا، یہ ان کی عربی انشاء پردازی کا بہترین نمونہ ہے، کہیں سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی عربی لکھنے کی مشق چھوٹی ہوئی ہے، اور قلم کے مسافر کو ایک نئی وادی درپیش ہے، سید صاحب نے اس مضمون میں ہندوستان میں عربی صحافت کا مختصر جائزہ بھی لیا ہے، اور اس کی ضرورت بھی بیان کی ہے، اس مضمون میں کہیں کہیں عبارت کی ساختگی، بے تکلف مسجع اور استعارات وتشبیہات کی ندرت ان کے پرانے عہد کی یاد تازہ کرتی تھی۔

اس کے بعد سید صاحب کو عربی نثر میں لکھنے کا اتفاق تو بہت کم ہوا، زیادہ تر ان کی نظمیں اور قصائد شائع ہوئے اور ان کے اردو کے بعض تحقیقی مضامین کے ترجمے، جو زیادہ تر مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کے قلم سے ہوتے تھے، شائع ہوئے۔

سید صاحب سے قرب اور ان کی شفقتوں اور نوازشوں سے مستفید ہونے کا موقع دارالعلوم میں تدریسی تعلق کے بعد ہوا، اس انتخاب اور تقرر میں بھی مولانا مسعود علی صاحب ندوی کی تحریک اور سید صاحب کی تائید کو دخل تھا، میرا تقرر یکم اگست ۱۹۳۴ء کو بحیثیت استاد تفسیر وادب ہوا، سید صاحبؒ دارالعلوم تشریف لاتے، تعلیمی مشورے دیتے، درجوں میں تشریف لے آتے، اکثر خود ہی درس شروع کر دیتے، بعض اوقات کئی کئی گھنٹے درس جاری رہتا، اور طلباء سے زیادہ ہم لوگوں کو استفادہ کا موقع ملتا، کئی کئی روز مہمان خانہ میں قیام رہتا، طلباء کم اور اساتذہ زیادہ حاضر باش، اور مصروف استفادہ رہتے، سید صاحب کو طلباء کی اس بے توجہی اور ناقدری کا نہ صرف احساس بلکہ قلق بھی تھا، ایک مرتبہ مجھ سے

فرمایا: کہ مولوی علی (سید صاحب اکثر مجھ سے خطاب اسی طرح کرتے تھے) طلباء میرے پاس آنے سے کیوں گھبراتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ آپ امتحان بہت لیتے ہیں، سید صاحبؒ کا تدریسی ذوق آخری وقت تک نہیں گیا تھا، انھوں نے صرف ونحو کی تعلیم قدیم طریقے پر پائی تھی اور اس کی اہمیت اور اس کا ذوق ان پر آخر تک غالب رہا، ان کو لغت واشتقاق سے بھی بہت دلچسپی تھی، ہر درجہ کے طالب علم سے اس کی استعداد اور سطح کے مطابق صرف، نحو اور لغت کے سوالات کرتے، عربی کا کوئی شعر پڑھتے اور مطلب پوچھتے، طلباء فطرتاً امتحان سے گھبراتے ہیں، پھر اچھے اچھے لوگ سید صاحب کی جرح کی تاب نہیں لا سکتے تھے، ان میں سے ایک بڑی تعداد سید صاحب کے مقام ومرتبہ سے ناآشنا بھی تھی، پھر سید صاحب کی مجلس کا وقت بالعموم اپنی ضروریات کے لئے بازار جانے یا کھیلنے کا ہوتا تھا، اس لئے طلباء ان کی مجلس میں بہت کم نظر آتے تھے، سید صاحب نے فرمایا کہ اچھا میں امتحان نہیں لیا کروں گا، تم طلباء کو سمجھا دو، میں نے طلباء کو ان زریں موقعوں سے فائدہ اٹھانے اور ان تاریخی مجلسوں کو غنیمت بلکہ نعمت سمجھنے کی ترغیب دی، کہنے سننے سے کچھ طلباء آئے بھی لیکن بعض اوقات سید صاحب پر وہ پرانا ذوق غالب آ گیا اور انھوں نے پھر کوئی سوال کر دیا اور بعض اوقات طلبہ کو ان مجلسوں میں اپنی دلچسپی کا کوئی سامان نظر نہ آیا، اور ان کی تعداد میں کوئی نمایاں اضافہ نہ ہوا، اور سید صاحب کو اس کا قلق اور ہم لوگوں کو اس کی شرمندگی ہی رہی کہ طلباء نے گھر آئی ہوئی اس دولت اور اس ہُمائے علم وادب کے سایہ سے فائدہ نہ اٹھایا۔

سید صاحب کو سال میں کئی مرتبہ علی گڑھ کا سفر پیش آتا، وہ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر بھی تھے، اساتذہ کے انتخاب کے لئے بھی بحیثیت ماہر خصوصی (Expert) ان کو بلایا جاتا، یونین بھی کبھی ان کو مدعو کرتی، دہلی اور مغربی، شمالی ہندوستان کے سفر بھی پیش آتے، ہر مرتبہ وہ آتے جاتے لکھنؤ ٹھہرتے اور کئی کئی روز ٹھہرتے، فرماتے کہیں جاؤ یا آؤ، ندوہ پہنچ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے گھر آ گئے، بالاستقلال بھی کئی کئی ہفتے قیام کرتے، اسی دوران میں ہم چند اساتذہ کو انھوں نے فلسفۂ قدیم کی ایک کتاب پڑھانی شروع کی جس کا سلسلہ

کچھ زیادہ دن قائم نہیں رہا، لیکن فلسفۂ یونان کے متعلق بعض بنیادی حقائق معلوم ہوئے جو بعد میں بہت کام آئے۔

سید صاحب کے لئے علم کا معاملہ کسی پیشے یا ضرورت یا کسی مجبوری اور مصلحت کا معاملہ نہ تھا، علم ان کا گوشت پوست بن گیا تھا، اور ان کے خون میں جاری وساری ہو گیا تھا، وہی ان کی غذا تھی، وہی ان کی تفریح اور وہی ان کا اوڑھنا بچھونا، اکثر دیکھا کہ ان کا تانگہ دارالعلوم کے پھاٹک میں داخل ہوا اور جو پہلا شخص ملا اس سے کہا فلاں فلاں استادوں کو خبر کردو یا کتب خانہ سے فلاں فلاں کتاب لے آؤ، مہمان خانہ پہنچ کر شیروانی اتاری، ہاتھ منھ دھویا اور چائے کے انتظار میں بیٹھے، حدیث وفقہ کے استاذ آگئے اور کسی علمی مسئلہ پر مذاکرہ شروع ہو گیا، کتب خانہ سے کتاب پہنچ گئی، اس کا مطالعہ شروع ہو گیا، اس میں کسی فن کی تخصیص نہ تھی، کبھی حدیث کا مسئلہ ہوتا، کبھی فقہ کا، کبھی کوئی تاریخی بحث ہوتی، کبھی تذکرے اور تراجم کی کوئی بات، جب تک قیام رہتا ان کی مجلسوں میں علمی مذاکرے اور بحث وتحقیق کے سوا کوئی موضوع نہ چھڑتا، کسی سیاسی شخصیت یا عمائد شہر میں سے کسی کے آجانے سے کچھ موضوع بدل جاتا لیکن اس کی جملہ معترضہ سے زیادہ حیثیت نہ ہوتی، البتہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ یا مولانا مسعود علی صاحب ندویؒ اور مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ کے آنے سے کچھ تفریحی گفتگو، گذشتہ دور کی یاد اور مشترک دلچسپی اور تعلقات کی باتیں ہونے لگتیں، بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہوگا کہ سید صاحب ضلع جگت، لفظی رعایت اور نکتہ آفرینی میں بڑا کمال رکھتے تھے، ان کے اس ذوق نے ان کے بڑھتے ہوئے وقار اور متانت اور سنجیدگی کو خشکی اور یبوست تک پہنچنے نہیں دیا تھا، یہ ذوق اس وقت خاص طور پر نمایاں ہوتا تھا، جب مولانا عبدالماجد صاحبؒ جیسے خوش مذاق اور زبان کے اداشناس یا لکھنوی مذاق کے کوئی بزرگ تشریف لے آتے، بھائی صاحب مرحوم کے آنے سے یا مہتمم صاحب دارالعلوم کے تشریف رکھنے سے کچھ ندوہ اور دارالعلوم کے معاملات اور مسائل پر بھی گفتگو ہوتی، لیکن اصل ذوق اور موضوع وہی تھا، جو طبیعت ثانیہ بن گیا تھا، اور اس سے مفارقت

شدید بیماری میں بھی گوارہ نہ تھی۔

سید صاحب کی مجھ پر خصوصی شفقت اس وقت سے شروع ہوئی جب اللہ تعالیٰ نے مجھے ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' لکھنے کی توفیق عطا فرمائی، یہی وہ زمانہ تھا کہ سید صاحب کا ذوق وذہن مردہ نقوش سے اکتا کر، زندہ نفوس، صورت سے ہٹ کر حقیقت اور خبر سے سیر ہو کر نظر کی تلاش میں سرگرداں تھے، غالباً ۱۹۳۷ء کا آخر ۱۹۳۸ء کا آغاز تھا، ایک مرتبہ وہ لکھنؤ تشریف لائے اور ہمارے ہی مکان پر ایک دو روز قیام رہا، میں نے ان کی خدمت میں ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' کا مسودہ پیش کیا، انھوں نے پورے مسودے پر نظر ڈالی، اس میں جابجا والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب کے سفرنامۂ وروزنامہ ''ارمغان احباب'' کے حوالے تھے، سید صاحب نے اصل کتاب کے جو اس وقت مصنف کے مسودہ کی شکل میں تھی، دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا، مسودہ پیش کر دیا گیا، سید صاحب نے اس کی نقل کی فرمائش کی جس کی تعمیل کی گئی، انھوں نے اس کو اپنے تعارفی کلمات کے ساتھ ''معارف'' میں بالاقساط ''دہلی اور اس کے اطراف'' کے عنوان سے شائع فرمایا، خود ہی اس پر ذیلی عنوانات قائم کئے اور کتاب پر جابجا اپنے قلم سے حواشی اور تشریحی نوٹ اضافہ فرمائے۔

اسی موقع پر میں نے ان سے سیرت پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی، فرمایا کہ جب کتاب چھپ جائے تو بھیج دینا، میں اس پر کچھ لکھ دوں گا، ۱۹۳۸ء کے آخر یا ۱۹۳۹ء کے اوائل میں جب اس کی طباعت مکمل ہوئی تو میں نے اس کو کتابی شکل دے کر ان کی خدمت میں بھیج دیا، سید صاحب کو جب یہ کتاب ملی تو انھوں نے حسب ذیل مکتوب ارقام فرمایا جو غالباً میرے نام ان کا پہلا شفقت نامہ تھا، مکتوب بجنسہٖ درج ہے۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ

عزیزی رزقکم اللہ علمًا نافعًا

کتاب ملی، جابجا سے پڑھی، بعض حصے تو بہت مؤثر ہیں، جن کو پڑھ کر آنکھیں پرآب ہو گئیں، آپ کا انداز بیان اور انشاء بھی

دلپذیر ہے۔

اللہ کرے حسنِ رقم اور زیادہ

آپ نے لکھنے کے لئے کیا چھوڑا ہے جو میں لکھوں، چاہتا
ہوں کہ کتاب کی روح چند لفظوں میں کھینچ لوں، چند صفحے ہوئے ہیں،
کچھ اور ہو جائیں تو بھیج دوں، تراجم علماء حدیث کا دیباچہ آپ نے
دیکھا ہے؟ اسی پرداز پر ہوگا۔

سید صاحب نے مقدمہ لکھا اور دل کھول کر لکھا، ان کی اس تحریر میں بڑی دلآویزی، آمد اور ادبیت ہے اور غالباً یہ مقدمہ اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے ان کی تحریروں میں نمایاں مقام رکھتا ہے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس میں دماغ کے ساتھ دل، اور علم و زور انشاء کے ساتھ عشق و وجدان بھی شامل ہے، مقدمہ لکھنے کے بعد دوسرا شفقت نامہ باعث سرفرازی ہوا، اس کتاب کے پڑھنے اور اس سے جو تعلق پیدا ہوا تھا، غالباً اسی کا نتیجہ تھا کہ مجھے ایک قریبی سفر میں جو کرنال اور پانی پت کی طرف ہونے والا تھا، معیت اور ہمرکابی کا ایما ہوا، مکتوب درج ذیل ہے۔

اعظم گڑھ

برادرم سلّمہٗ اللہ تعالیٰ

دیباچہ مرسل ہے پسند آئے تو شامل کتاب کیجئے گا، کتاب
چھپنے کے بعد ایک نسخہ مکمل بھیج دیجئے گا، آپ کو اپنی اس کتاب کے کچھ
نسخے دار المصنفین میں فروخت کے لئے کمیشن پر رکھوانا چاہئے۔

مارچ کے شروع میں کرنال کے مدرسہ اسلامیہ کے معائنہ
کے لئے جانا ہے آپ بھی چلنے کو تیار رہئے، علی گڑھ کی کامیابی پر
مبارک باد، اس مضمون کی رسید سے مطلع کیجئے۔

سید سلیمان ۱۹۳۹ء

یہ میرا پہلا سفر تھا جو سید صاحب کی معیت میں ہوا، یہ سفر کئی حیثیتوں سے یادگار اور میرے لئے سرمایۂ عزت و افتخار تھا، سید صاحب کے پایہ کے ایک عالم و محقق و ادیب کی ہمہ وقت صحبت، دینی و علمی مرکزوں کا سفر، تاریخی مقامات اور آثارِ قدیمہ کی سیر، بڑے بڑے اہل علم و فضل سے ملاقات، علمی و ادبی مجلسیں، ہر حیثیت سے یہ سفر میرے لئے وسیلۃ الظفر بن گیا، سید صاحب پہلے کرنال تشریف لے گئے جہاں ان کو شمشیر جنگ نواب عظمت علی خاں رئیس کرنال کے وقف کے مدرسہ کا معائنہ کرنا تھا، اور وہاں کے بعض اساتذہ کے متعلق جن سے منتظمین مطمئن نہ تھے، رائے دینی تھی، اس وقت اس مدرسہ میں جو جامع مسجد کرنال میں قائم تھا، مولانا حمد اللہ صاحب پانی پتی صدر مدرس تھے، جو مولانا شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے تلمیذ رشید اور ان کی تحریک کے ایک کارپرداز اور معتمد رہ چکے تھے، اور ان کا ریشمی خطوط کے قضیہ کے سلسلہ میں بار بار نام آیا تھا، میں نے بھی ان کی زیارت کی، منتظمین ان کی سن رسیدگی اور ضعف کی وجہ سے ان کو ہٹانا چاہتے تھے، لیکن اس کی جرأت نہیں کرتے تھے، سید صاحب کو دراصل انھوں نے اسی مقصد سے بلایا تھا کہ ان کے صادر کر دینے کے بعد پھر قیل وقال کی گنجائش نہیں تھی، لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے، اور سید صاحب نے ان کو اپنے عہدہ پر برقرار رکھا، اس وقت ضلع کرنال کے ڈپٹی کمشنر حافظ عبدالحمید صاحب آئی سی ایس تھے، ان کا پڑاؤ اس وقت تھانیسر میں تھا، وہ سید صاحب کے علم و فضل سے غائبانہ واقف اور دار المصنفین کی خدمات سے متاثر تھے، انھوں نے لنچ پر مدعو کیا، میں نے بھی اس سفر کی برکت سے تھانیسر کی جو مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری مصنف ''سوانح احمدی'' اور ''کالا پانی'' کا وطن تھا کی زیارت کی، سب سے پہلے میں نے یہیں مغربی طرز کا کھانا کھایا، اور سید صاحب نے جو یورپ کا سفر کر چکے تھے، میری رہنمائی کی، اسی کھانے پر میں نے پہلی مرتبہ ایک شریک مجلس سے مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور ان کی تبلیغی مساعی کا ذکر سنا۔

کرنال کے کام سے فارغ ہو کر ہم لوگ پانی پت آئے اور حسن اتفاق کہ ہم لوگ

خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم کے فرزند ارجمند خواجہ سجاد حسین مرحوم کے مہمان ہوئے، انھوں نے بھی اس مکان میں ٹھہرایا جو مولانا حالی کی آخری رہائش گاہ تھی، اور وہیں سے انھوں نے سفر آخرت اختیار کیا، ان کی بعض مشہور نظمیں خصوصاً ''چپ کی داد'' وہیں لکھی گئیں، اس نظم کا نام آ گیا تو یہ بھی سنتے چلئے کہ خواجہ سجاد حسین مرحوم نے سنایا کہ خواجہ غلام الثقلین یا ان کے بھائی (مجھے اس وقت نام میں شبہ ہو گیا ہے) خواجہ غلام الحسنین نے ایک دن مولانا حالی سے تعجب کے لہجہ میں کہا کہ اس سفر میں ایک صاحب یہ کہہ رہے تھے کہ مولانا حالی کی بہترین نظم اور ان کی شاہکار ''چپ کی داد'' ہے، مولانا نے ان سے کہا کہ تمہارا کیا خیال ہے؟ انھوں نے اس میں کچھ تردد کا اظہار کیا، مولانا نے اس شخص کی تصویب فرمائی اور فرمایا کہ وہ ٹھیک کہتا تھا، اسی زمانۂ قیام میں اردو کے مشہور مصنف منشی ذکاء اللہ صاحب دہلوی مرحوم کے صاحبزادہ جو خود بڑے مصنف اور اردو کے کامیاب ترین مترجم سمجھے جاتے تھے، مولوی عنایت اللہ صاحب بی، اے مرحوم بھی پانی پت میں مقیم تھے، سید صاحب ان سے ملنے گئے، خواجہ سید حسین بھی ہمراہ تھے، فرمایا کہ ''اس وقت اردو کی تین انشاء پردازوں اور اردو کے معماروں کے فرزند و وارث موجود ہیں، مولانا حالی کے فرزند ارجمند خواجہ سجاد، حسین منشی ذکاء اللہ صاحب کے چشم و چراغ مولوی عنایت اللہ اور مولانا شبلیؒ کا فرزند معنوی میں''۔

اس سفر میں سید صاحب نے اولیائے پانی پت کے مزارات کی زیارت کی، سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے دو نامور شیخ اور سرحلقہ، خواجہ شمس الدین ترک پانی پتیؒ، اور کبیر الاولیاء شیخ جلال الدین پانی پتیؒ یہیں آسودۂ خاک ہیں، حضرت خواجہ بوعلی قلندرؒ کی درگاہ بھی یہیں ہے، سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے ایک شیخ کامل و فاضل اجل حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ بھی یہیں آرام فرما ہیں، اور مولانا غوث علی شاہ صاحب بھی یہیں مدفون ہیں، کچھ سادات کرام کے مزارات بھی ہیں، جو غالباً شہر کے باہر ہیں، سید صاحب جہاں جاتے اپنی تاریخی معلومات سے ہم لوگوں کو مستفید کرتے، مولانا غوث علی شاہ صاحب کے مزار پر

فرمایا کہ یہ صوبۂ بہار کے تھے، یہ بھی غالباً فرمایا کہ سب سے زیادہ سادات کرام کے مزارات پر جی لگا، سید صاحب غالباً مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی کے مکان پر بھی حاضر ہوئے، ان کے پوتے جن کا نام غالباً مولانا عبدالسلام صاحب تھا، خود بھی ملنے آئے، اور انھوں نے جمعہ کے جامع مسجد میں تقریر کی فرمائش کی، سید صاحب نے تقریر فرمائی جس میں پانی پت کی تاریخی اہمیت اور عظمت کا اظہار اور اس کے علماء اور مشائخ اور اس کی خاک کے گنجہائے گرانمایہ کی طرف عالمانہ اور مؤرخانہ اشارات کئے، پانی پت کا تاریخی میدان بھی دیکھا، جہاں مرہٹوں نے شکست فاش پائی تھی، اور مسلمانوں کے اقتدار کو وقتی طور پر زندگی کی ایک قسط اور اس ملک میں کچھ عرصہ باعزت رہنے کی مہلت مل گئی تھی، پانی پت کا یہ میرا پہلا اور آخری سفر تھا، اور اب دس بار بھی جانا ہو تو ایک مؤرخ عظیم کی معیت کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔

پانی پت سے دہلی واپسی ہوئی، راستہ میں ایک صاحب کا ساتھ ہو گیا، جو ''طلوع اسلام'' کے نائب ایڈیٹر تھے، ''طلوع اسلام'' اس وقت جناب غلام احمد صاحب پرویز کی ادارت میں دہلی سے نکلتا تھا، اور اس نے حدیث وسنت کو عرصہ سے نشانہ بنا رکھا تھا، وہ صاحب سید صاحب سے اس موضوع پر دیر تک بحث کرتے رہے، انھوں نے خیال کیا کہ یہ کوئی مولوی صاحب ہیں، جو اتفاق سے ہاتھ لگ گئے ہیں، ان کی بدولت سفر ذرا لطف سے طے ہو گا، سید صاحب نے بھی اپنا تعارف نہیں کرایا اور گفتگو میں حصہ لیتے رہے، دہلی کا اسٹیشن آیا اور سید صاحب اتر گئے، اور میں سامان کے انتظام کے لئے ٹھہر گیا، اسی اثناء میں انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ یہ کون مولوی صاحب ہیں؟ میں اس سے بے خبر تھا کہ سید صاحب نے مصلحتاً اپنا نام نہیں بتلایا، میں نے حیرت کا اظہار کیا اور کہا کہ آپ نے ابھی تک نہیں پہچانا؟ یہ مولانا سید سلیمان ندوی تھے، یہ سن کر وہ کچھ سناٹے میں آ گئے، لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا، میں نیچے اترا، سید صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ تم نے ان صاحب کو میرا نام تو نہیں بتلایا؟ میں نے کہا کہ میں نے تو بتلا دیا، فرمایا کہ یہ بڑی غلطی کی، سفر میں نام

نہیں بتلایا کرتے، پھر یہ شعر پڑھا

صوفی نہ شود صافی تا درنہ کشد جامے
بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

دہلی میں قیام جامعہ ملیہ کے مہمان خانہ میں ہوا، اس وقت جامعہ ملیہ قرول باغ میں تھی، مجھے یاد ہے کہ مہمان خانہ پہنچتے ہی ایک ندوی فاضل سے جو اس وقت جامعہ میں پڑھتے تھے، ملاقات ہوئی، ملتے ہی فرمایا کہ کیا تمہارے کتب خانہ سے قنوج کی تاریخ پر فلاں انگریزی کتاب مل سکتی ہے؟ شام کا وقت تھا، اور سید صاحب کی آنکھوں میں تکلیف بھی تھی، مجھے یاد نہیں کہ اس وقت کتاب دستیاب ہوگئی یا اگلے دن ملی، بہرحال سید صاحب نے اسی سفر میں کتاب سے استفادہ کیا، غالباً وہ اس زمانہ میں ’’حیات شبلی‘‘ لکھ رہے تھے، اور یورپ کے تاریخی شہروں کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات جمع کرنے کے لئے ساعی تھے، اگلے روز ڈاکٹر ذاکر حسین خاں شیخ الجامعہ کے یہاں دوپہر کا کھانا تھا، ڈاکٹر صاحب کو قریب سے دیکھنے اور ان کی سادہ زندگی، ذہانت اور ظرافت کا نمونہ دیکھنے کا وہیں موقع ملا، وہیں پہلی مرتبہ خان عبدالغفار خاں کو دیکھا جن کو شیخ شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم تعلیم بالغان کا مرکز اور اس کا کام دکھانے کے لئے لائے تھے، اور غالباً سید صاحب کو بھی زحمت دی تھی۔

اکتوبر ۱۹۳۵ء میں سید صاحب سخت علیل ہوئے، ان کے احباب اور معتقدین دور دور سے عیادت کے لئے گئے، بھائی صاحب نے بھی پہلی مرتبہ اعظم گڑھ کا سفر کیا، اور دو ایک دن دارالمصنفین میں قیام کیا، مرض ذات الجنب کا شدید حملہ تھا، جس سے قلب بھی متاثر تھا، ڈاکٹروں نے ہر طرح کی مشغولیت اور فکر سے علاحدہ رہنے اور مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا، لیکن بھائی صاحب کا بیان ہے کہ ان کا دماغ برابر کام کرتا رہتا تھا، اس پر ایک لطیفہ بھی سن لیجئے، بھائی صاحب نے کہا کہ ضرورت ہے کہ آپ کچھ عرصہ کے لئے اپنے دماغ کو مکمل سکون و آرام دیجئے، اور مضامین کی ترتیب اور ان کے لئے علمی مواد کی تلاش اور ذہن میں بھی ان کا خاکہ بنانے سے مکمل احتراز کیجئے، سید صاحب نے کہا کہ ایسا کیسے ممکن

ہے؟ بھائی صاحب نے جواب دیا کہ اس کی دو تین تدبیریں ہوسکتی ہیں، تاش اور شطرنج تو آپ کے شایان شان نہیں جس میں مکمل استغراق ہوجاتا ہے، ناول اور افسانے بھی آپ نہیں پڑھیں گے، ایک یہ کہ آپ الیکشن لڑیئے جس میں دین و دنیا دونوں سے بے نیازی ہوجاتی ہے، دوسرے شاعری شروع کردیجئے کہ اس میں بھی کسی کی سدھ بدھ نہیں رہتی، ایک زیرلب تبسم پر یہ مکالمہ ختم ہوگیا، اور سید صاحب اس مشورہ پر عمل نہیں کرسکے۔

سید صاحب کو جب اس علالت سے افاقہ ہوا اور ملاقات کی اجازت ہوئی تو دارالعلوم کے چند اساتذہ بھی عیادت اور مبارک باد کے لئے اعظم گڑھ گئے، ان میں ہمارے استاد اور دارالعلوم کے شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں بھی تھے، مولانا مسعود عالم صاحب بھی اور راقم سطور بھی، سید صاحب ہم لوگوں سے بڑی محبت اور شفقت سے ملے، احتیاط و اعتدال کے ساتھ علمی مذاکرات بھی شروع ہوگئے، اور سید صاحب کا قدیم علمی و تدریسی ذوق ابھر آیا، ایک روز مجلس میں سورۂ جمعہ پر اور اس کی آیات کی باہمی ربط اور نظام پر ایسی فاضلانہ تقریر فرمائی اور ایسے علمی نکتے بیان کئے کہ ہم لوگ یہ سمجھے کہ سید صاحب کا اصل موضوع تفسیر اور تدبر قرآن ہی ہے، اس تقریر کو قلمبند نہ کرنے کا اب تک افسوس ہے۔

اس علالت سے صحت یاب ہوکر سید صاحب سب سے پہلے لکھنؤ تشریف لے آئے، ہم لوگوں نے ان کے استقبال اور اپنے جذبات و مسرت کے اظہار کے لئے بڑے بڑے منصوبے بنائے، ایک پروگرام یہ تھا کہ ان کو اساتذۂ دارالعلوم اور طلباء دارالعلوم کی طرف سے عربی میں سپاسنامے پیش کئے جائیں، جب سپاسناموں کی ترتیب کا مسئلہ سامنے آیا تو اساتذہ کی طرف سے سپاسنامہ لکھنے کا کام میرے سپرد ہوا، اور طلباء کی طرف سے سپاسنامہ لکھنے کا کام مولانا مسعود عالم صاحب ندوی نے اپنے ذمہ لیا، ہم دونوں نے پوری دلچسپی اور توجہ کے ساتھ سپاسنامے لکھے، میں نے اپنے سپاسنامہ میں اس کی رعایت کی کہ سید صاحب کی تمام اہم تصنیفات کے نام تلمیح اور اشارہ کے پیرایہ میں آجائیں، ہر مرتبہ ان کو خطاب کرنے میں بھی نیا اسلوب اختیار کیا، غرض یہ سپاسنامے علماء اور معززین شہر کی

موجودگی میں ۱۵/مارچ ۱۹۳۶ء میں انجمن الاصلاح کے جمالیہ ہال میں پیش کئے گئے، وہ بھی ایک عجیب منظر تھا، علمائے فرنگی محل، عمائد شہر، نامور مسلم وکلاء، ہائی کورٹ کے بعض مسلمان جج موجود تھے، اور سب سید صاحب کے احترام اور اس فاضل یگانہ کی صحت سے مسرور، سید صاحب نے آخر میں اردو میں تقریر کی جس میں اپنے عزیزوں اور اپنے علمی خاندان کے افراد کی محبت کا شکریہ، اپنی زندگی کے بعض تجربے، اور طلباء کو مفید نصائح تھے، میرے دور کی تاریخ میں یہ واقعہ بھی یادگار رہے گا یہ ایک بزرگ خاندان کا جشن صحت نہ تھا، علم وادب، فکر ونظر اور بحث وتحقیق کی تازگی اور رعنائی اور نئے عزم سفر کی تہنیت تھی۔

سید صاحب کی دلچسپی دار العلوم کے ساتھ برابر بڑھتی جارہی تھی، وہ اس عہد کہن کو تازہ کرنے کی فکر میں رہتے تھے، جب دار العلوم ان کے استاذ مولانا شبلیؒ کی رہنمائی اور سربراہی میں ہندوستان کے اہل علم وذوق کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا اور اس کا رسالہ ''الندوہ'' ہندوستان کے علمی مطلع پر ایک نئے سیارہ کی حیثیت سے طلوع ہوا تھا، سید صاحب نے ''الندوہ'' کے دوبارہ اجرا کا حکم دیا اور وہ راقم سطور اور رفیق محترم مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی استاذ دار العلوم کی ادارت میں ۱۹۴۰ء سے نکلنا شروع ہوا، سید صاحب نے اس میں متعدد مضامین لکھے اور ان کی مختلف تقریریں بھی اس میں شائع ہوئیں، نومبر ۱۹۴۰ء سے اس میں ''میری محسن کتابیں'' کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین شروع ہوا، اس میں سب سے پہلا مضمون نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ کا تھا، دوسرا سید صاحب کا، سید صاحب اس کی توسیع اشاعت اور اس کے معیار کے بلند کرنے کی فکر میں رہتے تھے، لیکن کچھ تو ملک میں ایسے سنجیدہ رسالوں کا رواج نہ تھا، دوسرے ہم لوگ بھی اپنی تدریسی مصروفیتوں اور نوعمری کی وجہ سے اس کا معیار کچھ زیادہ بلند نہ کرسکے، بالآخر فروری ۱۹۴۲ء میں تقریباً دوسال جاری رکھ کر اس کو بند کرنا پڑا۔

۱۹۴۰ء، ۱۹۴۱ء کا زمانہ تھا کہ سید صاحب علم وتحقیق کے چشموں سے سیراب ہوکر اور علوم دینیہ اور تاریخ وادبیات کے سمندر میں بار بار غوطہ لگانے کے بعد اپنی روح کی

پیاس اور ''قلب کی کسی اور چیز کی تلاش'' محسوس کرنے لگے تھے، اور اپنے محبوب دوست اور نامور معاصر علامۂ اقبالؒ کے الفاظ میں خلوتوں میں (زبان حال سے) زیرلب اس طرح گویا ہوتے تھے کہ

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گزشتہ روز وشب
مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم نخیل بے رطب
تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ عقل تمام بولہب

شاید علمائے معاصرین کم سے کم ہندوستان کے فضلاء مدارس میں کسی کے ضمیر میں عقل وعشق، قدیم وجدید، مشرق ومغرب اور دین وادب یا دین وفلسفہ کا یہ معرکہ اس طرح برپا اور تازہ نہ ہوا ہوگا، جس طرح ندوہ کے اس فاضل، سیرت النبی ﷺ کے اس مصنف، میدان سیاست اور بزم ادب کے اس محرم راز اور یورپ کے اس سیاح کے ضمیر میں ہوا تھا، انھوں نے اس نخیل علم کی آبیاری بھی کی تھی، اس کی گھنی چھاؤں میں برسوں آرام بھی کیا تھا، اس کی تاریخ بھی لکھی تھی، اس کی زندگی اور موت کا فلسفہ بھی بیان کیا تھا، لیکن ان کے قلب سلیم اور روح بے تاب کی شہادت تھی (اگرچہ ان کے بہت سے معتقدین، تلامذہ اس کے ماننے کے لئے تیار نہ تھے کہ سید صاحب میں کوئی کمی اور تشنگی ہے) کہ وہ اس کے تازہ اور شاداب رطب سے فیضیاب نہیں ہوئے تھے، ان کی کتابوں نے بالخصوص ''خطبات مدراس''، ''سیرۃ النبی ﷺ'' کے مضامین اور ''سیرت عائشہؓ'' کے صفحات نے ہزاروں کو حلاوت ایمانی سے لذت آشنا کیا تھا، لیکن ان کی ہمت عالی اور ان کا طائر بلند پرواز خود اس دولت بیدار کا طالب تھا، جس کو حدیث میں احسان اور قرآن مجید میں تزکیہ کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے، اور جس طرح ان کو علم وادب کی وادی کو کامیابی وفتح مندی کے ساتھ طے کرنے کے لئے علامہ شبلی جیسا خضر طریق ملا تھا، احسان اور تزکیہ کی وادی کے لئے بھی ایک خضر راہ اور ایک مرد حق آگاہ کی تلاش تھی، اس سلسلہ میں ان کی کہانی اور ان

کے واردات قلبی حجۃ الاسلام امام غزالی کی کہانی اور واردات قلبی سے بہت مشابہ نظر آتے ہیں کہ ان کو بھی علم وشہرت کے بام عروج پر پہنچنے کے بعد اپنی علمی زندگی اور ذہنی کد وکاوش، سراب نظر آنے لگی اور علم ویقین کے چشمۂ حیواں کی تلاش میں نکلے اور سیراب وکامیاب واپس آئے۔

یہ خضر راہ ان کو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی شکل میں مل گیا، اور چونکہ عراقی کی طرح ان کا باطن اس حرارت وحلاوت کو قبول کرنے کے لئے بالکل تیار تھا، اس لئے انھوں نے سالوں کی راہ مہینوں میں اور مہینوں کی راہ ہفتوں میں اور دنوں میں طے کی، اور شیخ وقت کے اعتماد واستناد سے بہت جلد سرفراز اور ان کے خلیفۂ مجاز ہوئے۔

سید صاحب کا تعلق اپنے شیخ سے اور شیخ کی شفقت ان کے حال پر برابر بڑھتی جارہی تھی کہ ۱۶؍رجب ۱۳۶۲ھ (جولائی ۱۹۴۳ء) میں مولانا تھانویؒ نے سفر آخرت اختیار کیا، سید صاحب کو یہ خبر سنتے ہی لکھنؤ کا سفر پیش آیا، اس وقت ان پر کچھ عجیب از خود رفتگی اور حزن وقلق کی کیفیت طاری تھی، حکمت الٰہی کہ انھیں دنوں مولانا محمد الیاس صاحبؒ بھی لکھنؤ تشریف لے آئے، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ اور ایک تبلیغی جماعت بھی اس وقت ندوہ میں ہی مقیم تھی، دونوں کا قیام ندوہ کے مہمان خانہ میں تھا، مولانا الیاس صاحبؒ کی اس صحبت اور ان کے تبلیغی جلسوں کی شرکت نے ان کے زخمی دل کے لئے مرہم کا کام دیا، سید صاحب مولانا کے ساتھ اسی احترام اور تواضع سے پیش آئے جیسے کوئی مسترشد اپنے شیخ کے ساتھ پیش آتا ہے، مولانا بھی ان کا بڑا احترام کرتے تھے، اور ان کے علم، ان کے مقام، ان کی طلب صادق اور اخلاص کے بڑے معترف اور قدرداں تھے، اس زمانہ میں سید صاحب پر ذکر جہر کا بہت غلبہ تھا، دونوں حضرات کا قیام مہمان خانہ ہی میں تھا، مولانا الیاسؒ، سید صاحب کے اس ذوق کو دیکھ کر بہت مسرور تھے، سید صاحب مولانا کے ساتھ کانپور بھی تشریف لے گئے، اور حلیم مسلم کالج کے ایک جلسہ میں بڑی پر اثر تقریر بھی فرمائی، معارف کے شذرات میں بڑے بلند الفاظ میں ان کا اور ان کی دعوت کا تعارف

کرایا، پھر مولانا کے انتقال کے بعد میری کتاب ''مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت'' پر بطور مقدمہ کے ایک عالمانہ مضمون لکھا، جس کے لفظ لفظ سے عقیدت اور تاثر کا اظہار ہوتا ہے، بھوپال جانے اور پاکستان منتقل ہونے کے بعد بھی ان کا تعلق تبلیغی جماعت سے قائم رہا، وہ اس جماعت کے اخلاص وللّٰہیت، اس کے بانی کی عظمت ومقبولیت، اور اس کام کے خالص دینی مزاج اور نہج سلف پر ہونے کے بڑے قائل تھے، بالعموم جماعت کے رفقاء ان سے تبلیغی جلسوں میں شرکت اور رخصت ہونے والی جماعتوں کے لئے دعا کی درخواست کرتے اور وہ بے تکلف اس کو قبول فرماتے، اس کے لئے انھوں نے صحت کے تقاضوں سے بے پروا ہو کر طویل سفر بھی کئے۔

رجحان اور ذوق کی تبدیلی اور عمر کے ساتھ ساتھ سید صاحب کا دار العلوم کے بارے میں ذوق ورجحان بھی خاصہ بدل گیا تھا، اب وہ اس کو محض ایک علمی ادارہ اور پڑھنے پڑھانے اور علوم جدیدہ سے بقدر ضرورت واقفیت کا مرکز سمجھنے پر قانع نہ تھے، دوسرے مختصر وبلیغ الفاظ میں وہ لسان العصر اکبر الہ آبادی کی اس تعریف کو پسند نہیں کرتے تھے، جو انھوں نے فضلائے ندوہ کا امتیاز بیان کرنے کے لئے خود سید صاحب کی نوجوانی میں کی تھی

اور ندوہ ہے زبان ہوشمند

وہ ندوہ کو قلب دردمند، ذہن ارجمند اور زبان ہوشمند، تینوں کا مجموعہ دیکھنا چاہتے تھے، اور اسی ترتیب وتناسب کے ساتھ کہ پہلا مقام قلب دردمند کا ہو، دوسرا ذہن ارجمند کا اور اس کے بعد ان کی ترجمانی کے لئے زبان ہوشمند ہو، ندوہ میں دینی شخصیتوں اور دینی مرکزوں سے جو بیگانگی عرصہ سے چلی آرہی تھی، اس میں کچھ کمی تو خود سید صاحب کے اس جدید تعلق اور رجحان سے پیدا ہوئی جس کا اوپر تذکرہ ہوا اور کچھ کمی مولانا الیاس صاحبؒ کے اس ہفت روزہ قیام سے جو ندوہ ہی کے مہمان خانہ میں تھا، اور جس میں انھوں نے اس ماحول کو پورے طور پر اپنے سوز دروں اور اپنی روح اور اپنے جسم کی بے تابی سے بےچین اور متحرک رکھا، لیکن سید صاحب اس سے زیادہ چاہتے تھے، ان کی خواہش تھی کہ اب ندوہ کے

فرزند اور دارالعلوم کے طلباء ادب اور تاریخ ہی کو اپنی کوششوں اور فتوحات کا نشانہ اور اپنے سفر کی آخر منزل نہ سمجھیں، وہ دوبارہ اقبال کی زبان میں گویا تھے:

خودی کی یہ ہے منزل اولیں
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

وہ چاہتے تھے کہ فرزندانِ ندوہ کے سامنے وہی شخصیتیں قابل تقلید اور منتہائے کمال نہ ہوں جو علم وادب اور تاریخ کے لئے ایک رمز وعلامت بن گئی ہیں، بلکہ وہ اپنی تحریک کے داعیوں، درس گاہ کے بانیوں میں سے ان لوگوں کو بھی مثالی نمونہ کے طور پر سامنے رکھیں اور ان کی پیروی کی کوشش کریں جو اپنی دینداری اور صلاح اور اپنی دینی ودنیوی اور علمی وادبی جامعیت میں بھی امتیاز خاص کے مالک تھے، مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ دارالعلوم کی عمارت کے عقبی حصہ سے نکلتے ہوئے فرمایا کہ مولوی علی صاحب ہر جماعت اور ہر دانش گاہ کے لئے ایک آئیڈیل ہوتا ہے، وہ اس کے تمام افراد کے دل ودماغ اور تخیل پر چھایا ہوا ہوتا ہے، اس سے ان کو اپنی زندگی کے لئے پیام اور اپنے کاموں کے لئے جوش ونشاط حاصل ہوتا ہے، میرے نزدیک دارالعلوم کے لئے آئیڈیل چار شخصیتیں ہوسکتی ہیں، مولانا محمد علی مونگیریؒ، مولانا شبلی نعمانیؒ، آپ کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحیؒ اور نواب سید علی حسن خاںؒ کہ یہ سب علم ودین کے مختلف شعبوں پر حاوی تھے، اوران سے مل کر ایک جامعیت پیدا ہوتی ہے۔

سید صاحب کے ان نئے رجحانات نے طلباء میں وہ مقبولیت اور کامیابی حاصل نہیں کی جو ان کے مقام کے لحاظ سے متوقع تھی بلکہ اس سے ایک ذہنی کشمکش پیدا ہوئی، اس کا نقطۂ عروج وارتقاء طلباء کی وہ اسٹرائک تھی جو ۱۹۴۳ء میں پیش آئی، آغاز اس کا اگرچہ کچھ انتظامی معاملات سے ہوا، لیکن اس کے اندر بے اطمینانی اور کشمکش کی یہی روح کام کر رہی تھی، اس اسٹرائک کی قیادت ہمارے بعض عزیز شاگرد کر رہے تھے، جو دارالعلوم کے بہترین طلباء تھے، اوران سے ہم نے اور دارالعلوم نے بڑی بڑی توقعات قائم کی تھیں، ان

میں سب سے زیادہ نمایاں میرے عزیز ترین شاگرد علی احمد کیانی تھے، مجھے اپنے دس سال کے تدریسی دور میں اوراس کے بعد بھی جب میں نے بحیثیت نائب معتمد اور معتمد کے کام کیا، اس نوجوان سے زیادہ ذہین، ذی استعداد، اور سلیم الطبع طالب علم نہیں دیکھا، دوسرے اور تیسرے ہی درجہ سے اس کا یہ حال تھا کہ صرف ونحو کی غلطی اس سے ہونی بہت مشکل تھی، میرے استاد خلیل عرب صاحب نے ایک مرتبہ ان کے امتحان کی کاپی دیکھ کر جب وہ درجہ دوم یا سوم میں پڑھتے تھے، یہ کہا کہ یہ کاپیاں مجھے دے دو اور جتنا کہو میں ندوہ کے لئے چندہ لے آؤں، چوتھے، پانچویں درجہ میں پہنچ کر وہ برجستہ عربی میں تقریر کرنے لگے تھے، حافظہ اس بلا کا تھا کہ ہزاروں شعر اقبالؒ واکبرؒ اور ظفر علی خاںؒ کے نوک زبان تھے، میرے بعض عربی مضامین کا ترجمہ بھی کیا تھا، وہ اسٹرائک کے بعد جب کراچی گئے تو اپنی نو عمری کے باوجود کراچی کی علمی مجلسوں میں علامہ کیانی کے نام سے مشہور ہوئے، جیسا کہ طلباء کے ہنگاموں میں ہوا کرتا ہے، وہ طوعاً وکرہاً طلباء کے نمائندہ اور اسٹرائک کے قائد بن گئے، ان کے سب استادوں کو اور بالخصوص مجھے ان کے اس ہنگامہ میں نہ صرف شریک ہونے بلکہ قائد بننے سے سخت قلق تھا، زیادہ تر اس وجہ سے کہ اسٹرئک کی زد سید صاحب کی شخصیت اوران کی معتمدی پر پڑتی تھی، بلکہ وہ اس وقت ندوہ کے حقیقی مربی اور سرپرست اور اس کے لئے سینہ سپر تھے، سید صاحب کے دل کو بھی اس ہنگامہ سے بڑی چوٹ لگی، ان کے دل میں ندوہ کی خدمت اور طلباء کی تربیت کی بڑی بڑی امنگیں تھیں، ان کو اس سے اپنی تمناؤں کا خون اور اپنی کوششوں کی ناکامی کا منظر نظر آیا اور بہت دل شکستہ اور افسردہ ہوگئے، انھیں دونوں میں علی احمد مرحوم پر جنوں کا دورہ پڑا اور حالت یہاں تک پہنچی کہ ان کو گھر والوں نے رسیوں سے باندھ دیا اور ان کے بھائی میرے برادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مرحوم کو ان کو دکھانے کے لئے گھر لے گئے، میں بھی خصوصی تعلق کی بنا پر ساتھ ہوگیا، مرحوم کو جب رسیوں سے باندھا ہوا دیکھا تو آنکھوں میں آنسو آگئے کہ یہ نوجوان جو اپنی ذکاوت اور صحیح الدماغی میں اپنے ساتھیوں کے لئے بھی قابل رشک تھا، اس حالت

میں ہے، بھائی صاحب نے نسخہ لکھا اور تشریف لے آئے، سید صاحب اس زمانہ میں اتنے دل برداشتہ تھے کہ دارالعلوم میں قیام بھی نہیں فرمایا، ہمارے ہی گھر میں مقیم تھے، میں نے ایک مرتبہ تنہائی میں موقع پا کر عرض کیا کہ میرا خیال ہے کہ علی احمد کی زبان سے آپ کی شان میں کوئی لفظ نکل گیا، اس طوفان بے تمیزی میں کچھ بعید نہیں کہ ان پر جذباتیت غالب آئی ہو، اور ناگفتنی کا ارتکاب کیا ہو، حدیث شریف میں آتا ہے "من آذیٰ لي وليًا فقد آذنته بالحرب" اور آپ تو ان کے محسن و مربی بھی تھے، سید صاحب نے اس کے جواب میں تواضع اور فروتنی کے الفاظ فرمائے اور کہا کہ کیا چیز ہوں، میں نے دوبارہ عرض کیا اور دعا کی درخواست کی، سید صاحب نے اس پر سکوت فرمایا، دوسرے یا تیسرے دن مجھ سے فرمایا کہ مولوی علی صاحب میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کر دی، اب اس واقعہ کو سید صاحب کی کرامت سمجھا جائے یا اس کو کسی اور بات پر محمول کیا جائے کہ عزیز موصوف بالکل اچھے ہو گئے اور جہاں تک مجھے علم ہے یہ دورہ پھر کبھی نہیں پڑا، افسوس ہے کہ یہ شعلۂ مستعجل بالکل نوعمری میں ۱۹۵۰ء میں گل ہو گیا

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

سید صاحب بعض خاص اسباب کی بنا پر جولائی ۱۹۴۶ء میں قاضی ریاست امیر دارالعلوم احمدیہ اور دینی امور تعلیم کے مشیر ہو کر ریاست بھوپال چلے گئے اور اکتوبر ۱۹۴۹ء تک وہیں رہے، انھوں نے بھوپال سے بھی دارالعلوم کے ساتھ تعلق قائم رکھا، دارالعلوم کی حیثیت ایک فرزند کی سی تھی، اور وہ اس کی یاد کو کسی وقت بھی دل سے جدا نہ کر سکتے تھے، شفقت ناموں سے کارکنانِ ندوہ کا حوصلہ بڑھاتے اور تعلیمی رہنمائی فرماتے، یہاں پر بھوپال کا ایک مکتوب جو بعض حیثیتوں سے بڑی اہمیت رکھتا ہے، اور ان کے صحیح جذبات وخیالات کا آئینہ دار ہے، اور جس میں زندگی کی بعض تلخ حقیقتیں اور ناخوشگوار تجربے بھی اشارۃً آ گئے ہیں، درج کیا جاتا ہے، اس مکتوب پر ۱۸؍اپریل ۱۹۴۸ء کی تاریخ درج ہے۔

بھوپال

عزیزم گرامی - وفقکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی واپسی (۱) کا حال جب معلوم ہوا آپ کو خط لکھنے کو دل چاہ رہا تھا، مگر یہاں کے لیل ونہار ایسے ہیں جن میں اصل سے زیادہ فروع پر وقت صرف ہوتا ہے، میں یہاں بڑے جذبات کے ساتھ آیا تھا، ہمیشہ سے حسرت تھی کہ ندوہ میں گداگری کر کے کہاں سے روپیہ لایا جائے کہ اصل کام کا موقع ملے، کاش کوئی ریاست یا سلطنت ادھر متوجہ ہو اور سرمایہ سے بےفکر کر دے کہ اصل کام پر قوت صرف ہو، مگر یہاں آ کر ڈیڑھ برس میں تجربہ ہو گیا کہ کاروبار سلطنت کے زیر سایہ یہ مقصد کسی طرح پورا نہیں ہو سکتا، اس لئے میں خود چاہتا ہوں کہ جلد از جلد یہاں سے اپنا بستر اٹھا لوں، تذبذب ہے تو اس قدر کہ ابھی اٹھا لیا جائے یا موسم حج تک وسعت دی جائے۔

یہ تو اپنے یہاں کے قیام کا حال ہے، اپنی قوت جسمانی اب اس قابل نہیں کہ پورے ولولہ اور جوش سے کام کیا جائے، اسی لئے میں نے ....کو لگایا تھا کہ ان کی طاقت اور میرا دماغ کام کرے، مگر آپ کی غیر موجودگی میں اساتذہ کی باہمی کشاکش نے ان کے خلاف محاذ قائم کیا، میں نے کہا بہتر ہے اب آپ میں سے کوئی صاحب ہوں چنانچہ.......ہوئے اب معلوم ہوا کہ ان سے بھی نہیں بنتی

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما

سید صاحب نے یہ سمجھ کر کہ بھوپال میں رہ کر وہ دارالعلوم کی تعلیمی نگرانی پوری

طرح نہیں کر سکیں گے مجھے نائب معتمد بنائے جانے کی تحریک کی جس کو مجلس دار العلوم نے ۷/جنوری ۱۹۴۹ء کو منظور کیا اور میں نے ان کی رہنمائی اور سرپرستی میں کام شروع کیا، اہم امور میں ان کی طرف رجوع کرتا تھا اور وہ بھی از راہِ شفقت بزرگانہ پورا اعتماد فرماتے تھے۔ یہاں پر ایک مکتوب درج کیا جاتا ہے جس میں بعض اہم تاریخی اشارات آ گئے ہیں جن سے ان کی سوانح کی ترتیب میں بڑا کام لیا جا سکتا ہے، اور اس ذہنی کشمکش کا بھی کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے، جو سید صاحب کو اپنی علمی و دینی سرگرمیوں کے میدان کے انتخاب میں درپیش تھی، یہ مکتوب ۲۵/جون ۱۹۴۹ء کا ہے، اور وہ سید صاحب کے وطن دیسنہ سے لکھا گیا ہے، جہاں سید صاحب اس وقت مقیم تھے۔

دیسنہ۔ پٹنہ ۵/جون ۱۹۴۹ء

اخی العزیز رفع اللہ شانکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، خط میں دو باتیں تھیں، ایک میرے قیام کے متعلق دوسرے نصاب کے متعلق، میں منتظر رہا کہ آپ نصاب کا مسودہ مجھے بھیج رہے ہیں یا بھیجا ہے مگر وہ اب تک مجھے نہیں ملا، اب انتظار کے بعد جواباً لکھتا ہوں کہ میرا دور اور میرا عصر عمل گزر چکا "لکل عصر رجال" اب اس دور کے لئے آپ کا خاکہ موزوں ہوگا، مجھے چونکہ آپ پر اعتبار و اعتماد ہے اس لئے دیکھے بغیر میں اس کو پسند کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ نافع فرمائے۔

جائے قیام سے متعلق ہنوز فیصلہ نہ ہو سکا، میں نے اعظم گڑھ دماغی سکون، ذہنی امن و امان اور باہمی تصادم سے بچنے کے لئے چھوڑا اور فوری طور پر سے حیدرآباد کی تعلیمی خدمات کے بجائے بھوپال کی مذہبی خدمات قبول کی، اگرچہ ریاست کے انقلاب کے

دست و برد سے اب تک میری جگہ وہاں محفوظ ہے، گو اصل رائے تو وہاں پہنچ کر ہی معلوم ہوگی، مگر چونکہ نفسیاتی طور سے اب اسلامی ریاست کا تصور نہیں رہا، اس لئے سمجھتا ہوں کہ وہاں اب دل نہیں لگے گا، اور بہتوں کا خیال ہے کہ مجھے اب وہاں سے ہٹنا پڑے گا، یہی وجہ ہے کہ بعض گوشوں سے میری طلب جاری ہے ایک ہمسایہ (۲) ملک کی طرف سے گفتہ آید در حدیث دیگراں، کے عنوان سے بعض مذہبی امور و آئین شرع کے سلسلہ میں مجھے یاد کیا جا رہا ہے، اور اس خدمت کے لئے کہ دینی و دنیاوی عام تعلیم میں کیوں کر انقلاب برپا کیا جائے، اور کیا اصلاحی تجویزیں پیش کی جائیں، میرا نام لیا جا رہا ہے، لیکن ابھی میری طبیعت یکسو نہیں ہوئی ہے۔

وطن آیا تھا کہ گوشۂ عزلت کی زندگی نبھ سکتی ہے یا نہیں مگر بعض بزرگوں کی تبرک، جائدادوں اور اعزا کے عناد و خلش نے یہاں بھی مطمئن ہونے نہیں دیا۔

دار العلوم ندوہ کی خدمت ہمیشہ سے زندگی کا مقصد رہا، اور اب بھی اس کی خدمت سے انکار نہیں، مگر ندوہ کے لئے جو اس وقت سب سے ضروری چیز مالی امداد ہے یعنی چندوں کا جمع کرنا، میں اس کے لئے بیکار ہوں، پھر میری اقتصادی اور مع اہل و عیال کی قیامی شکل کا حل وہاں کوئی مجھے نظر نہیں آتا۔

غرض حالات نے قوت فیصلہ کو معطل کر رکھا ہے، اور راستہ صاف دکھائی نہیں دیتا، سردست حج کا سفر پیش نظر ہے، اس کے انجام کے بعد شاید کوئی راہ انشراح قلب کے ساتھ نظر آئے۔

آج ۱۵/جون ہے، ۱۷/جون ....کو یہاں سے روانہ

ہونا ہے، لکھنؤ اور اناؤ (۳) کی راہ سے بھوپال قبل رمضان تک پہنچنے کا خیال ہے، امید ہے کہ بعض الجھنیں وہاں پہنچ کر دور ہوں گی، اگر آپ بھوپال کے پتہ سے مجھے مشوروں سے مستفید کر سکتے ہوں تو شکریہ۔

والسلام

سید سلیمان

جیسا کہ اس خط میں اشارہ کیا گیا ہے، سید صاحب بھوپال کچھ دن قیام کرکے حج کے لئے روانہ ہوگئے، ان کا یہ دوسرا یا تیسرا حج تھا، جو ۱۳۶۸ھ، ۱۹۴۹ء میں ہوا، حجاز کی تبلیغی جماعت نے سید صاحب کے قیام سے فائدہ اٹھایا اور ان کی ترجمانی اور تائید سے حجاز سعودی عرب کے علمی و دینی حلقوں نیز باہر سے آئے ہوئے اہل علم حجاج میں اس دعوت کی وقعت اور وزن پیدا ہوا، سید صاحب نے حسب معمول اس خدمت سے دریغ نہیں فرمایا اور مجالس تبلیغ میں شرکت کرکے وہاں کے رفقائے جماعت اور کارکنوں کی ہمت افزائی، واپسی پر میں نے شاید کوئی عریضہ لکھا جس میں ان کی اس سرپرستی اور ہمت افزائی کا مناسب الفاظ میں تذکرہ تھا، سید صاحب نے اس کے جواب میں جو مکتوب تحریر فرمایا وہ یہاں درج کیا جاتا ہے:

بھوپال ۲۴؍جنوری ۱۹۵۰ء

عزیز محترم۔ وفقکم اللّٰہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عیادت نامہ ملا، شکر گزار ہوں الحمدللہ بخیر و عافیت ہوں، ضعف بھی دور ہو رہا ہے۔

میری شرکت جو جماعت تبلیغ کے کاموں میں حجاز میں ہوئی ہے، آپ صاحبوں نے بڑی اہمیت دی، مولانا یوسف صاحب اور

مولانا زکریا صاحب تک نے اس کے لئے شکریے ادا کئے، اور دعائیں دیں، دعائیں تو ٹھیک ہیں کہ میں ان کا محتاج ہوں، مگر شکریہ کس بات کا؟ کوئی نماز پڑھے تو اس کا شکریہ ادا کیا جائے گا؟ میں نے اس لئے لکھا کہ بعض صاحبوں نے ایسا کیا ہے۔

بلاشبہ جو چیز آپ کے لئے آثار سعادت میں سے ہے وہ یہ ہے کہ بحمداللہ تعالیٰ کہ دو سال گزرنے کے بعد آپ کے نام اور کام کو میں نے زندہ پایا بلکہ آپ کی نسبت سے مجھے بزرگی ملتی رہی۔

آپ کی ملاقات اور ندوہ کے حالات سننے کا مشتاق ہوں، اب تو آپ بھوپال کے لئے پابہ رکاب ہوں گے۔

والسلام

سید سلیمان

سید صاحب کو اس سفر حج میں پاکستان کی بعض نہایت ذمہ دار شخصیتوں کی طرف سے بعض موقر شخصیتوں کے ذریعہ اطلاع پہنچی اور ان کو وہاں خدمت اسلام کے نہایت وسیع امکانات اور اس نوخیز اسلامی مملکت کی اس رہنمائی کی توقعات دلائی گئیں جو سید صاحب سے بہتر کوئی اور عالم دین انجام نہیں دے سکتا تھا، پاکستان میں اسلامی آئین کی ترتیب کا مسئلہ بھی درپیش تھا، اور وہاں کی تعلیم کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا معاملہ بھی زیر غور تھا، اور ان دونوں بنیادی مسائل سے سید صاحب کو ذاتی لگاؤ اور طبعی ذوق تھا، لیکن وہ عرصہ تک اپنی طبیعت کی کمزوری اور مسئلہ کی نزاکت کی بنا پر پاکستان جانے کا فیصلہ نہ کرسکے، بالآخر اس بات کے لئے ایک مناسب تقریب پیدا ہوگئی کہ وہ وہاں کے حالات کو بچشم خود دیکھ لیں، وہاں کے ذمہ داروں سے ملاقات اور ان کے خیالات سے واقف ہونے کا موقع ملے اور پھر وہ اطمینان سے کوئی رائے قائم کریں، جون ۱۹۵۰ء میں دہلی سے معزز ہندوستانی مسلمانوں کا ایک خیر سگالی کا وفد روانہ ہونے والا تھا، جس میں مولانا

حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی پیش پیش تھے، سید صاحب سے بھی اس وفد میں شرکت کی درخواست کی گئی اور انھوں نے غالبًا انھیں مصالح کی بنا پر منظور کیا، وہ ۱۴؍جون ۱۹۵۰ء کو صبح کراچی پہنچے، سید صاحب کی واپسی طے شدہ تھی، اور اس بارے میں ان کے ذہن میں کوئی تردد نہ تھا، لیکن وہاں کے قریبی اعزا نے جن میں ان کی صاحبزادی، داماد اور اہل خاندان بھی شامل تھے، ان کی اس غیر متوقع آمد سے فائدہ اٹھایا اور ایسے حالات پیدا کردیئے کہ سید صاحب کے لئے واپسی ناممکن ہوگئی، سید صاحب کو اپنے عزیزوں اور دوست واحباب کے اصرار کو رد کردینے اور اپنے فیصلہ پر سختی سے قائم رہنے کی پہلے سے عادت نہ تھی اور اب تو طبیعت اور زیادہ کمزور ہوگئی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے رخت سفر کھول دیا اور پاکستان کے قیام کا فیصلہ کرلیا، اس سے ان کے ان تمام نیاز مندوں، قدردانوں اور احباب کو ذہنی صدمہ پیش آیا جو ہندوستان میں ان کے قیام کی ضرورت سمجھتے تھے، اور ہندوستان کو اس علم وفضل کے خزانہ سے محروم ہونے کو ایک ملی حادثہ تصور کرتے تھے، لیکن جو کچھ ہونا تھا وہ ہوگیا، اور اب کفِ افسوس ملنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، اب تو سب کی یہ دعائیں تھیں کہ یہ نوخیز اسلامی مملکت جس سے دنیا کے بہت سے مسلمانوں کی بڑی بڑی امیدیں قائم تھیں اور خوش قسمتی یا بد قسمتی سے اسلامی تعلیمات اور آئینِ اسلامی کی زندگی اور معاشرہ کی رہنمائی کرسکنے کی صلاحیت کا ایک نازک امتحان اور سوالیہ نشان بن گیا تھا، سید صاحب کی ذات سے ان کے کمالات سے اور ان کے وسیع تجربات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے، لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوسکا، وہ توقعات پوری نہیں ہوئیں اور ان کی ذات سے شایانِ شان فائدہ نہیں اٹھایا گیا، ان کو وہاں کے قیام میں بہت ناخوشگوار حالات اور بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، جن کی یاد ان کے تمام نیاز مندوں کے لئے قلق کا موجب بن گئی، یہاں ان اسباب اور تفصیلات سے بحث نہیں، اس میں کیا کیا مجبوریاں اور کون کون سے اتفاقات پیش آئے، اس کی ذمہ داری کس طبقہ پر ہے، اس میں کہاں تک سید صاحب کے طبعی ضعف اور اضمحلال کو دخل ہے، اس کا فیصلہ کرنا مشکل اور ان

سطور کے لکھنے والے کے موضوع سے خارج ہے۔

مارچ ۱۹۵۳ء میں سید صاحب ایک بار (اور آخری بار) ہندوستان تشریف لائے، سید صاحب ڈھاکہ کی ہسٹری کانگریس کی صدارت کے لئے تشریف لے گئے تھے، جو اسی مہینہ کی کسی تاریخ کو ہوئی تھی، وہاں انھوں نے اپنا وہ فاضلانہ اور فکر انگیز خطبۂ صدارت پڑھا جس میں بنگالی مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ بنگالی اسی طرح فارسی رسم الخط میں لکھیں جیسے وہ انگریزوں کے دور سے پہلے لکھی جاتی تھی، سید صاحب نے ثابت کیا کہ یہ تبدیلی ایک گہری سازش کے ماتحت ہوئی اور اس تبدیلی نے بنگالیوں کو اسلامی ثقافت اور اسلامی تہذیب سے بہت دور کردیا، اب بیگانگی کی اس خلیج کو دور کرنے کے لئے جو بنگالی مسلمانوں اور ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں میں پڑگئی ہے، یہی صورت ہے کہ بنگالی فارسی رسم الخط اختیار کریں، ظاہر ہے کہ یہ مشورہ بڑا مخلصانہ اور انقلاب انگیز تھا، اور اس میں وہ فراست اور دور بینی جھلک رہی تھی، جس کو اقبال نے اس شعر میں ادا کیا ہے

ولے با من بگو آں دیدہ ور کیست
کہ خارے دید واحوال چمن گفت

اور جس کی تصدیق ان افسوسناک واقعات نے کی جو ۱۹۷۱ء کے اواخر اور ۱۹۷۲ء کے اوائل میں پیش آئے اور جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی کثیر آبادی کا یہ ملک پاکستان سے علاحدہ ہوگیا۔

بنگالیوں نے بالخصوص یونیورسٹی اور کالج کے طلباء نے اس مخلصانہ مشورہ کا جس طرح استقبال کیا، وہ تاریخ میں ایک افسوسناک واقعہ کی طرح ہمیشہ یادگار رہے گا، وہ اس طوفان کی خبر دیتا تھا، جو خون برساتا ہوا اور پورے ملک کو زیروزبر کرتا ہوا سروں پر سے گزر گیا، طلباء اور نوجوانوں نے اس فاضل یگانہ اور پیر کہن سال پر جو ملت اور اسلامی علم وثقافت کی آبرو تھا، بے تحاشہ سنگ باری شروع کردی، ڈاکٹر محمد حسین خاں صاحب اور ان کے چند رفقاء نے سید صاحب کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور کسی نہ کسی طرح انھیں موٹر پر

سوار کرایا اور کھڑکیاں بند کردیں، اس طرح ان کا جسم محفوظ رہا، لیکن ان کا دل چکنا چور ہوگیا، اس کے بعد ہی وہ ہندوستان آئے، ہم لوگوں نے دیکھا تو وہ بالکل بجھ کر رہ گئے تھے، ان میں کوئی امنگ، شوق اور امید پائی نہیں جاتی تھی، اور کسی مسئلہ سے دلچسپی باقی نہیں رہی تھی، میری فرمائش پر جو وہ بہت کم ٹالتے تھے، انھوں نے دارالعلوم کے طلباء کے سامنے مسجد ہی میں بعد نماز مغرب کچھ دیر تقریر کی جس میں ان کو فقہ کی طرف توجہ کرنے کا مشورہ دیا، لیکن تقریر میں کسی قسم کا جوش اور نشاط نہیں تھا، ایک شب انھوں نے لکھنؤ کے تبلیغی مرکز واقع کچہری روڈ میں گزاری لیکن ان پر سکوت طاری تھا، صبح مولانا عبدالماجد دریابادیؒ جن سے وہ بہت بے تکلف تھے، اور جب وہ سامنے آجاتے تھے، ان کی طبیعت کھل جاتی تھی، اور ادبی نوک جھونک، ضلع جگت اور تفریحی فقرے شروع ہوجاتے تھے، ملنے تشریف لے آئے اور انھوں نے بہت چاہا کہ سید صاحب کھلیں لیکن طبیعت میں بالکل شگفتگی نہ تھی، مولانا محمد اویس صاحب نگرامی ندوی، اور مولانا ابوالعرفان صاحب ندوی کا (جو سید صاحب کے ساتھ اناؤ تک گئے تھے) بیان ہے کہ سید صاحب پورے راستہ خاموش رہے صرف گنگا کا جب پل آیا تو فرمایا کہ کیا یہ گنگا ہے۔

پاکستان پہنچ کر سید صاحب زیادہ دن اس دنیا میں نہیں رہے، ان کو قلب کی شکایت پرانی تھی، مئی ۱۹۴۵ء میں ان پر استسقائے قلبی کا حملہ ہوا تھا، حوادث اور زندگی کے ان تجربوں نے اور زیادہ دل شکستہ اور نیم مردہ کردیا تھا، بالآخر ۱۴؍ربیع الاول ۱۳۷۳ھ (۲۲؍نومبر ۱۹۵۳ء) کو آخر ساعت آپہنچی اور ہم نے ہندوستان میں دفعۃً سنا کہ انھوں نے اس دنیا سے رحلت فرمائی اور رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا وہ ذاتی تعلق، مشاہدات، تجربات اور خطوط کی روشنی میں تھا، اب سید صاحب کے ذات وکمالات کے بعض اہم پہلوؤں پر بہت اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی ہے جو راقم سطور کی نگاہ میں اس کی سیرت اور گوناگوں کمالات کے چوکھٹے میں مرکزی مقام اور نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، اور جن سے ان سطور کا لکھنے والا خاص طور سے متاثر ہوا۔

سید صاحب کی زندگی کا سب سے نمایاں اور ممتاز پہلو طبقۂ علماء میں ان کی جامعیت اور ان کے علوم ومضامین کا تنوع ہے، ان کی ذات اور ان کی علمی زندگی میں قدیم وجدید سے واقفیت، علمی تبحر اور ادبی ذوق، نقاد ومؤرخ کی حقیقت پسندی اور سنجیدگی، ادباء وانشاء پردازوں کی شگفتگی اور حلاوت اور فکر ونظر کا لوچ اور مطالعہ کی وسعت اس طرح جمع ہوگئی تھی، جو شاذ ونادر جمع ہوتی ہے، سید صاحب جس زمانہ کے طالب علم ہیں، اس زمانہ میں جدید وقدیم کے درمیان شدید رقابت تھی، ایک شخص بیک وقت دونوں قلم روؤں سے راہ ورسم نہیں رکھ سکتا تھا، قدیم وجدید نمائندوں کا ابھی ایک جگہ مجتمع ہونا مشکل تھا (اور شاید ندوۃ العلماء کے جلسوں میں وہ پہلی مرتبہ جمع ہوئے تھے) دینی علوم اور ملک کی زبان وادب کے درمیان بھی سرحدیں قائم ہوگئی تھیں، اور ان کو پار کرنا بڑی جرأت کا کام تھا، وہ دور جس نے نذیر احمد، حالی وشبلی جیسے عالم اور صاحب طرز انشاء پرداز پیدا کئے تھے ختم ہو رہا تھا، اب یک فنی علماء کا دور تھا، جو ادب وشاعری کو ثقافت کے خلاف سمجھتے تھے، ایسے بھی بہت سے لوگ تھے، جو جیتی جاگتی زبان اور سلیس وشیریں اردو میں تصنیف کرنا اپنی عالمانہ شان کے خلاف سمجھتے تھے، جغرافیہ وتاریخ سے ناواقفیت علماء کا شعار سمجھا جانے لگا تھا، علوم قدیمہ میں بھی بالعموم مغایرت تھی، جو فقیہ ومحدث ہوتے تھے، وہ ادیب نہیں ہوتے تھے، جو ادیب تھے ان کو علوم دینیہ سے سروکار نہ تھا، مدرس تصنیف وتحریر کے لائق اور مصنف ومقرر تدریس کا اہل نہیں سمجھا جاتا تھا، ندوۃ العلماء کی بنیاد ''جامعیت'' کے تخیل پر تھی، زندگی پر اثر انداز ہونے اور قوم کی دینی رہنمائی کے لئے بھی ضروری تھی کہ ملک کے علمی وادبی رجحانات سے واقفیت اور عملی زندگی میں شرکت ہو، خود ندوۃ العلماء کے منتظمین میں شعر العجم، موازنۂ انیس ودبیر کے مصنف اور اردو کے صاحب طرز انشاء پرداز (مولانا شبلیؒ) تذکرۂ گلِ رعنا کے مصنف (مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ) اور غالب کی سلاست وبرجستگی کی یادگار (مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانیؒ) جیسے علماء وادباء تھے، اس درس گاہ کے سب سے نمایاں اور کامیاب طالب علم مولانا سید سلیمان ندویؒ تھے، جنھوں نے نصف صدی سے زیادہ علماء کی اس قدیم

جامعیت کو زندہ اور نمایاں رکھا، اور دینی و علمی و ادبی حلقوں میں بیک وقت نہ صرف باریاب بلکہ اکثر صدر نشیں رہے، ان کی زندگی اور وہ مختلف ذمہ داریاں جو انھوں نے مختلف وقتوں میں سنبھالیں خود ان کی جامعیت کا ثبوت ہیں، وہ ایک زمانہ میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے استاد ادب اور ''الندوہ'' کے نائب ایڈیٹر نظر آتے ہیں، پھر ''الہلال'' جیسے عہد آفریں صحیفہ کے شریک ادارت اور ''مشہد اکبر'' جیسے زندہ جاوید مقالہ کے مضمون نگار ہیں، جس نے سارے ملک میں جوش و حمیت کی ایک لہر پیدا کر دی تھی، اسی عرصہ میں جب مجلس خلافت مولانا محمد علی کی سرکردگی میں اپنا وفد انگلستان بھیجنا طے کرتی ہے تو اس کی رکنیت اور مسلمانانِ ہند کی دینی نمائندگی کے لئے اس کی نظرِ انتخاب اسی نوجوان عالم پر پڑتی ہے، دفعۃً وہ اپنے مربی و استاد (مولانا شبلیؒ) کا معاون و رفیق نظر آتا ہے، اور ان کے انتقال کے بعد مجلس دار المصنفین کا ناظم و روح رواں اور معارف جیسے بلند پایہ رسالہ کا مدیر اور دار العلوم ندوۃ العلماء کا معتمد تعلیم دکھائی دیتا ہے، مجلس خلافت سلطان ابن سعود کی دعوت پر مؤتمر اسلامی میں شرکت اور مسلمانانِ ہند کے خیالات کی ترجمانی کے لئے ایک وفد مرتب کرتی ہے، تو اس کی قیادت کے لئے اس سے زیادہ موزوں شخص نظر نہیں آتا جو عالم اسلام کے اس نمائندہ و منتخب مجمع میں عربی میں اظہار خیال کی قدرت رکھتا ہو اور مسلمانان ہند کی دینی علمی عظمت کا نقش قائم کر سکے، نادر خاں شاہ افغانستان اپنے ملک کی تعلیم کا ایسا خاکہ اور نظام مرتب کرنا چاہتے ہیں، جو بیک وقت قومی و دینی تقاضوں کو پورا کر سکے، اور دین کے اصول اور عصر حاضر کی ضروریات پر حاوی ہو، اس نازک اور دشوار کام کے لئے ان کی نظر ہندوستان کی تین ہی ہستیوں پر پڑتی ہے، ایک ڈاکٹر سر محمد اقبال دوسرے سر راس مسعود تیسرے مولانا سید سلیمان، پھر اس پورے عرصہ میں ہم ان کو کانگریس کے مخصوص جلسوں میں شرکت کرتے اور خلافت و جمعیۃ العلماء کے سالانہ جلسوں کی صدارت کرتے دیکھتے ہیں، ہر جگہ ان کی رائے کا وزن، ان کی شخصیت کا وقار اور ان کی واقفیت کا اعتراف پاتے ہیں، اسی کے ساتھ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، جامعہ ملیہ، انجمن ترقی اردو، اور ہندوستانی

اکاڈمی ان کے گراں قدر علمی خطبات و مقالات سے مالا مال ہے، پھر ان تمام مصروفیتوں اور سفروں میں ان کے علمی انہماک اور تصنیفی تسلسل میں فرق نہیں آتا اور اسی عرصہ میں ان کی وہ محققانہ کتابیں شائع ہوتی ہیں، جن کو پڑھ کر بالکل اندازہ نہیں ہوتا کہ ان کا مصنف ملک کی سیاسی زندگی میں شریک اور ملک کے انقلابی تقاضوں اور امنگوں کو سمجھنے والا اور ان کا ساتھ دینے والا ہے، پھر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے علمی و ادبی فتوحات پر قانع اور خالص تصنیفی زندگی اور علمی تحقیقات پر راضی نہیں بلکہ زبان ہوشمند، ذہن ارجمند اور فکر بلند کے ساتھ دل دردمند کی دولت سے فیضیاب ہے، اور اپنے زمانہ کے ایک مسلم الثبوت شیخ (مولانا اشرف علی تھانویؒ) کی نسبت و صحبت سے اس شعبہ کی بھی تکمیل چاہتا ہے اور بالآخر قلیل عرصہ میں ان کے اعتماد و استناد سے مشرف ہوتا ہے، پھر ہم زندگی کے آخر دور میں اس ادیب اور مؤرخ کو بھوپال کے مسند قضا پر شرعی مقدمات کا فیصلہ کرتے اور فقہی رائے دیتے پھر دنیا کے ایک بڑے اسلامی جمہوریہ کے دستورِ مملکت کی ترتیب میں دینی رہنمائی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، یہ گوناگوں مشاغل و خدمات سید صاحب کی ہمہ گیر طبیعت اور ان کے علم و ثقافت (کلچر) کے تنوع اور وسعت کا بہترین ثبوت ہیں۔

ان کی تصنیفات پر اجمالی نظر ڈالنے سے بھی یہ حقیقت کھلتی ہے کہ ان کا ذوق و مطالعہ اور ان کی علمی مناسبت کس قدر متنوع واقع ہوئی تھی، ان کی تصنیفات میں ایک طرف سیرت النبیؐ کے چار ضخیم دفتر نظر آتے ہیں (جن کی مثال کسی اسلامی زبان میں نہیں ہے) اور خطبات مدراس جیسا سیرت نبی کا عطر (جس سے بہتر طریقہ پر ابھی تک سیرت کو نہیں پیش کیا گیا) دوسری طرف عرب و ہند کے تعلقات اور عربوں کی جہاز رانی پر ان کے محققانہ مقالات اور عمر خیام پر ان کی ناقدانہ تصنیف ہے، جو ایک بڑے مصنف و محقق کا پورا سرمایۂ زندگی بن سکتا ہے۔

قرآن مجید میں جن ممالک اور شہروں کا ذکر آیا ہے، ان کے جغرافیہ اور تاریخی معلومات پر ان کی ابتدائی تصنیف ''ارض القرآن'' ہے جو ابھی تک اردو میں آخری چیز اور

اس موضوع پر سب سے بڑا ماخذ ہے، پھر ان کی جامعیت کا یہ پہلو تقریباً ان کی ہر تصنیف میں نمایاں ہے کہ وہ علم وادب کا رشتہ کہیں ٹوٹنے نہیں دیتے، کیسا خشک سے خشک مضمون اور خالص عالمی موضوع ہوا، ان کا بہار آفریں قلم اور ان کا فطری ادبی ذوق (جو مولانا شبلیؒ سے ان کو ورثے میں ملا تھا) مضمون کو شگفتہ اور تازہ بنادے گا، اور اس کا ادبی عنصر پڑھنے والے پر کتاب کو بار نہیں ہونے دے گا۔

سیرت النبیؐ میں معجزات کی بحث پڑھیے یا ارض القرآن میں جغرافیائی وتاریخی تحقیقات ہر جگہ آپ کا ادبی حاسہ اپنی غذا پائے گا، اور آپ سے پڑھنے کی سفارش کرے گا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سید صاحب کی تحریر میں مولانا شبلیؒ کی برجستگی وبے ساختگی اور فارسی ترکیب کی چستی نہیں مگر شیرینی وسلاست اور ادبی محاسن پورے پورے موجود ہیں، اور ان کی علمی تصنیفات تک کے بعض ٹکڑے ادبی شہ پارے معلوم ہوتے ہیں، خطبات مدراس کے بعض پیراگراف، سیرت النبیؐ کے بعض صفحات اور معارف کے بہت سے شذرات وہ تحریریں ہیں جن پر ہمارے ادب عالی کو ملکیت کا دعویٰ ہے، نقوش سلیمانی کے بعض نقش ادبی حیثیت سے تعویذ بنا کر رکھے جانے کے قابل ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ میں نے ہندوستان وبیرون ہند کی سیاحت اور ممالک اسلامیہ سے قریبی واقفیت کے سلسلہ میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی جیسا جامع اوصاف اور مولانا سید سلیمان ندوی جیسا جامع فنون اور متنوع الذوق نہیں دیکھا۔

اردو کے علاوہ عربی ادب وانشاء میں ان کا ایک خاص طرز تھا، جس میں کلاسیکل ادب کی پختگی اور صحت اور جدید طرز کی سہولت اور سلاست دونوں شامل تھیں، مولانا حمید الدین فراہی کی کتاب ''امعان'' کا مقدمہ اور عربی رسالہ ''الضیاء'' کا افتتاحی مقالہ بتلا رہے ہیں کہ اگر وہ عربی تحریر وانشاء کا مشغلہ جاری رکھتے تو اس میں بڑا امتیاز پیدا کر سکتے تھے۔

یہاں برسبیل تذکرہ اتنا اور عرض کروں کہ عام طور پر لوگ سید صاحب کو مؤرخ یا ادیب کی حیثیت سے جانتے ہیں خصوصًا علماء کے قدیم حلقہ میں ان کا تعارف اسی سلسلہ

سے ہے لیکن مجھے سید صاحب کی علمی صحبتوں اور ذاتی استفادہ سے معلوم ہوا کہ ان کا امتیازی مضمون قرآن مجید اور علم کلام ہے، میں نے معاصر علماء میں کسی شخص کا مطالعہ قرآن مجید اور علوم قرآن کا اتنا وسیع اور گہرا نہیں پایا، علم کلام اور عقائد پر سید صاحب کی نظر بہت عمیق ووسیع تھی اور ان کو علم کلام کو سلف کے اصول اور کتاب وسنت کی روشنی میں عصر حاضر کے ذہن اور روح کے مطابق پیش کرنے کا خاص ملکہ حاصل تھا، اور یہ غالبًا مولانا حمید الدین فراہی کی طویل صحبت، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی کتابوں کے مطالعہ اور سیرت النبیؐ کی تالیف کے سلسلہ میں طویل غور وفکر کا نتیجہ تھا۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ سید صاحب اپنے علم وتحقیق اور وسعت مطالعہ میں اپنے استاد ومربی مولانا شبلی مرحوم سے بہت آگے بڑھ گئے تھے، نئی نئی کتابوں کی اشاعت، مسلسل غور وفکر اور محنت ومطالعہ کی بنا پر اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں۔

کسی فن میں کامل اور نامور ہونا اور بات ہے، اور اس کا تصنیفی ذوق اور اس میں شغف وانہماک اور بات ہے، اپنی اس مختصر علمی زندگی میں اکثر یہ دیکھا کہ اکثر لوگ خاص ماحول اور خاص اوقات میں، صاحب علم اور صاحب ذوق نظر آتے ہیں، باقی اوقات میں ان میں کوئی علمی دلچسپی، شوق ومطالعہ، جستجو اور کتابی ذوق نظر نہیں آتا، درحقیقت ان میں طالب علمانہ روح نہیں ہوتی، اس بارے میں میں نے دو شخصیتوں کو مستثنیٰ پایا، ایک مولانا انور شاہ کشمیریؒ، دوسرے مولانا سید سلیمان ندویؒ، اول الذکر کو کم دیکھا اور ان کی مجلسوں میں شرکت کا اتفاق ایک ہی دوبار ہوا مگر ان کی مجلسوں کو علمی تذکروں اور تحقیقات وافادات سے معمور پایا، لیکن سید صاحب کو خوب دیکھا، سفر وحضر میں رفاقت رہی اور کئی کئی دن مسلسل ساتھ رہنا ہوا، ان کا علمی ذوق ہر جگہ اور تقریباً ہر وقت قائم رہتا، مطالعہ، غور وفکر، علماء واہل فن سے تبادلۂ خیال اور بحث ونظر کا سلسلہ جاری رہتا، وہ فطرتاً طالب علم تھے اور ان کا اصلی ذوق اور افتاد طبع یہی تھی، مطالعہ ان کی غذا اور ان کا لازمۂ زندگی تھا، بیماری میں بھی ان کا ذہن کام کرتا رہتا تھا، اور نقاہت وضعف کی حالت میں ان کا مطالعہ جاری رہتا،

دیکھنے میں یہ معمولی بات ہے لیکن قدیم وجدید حلقوں میں اب جو علمی بے تعلقی و بے ذوقی بڑھتی جارہی ہے، اس کے پیش نظر کسی زمانہ میں یہ ایک یادگار بات ہوگی۔

سید صاحب میں علمی کام کرنے کا بڑا ولولہ اور اس کی قوت (Energy) تھی، وہ ہر تصنیف کو اس طرح مکمل کرنا چاہتے تھے، اور اسی طرح اس کی طرف متوجہ ہوتے تھے گویا یہ زندگی کی اصلی اور آخری تصنیف ہے، وہ اس کے سلسلہ میں اپنے امکان بھر کوئی کمی نہیں کرتے تھے، اس کے لئے ہزاروں صفحات کا مطالعہ کرتے، معلومات واقتباسات جمع کرتے، پھر مرتب کرتے، اس سے فارغ ہوتے ہی بجائے آرام کرنے کے کوئی دوسرا سلسلہ شروع کردیتے، اور اسی انہاک ونشاط کے ساتھ اس میں مصروف ہوجاتے، اس چیز نے ان کی صحت پر برا اثر ڈالا تھا، ان پر عرصہ سے سن رسیدگی اور ضعف کے آثار شروع ہوچکے تھے، انھوں نے کئی بار مجھے فرمایا کہ تمہارے والد (مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ ناظم ندوۃ العلماء) نے مجھ سے فرمایا تھا کہ

من نکردم شمار حذر بکنید

مجھے تصنیف ومطالعہ نے قبل از وقت بوڑھا اور ضعیف کردیا، تم احتیاط کرنا، فرماتے تھے کہ مجھ سے تو اس وصیت پر عمل نہ ہوسکا، اس یہ امانت تمہارے سپرد کرتا ہوں، واقعہ یہ ہے کہ جو علمی مزاج اور طبیعت وہ لے کر آئے تھے، اس کے بعد ان کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ اپنا علمی انہاک کم کرسکیں، وہ اپنے علمی وتصنیفی کاموں میں برابر مشغول رہے، اور اتنا بڑا تصنیفی ذخیرہ چھوڑا جو ایک پوری جماعت کو مصنف بنانے کے لئے کافی ہے، یورپ وایشیا میں کئی کئی آدمی مل کر زندگی کی تمام راحتوں اور سہولتوں کے ساتھ بعض اوقات اتنا علمی وتصنیفی کام نہیں کرتے جو سید صاحب نے تنہا انجام دیا، تنہا سیرت النبیؐ (جو صرف سیرت کی کتاب نہیں بلکہ اسلامی عقائد واخلاق کا انسائیکلوپیڈیا ہے) ان کی کارکردگی کی صلاحیت اور قوت عمل کا نمونہ ہے، حیات شبلی دیکھنے میں ایک نامور عالم کی شخصی سوانح ہے، مگر حقیقتاً مسلمانوں کی ایک صدی کی دینی، علمی، تہذیبی اور فکری ارتقاء کی تاریخ ہے جس کے بغیر

مسلمانوں کے قومی مزاج اور موجودہ دور کو سمجھنا مشکل ہے، اس میں تقریباً تمام معاصر تحریکات اور اداروں کی سرگزشت بھی آگئی ہے، تنہا اس کتاب میں سید صاحب نے ہزاروں صفحات کا نچوڑ اور بیسوں کتاب کا مواد جمع کردیا ہے۔

اس موقع پر اس کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ سید صاحب فطرتاً مطالعہ وتصنیف اور ذہنی وتعمیری کاموں کے لئے پیدا کئے گئے تھے، اور اسی قسم کا مزاج اور طبیعت لے کر آئے تھے، وہ میدانی اور ہنگامہ خیز زندگی اور سیاسی تحریکات کے لئے موزوں نہ تھے، انھوں نے اپنی ذات اور ملت پر احسان کیا کہ اپنی اصلی طاقت اور زیادہ تر وقت تصنیفی وتعمیری کاموں میں صرف کیا، جب انھوں نے حالات کے دباؤ یا طبیعت کی ہمہ گیری کی وجہ سے اس دائرہ سے قدم نکالا، ان کو یہ محسوس ہوا کہ ان کا یہ میدان نہیں تھا، اسی طرح یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ فطرتاً عوامی مقرر اور اسٹیج کے خطیب نہیں تھے، ان کا اصل جوہر غور وفکر، تلاش وتحقیق اور تصنیف وتالیف تھا، اور اس میں وہ پورے طور پر کامیاب تھے۔

سید صاحب نے جن اساتذہ اور علمی سرپرستوں کی رہنمائی اور جس ماحول میں ذہنی وعلمی تربیت حاصل کی تھی، اس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ ان کی نظر میں وسعت اور ان کی طبیعت میں اعتدال تھا، نہ ان میں بہت سے قدیم علماء کا سا جمود اور گروہی عصبیت تھی، نہ جدید طبقہ کی عجلت وسطحیت اور یورپ کی مرعوبیت تھی، وہ اپنے تعلیمی خیالات سے لے کر فقہی مسلک تک وسیع النظر، وسیع القلب اور معتدل تھے، اگر یہ صفت ان میں نہ ہوتی تو ان کو مولانا محمد علی کی رفاقت، مؤتمر اسلامی کی شرکت، سفر افغانستان، علی گڑھ اور جامعہ ملیہ کے تعلقات ہر جگہ دشواری محسوس ہوتی، یہی نظر کی وسعت اور قلب کی فراخی تھی کہ انھوں نے ہندوستان کی ایک نامور علمی جماعت اور مشہور ادارہ کے سب سے بڑے آدمی ہوتے ہوئے اور اپنے مخصوص تعلیمی واصلاحی خیالات رکھنے کے باوجود مولانا اشرف علی تھانویؒ سے رجوع واستفادہ کیا، اور اس میں ان کو کوئی رکاوٹ محسوس نہیں ہوئی، وسعت نظر کی ایسی مثالیں طبقۂ علماء میں کم ملیں گی۔

آخری چیز جو ان کی پوری زندگی میں نمایاں رہی وہ ان کی طبیعت کی شرافت ومروت تھی وہ بالکل بے آزار اور غیر منتقمانہ طبیعت کے آدمی تھے، ان کے لئے ظالم کے بجائے مظلوم بننا بہت آسان تھا، ان کی یہ صفت اس درجہ تک پہنچی ہوئی تھی جو کمزوری سے تعبیر کی جاتی تھی، ایک ایسی سوسائٹی میں جو اس طرح کی صفات کی قدر کرنے کی عادی نہیں ان کو اپنی اس افتادِ طبع کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی اور اپنی رضامندی کے خلاف بہت سے فیصلے کرنے پڑے، اس طویل زندگی اور وسیع تعلقات میں شاید کوئی ایسا شخص مل سکے جو بیان کرے کہ سید صاحب نے اس کو کبھی نقصان پہنچایا، یا اپنی ذات کا انتقام لیا، میرے سامنے ایک مرتبہ امین آباد میں ایک نوجوان نے سید صاحب سے بطور یادگار ایک منتخب شعر لکھنے کی فرمائش کی، سید صاحب نے خواجہ حافظ کا مشہور شعر لکھا

آسائشِ دوگیتی تفسیر ایں دوحرف است
بادوستاں تلطف با دشمناں مدارا

میرے خیال میں ان کا یہ انتخاب محض اتفاق اور سرسری نہ تھا، یہ ان کا اصول زندگی تھا جس پر وہ ہمیشہ کاربند رہے۔

حواشی

(۱) میری حجاز سے واپسی مراد ہے، میں جون ۱۹۴۷ء سے جنوری ۱۹۴۸ء تک حجاز ہی میں مقیم رہا۔

(۲) جمہوریۂ پاکستان مراد ہے۔

(۳) اناؤ میں اس وقت سید صاحب کے داماد سید حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائز تھے۔

آئی جو ان کی یاد تو آئی چلی گئی

محمد اویس نگرامی ندوی

سید صاحب کے علمی کمالات کے بعد سب سے زیادہ جس چیز نے مجھ کو ان سے متأثر کیا ان کی بے داغ زندگی ہے، قرآن مجید کے درس میں جو کچھ فرماتے تھے، یا سیرت کے صفحات میں جو کچھ لکھتے تھے، بہ قدر طاقت وہمت ان کی زندگی، اس کے مطابق تھی، سید صاحب کے وطن دیسنہ ضلع پٹنہ میں غالباً ڈیڑھ ماہ اور دارالمصنفین میں تقریباً چھ سال میں نے سید صاحب کو خوب دیکھا، ان کی عبادت، ان کے اخلاق اور ان کے معاملات میری نگاہوں کے سامنے ہیں، اس تجربہ کے بعد میرے قلب میں یہ اثر پیدا ہوا کہ ایک مسلمان کی زندگی ایسی شان کی گزرنی چاہئے، اس پوری مدت میں عذر شرعی کے بغیر میں نے سید صاحب کی جماعت چھوٹتے نہیں دیکھا، دارالمصنفین میں تو خیر مسجد گھر سے ملی ہوئی تھی، البتہ دیسنہ کی مسجد سید صاحب کے دولت خانہ سے اچھے خاصے فاصلہ پر تھی، لیکن مئی اور جون کی تپتی ہوئی دھوپ میں بھی سید صاحب ضعف اور پیروی کے باوجود بقیہ اوقات کی طرح ظہر کی نماز کے لئے برابر مسجد تشریف لاتے تھے، اور نماز کے بعد اسی مسجد میں عصر تک قرآن کا درس دیا کرتے تھے۔

حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہونے سے پہلے نوافل کی طرف زیادہ توجہ تو نہ تھی مگر فرائض وسنن اس وقت بھی بڑے سکون وطمانیت سے ادا فرماتے تھے، تراویح میں حتی الامکان میں ان کے پاس کھڑا ہوتا تھا، اچھی طرح معلوم ہے کہ جب امام

صاحب قرأت فرماتے تھے، اس وقت سید صاحب کی پوری توجہ قرآن مجید کے الفاظ اور معانی کی طرف ہوتی تھی، لیکن مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہونے اور اذکار کی کثرت کے بعد تہجد اور دوسرے نوافل کا خاص اہتمام ہوگیا تھا، اور نماز کے اندر ذوق وشوق، خشوع وخضوع اور حضورحق کی کیفیت ہی دوسری ہوگئی تھی، "تعبد اللہ كأنك تراہ" کا سماں کھنچ جاتا تھا، کئی بار ارشاد فرمایا کہ مولوی صاحب، آج کل امام پیچھے کا (یعنی مقتدیوں کا) خیال کرتے ہیں کہ ہماری قرأت سے ان پر کیا اثر پڑتا ہے، آگے کا (یعنی حق تعالیٰ کا) خیال نہیں کرتے ہیں۔

جب میری حاضری دارالمصنفین میں ہوئی اس وقت سے میری درخواست پر روزانہ قرآن مجید کا درس ہوتا تھا، ورنہ ماہ رمضان میں سید صاحب کا سب سے محبوب شغل درس قرآن تھا، یہ درس ظہر کی نماز کے بعد سے عصر تک جاری رہتا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ اور طلباء میں جن کو دلچسپی ہوتی تھی وہ اس میں شرکت کے لئے اعظم گڑھ آتے تھے۔

سید صاحب کو اللہ تعالیٰ نے بہ قدر ضرورت دنیا کی دولت بھی دی تھی، اس لئے وہ باقاعدہ اپنے مال کی زکوٰۃ نکالتے تھے، اور مجھ کو خوب معلوم ہے کہ بہت ہی مخفی طور پر وہ امور خیر میں چھوٹی اور بڑی رقمیں برابر خرچ کرتے رہتے تھے۔

سید صاحب کی مجلس میں کبھی کسی کی غیبت نہیں سنی گئی، زبان سے متانت کے خلاف کوئی لفظ نہیں ادا ہوا، حلم اور وقار ان کا فطری جوہر تھا اور صبر وتحمل کے تو وہ پہاڑ تھے۔

ایک مرتبہ دارالمصنفین کے زمانہ قیام میں بعض معاملات کی وجہ سے میں بیحد شکستہ خاطر تھا، سید صاحب کو اس کا اندازہ تھا، ایک روز مجھ کو اپنے کمرے میں بلایا اور فرمایا کہ انسان کا اپنا ضمیر مطمئن اور معاملہ صاف ہونا چاہئے، کسی کے کہنے سننے سے کیا ہوتا ہے؟ پھر کچھ خطوط نکال کر مرحمت فرمائے اور فرمایا کہ دیکھئے ان خطوط میں مجھ پر کیسے الزامات لگائے گئے ہیں؟ لیکن ان سب کے جواب میں میں نے صبر اور خاموشی کو اختیار کیا ہے، میں

نے ان خطوط کو دیکھا، سید صاحب کی قوت برداشت پر رشک آگیا، اور دل نے بڑی تسکین پائی، تواضع اور فروتنی میں سید صاحب آپ اپنی مثال تھے، چنانچہ "قصد السبیل" مولانا تھانویؒ کا ایک رسالہ ہے جس میں مولانا نے تعلیم سلوک کے سلسلے میں عالم مشغول، عالم غیر مشغول، عامی مشغول، عامی غیر مشغول کے لئے الگ معمولات متعین فرمائے ہیں۔ مولانا تھانویؒ نے سید صاحبؒ کو تحریر فرمایا کہ اس رسالہ میں سے آپ اپنے لئے کوئی معمول متعین فرمالیں، سید صاحب نے عامی مشغول کے معمولات کو اپنے لئے تجویز فرمایا، اور مولانا کو اطلاع دی، مولانا نے ملاحظہ فرمایا کہ سید صاحب نے اپنے لئے عالم کے بجائے عامی کے معمولات تجویز فرمائے ہیں تو تحریر فرمایا کہ اس تواضع سے جی بہت خوش ہوا اب میں اپنی طرف سے آپ کے لئے عالم مشغول کے معمولات تجویز کرتا ہوں۔

جب سید صاحب مولانا تھانویؒ سے بیعت ہوئے تو ملک کے بعض حلقوں میں بڑی برہمی ظاہر کی گئی، یہ وہ لوگ تھے جو سید صاحب کے علوم وکمالات سے تو محبت کرتے تھے مگر نہ تو ان کے مزاج شناس تھے، اور نہ اس راہ کے واقف کار تھے، روزانہ کی ڈاک سے بیسیوں خطوط اس سلسلہ میں شکوہ وشکایت سے بھرے ہوئے آتے تھے، ایک دن سید صاحب کہنے لگے کہ دیکھئے یہ لوگ زبان سے مجھ کو فاضل اور محقق کہتے ہیں مگر درحقیقت مجھ کو بے عقل جانتے ہیں، آخر یہ لوگ اس بات پر کیوں نہیں غور کرتے ہیں کہ اگر ان کے خیال کے مطابق میں واقعی محقق اور علامہ ہوں تو کیا بے وجہ میں نے مولانا تھانویؒ کا دامن تھا؟ ان لوگوں کو سمجھنا چاہئے کہ میں نے اپنے اندر کوئی تو کمی پائی جس کی تکمیل کے لئے وہاں گیا۔

اسی سلسلہ میں ایک دن ارشاد فرمایا کہ مولوی صاحب میں نے سیرت میں نماز، روزہ اور حج کے اسرار، حکم اور مصالح بہت بیان کئے تھے مگر اب تک نماز پڑھنا نہ آیا تھا، روزہ کا لطف نہ حاصل ہوا تھا، یہی وجہ تھی کہ غالباً دو حج کر لینے کے باوجود سید صاحب نے بھوپال کے زمانہ قیام میں پھر حج کے لئے سفر فرمایا تاکہ یہ حج پورے ذوق وشوق اور صحیح

کیفیات کے ساتھ ادا ہو۔

دارالمصنفین کی مسجد میں سید صاحب کے ایک شاگرد مغرب کے بعد یا فجر کے بعد ذکر کیا کرتے تھے، بیعت ہونے سے پیشتر ایک مرتبہ سید صاحب نے ان سے ہنس کر فرمایا کہ آپ اپنا سینہ کیوں خراب کرتے ہیں؟ وہ شاگرد ادب کی بنا پر خاموش رہے، مگر چند دنوں بعد جب خود سید صاحب پر یہ رنگ آیا پھر تو یہ کیفیت تھی کہ صبح وشام، ظہر کے بعد، یہاں تک کہ تصنیف وتالیف کی کمرے سے بھی سید صاحب کے ذکر کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔

سید صاحب کے حلم ووقار اور کثرت فکر کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ سب سے بے تعلق ہو کر بالکل زاہد متقشف ہو گئے تھے، یہ بات بالکل نہ تھی، بیحد شگفتہ مزاج تھے، ایک واقعہ خود سید صاحب صاحب نے نقل فرمایا کہ تھانہ بھون میں قیام تھا، مولانا تھانویؒ نے سید صاحبؒ کو بطور تحفہ کے ایک تسبیح عنایت فرمایا، سید صاحب نے اس سلسلہ میں دو شعر کہے اور خواجہ عزیز الحسن صاحب مرحوم کو سنائے، خواجہ صاحب نے یہ اشعار مولانا کو سنائے اس پر مولانا نے فرمایا کہ ’’اچھا ماشاء اللہ خشک نہیں ہیں، تر ہیں‘‘۔

سید صاحب کے یہاں ریڈیو خریدا گیا اور اس کے لئے عمدہ قسم کا غلاف تیار کیا گیا، خیال ہوا کہ اس غلاف پر کوئی عبارت کاڑھ دی جائے، اب سید صاحب کے حسن مذاق کی داد دیجئے، اس کے لئے آیت کا انتخاب فرماتے ہیں:

’’اَنطقنا اللّٰہ الذی اَنطق کل شیء‘‘،

ایک مرتبہ خطوط کے لئے پیڈ تیار کرائے گئے، سرنام پر چھاپنے کے لئے یہ آیت تجویز فرمائی:

’’اِنہ من سلیمان واِنہ بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم‘‘،

سید صاحب لطف ومزاح کی باتیں بھی خوب کرتے تھے، ایک دن قرآن مجید کے درس میں سید صاحب کی نظر ہم لوگوں کے قرآن مجید کے جزدانوں پر پڑی، برادر مکرم

شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی ایڈیٹر معارف کا قرآن مجید بغیر جزدان کے تھا۔ غالبًا ایک تولیہ میں لپٹا ہوا تھا، برادرم سید صباح الدین صاحب کے قرآن مجید کے جزدان پر کچھ پھول بنے ہوئے تھے، میرا قرآن شریف دو جزدان میں تھا اور اندر کا جزدان ذرا اچھا خاصا پُرتکلف تھا، سید صاحب نے فرمایا دیکھئے آپ تینوں کے جزدان آپ کے موجودہ احوال کی ترجمانی کر رہے ہیں، ہمارے شاہ صاحب بے چارے بغیر بیوی کے ہیں (ان کی اہلیہ کا انتقال ہو چکا تھا) اس لئے قرآن بھی بغیر جزدان کے ہے، صباح الدین صاحب کی شادی کو ذرا عرصہ ہو چکا ہے، اس لئے جزدان تو ہے مگر سادگی ہے، میری طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ مولوی صاحب ابھی نو گرفتاروں میں ہیں اس لئے ماشاء اللہ جزدان بھی رشک چمن بنا ہوا ہے، ہم سب ہنس پڑے۔

مخدومی مولانا عبد السلام صاحب ندوی سید صاحب کے عمر بھر کے رفیق ہیں، کبھی کبھی ان کی زندگی میں خاص کیفیتیں پیدا ہو جاتی ہیں، یہ مولانا کے جوش وخروش کے دن ہوتے ہیں، ہر وقت باغ وبہار بنے رہتے ہیں، سید صاحب جب مولانا کو ان حالات میں دیکھتے تو زیر لب تبسم فرماتے اور یہ مصرع پڑھتے:

ان دنوں جوش جنوں ہے مرے دیوانے کو

سید صاحب کو دارالعلوم ندوۃ العلماء اور دارالمصنفین سے جو وابستگی تھی وہ ظاہر ہے، ایک دن ارشاد فرمایا کہ میں ہر فرض نماز کے بعد اپنے ان دونوں اداروں کے لئے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں اداروں کے کارکنوں کو یکجہتی سے کام کرنے کی توفیق دے۔

آخر دور میں سید صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ یہ دونوں ادارے اپنے بنیادی مقاصد کے سوا کسی اور چیز میں نہ الجھنے پائیں، ایک ندوی عالم جن کو سید صاحب عزیز بھی رکھتے تھے، انہوں نے سید صاحب کی خدمت میں ایک خط لکھا، جس میں انہوں نے اپنے سیاسی ذوق کو ظاہر کیا، سید صاحب نے ان کو بڑے درد کے ساتھ لکھا کہ آپ سیاست کے لئے جان دینا چاہتے ہیں اور افسوس کہ مذہب کے لئے جینا بھی نہیں چاہتے؟

موجودہ دور کے علمی انحطاط سے سید صاحب بے حد رنجیدہ رہا کرتے تھے، ہم لوگوں کو برابر نصیحت فرماتے تھے کہ صرف الفاظ کی بندش کوئی چیز نہیں ہے اصل چیز مغز اور معنویت ہے جس کو حسن ترتیب، سادہ ترکیب اور سہل الفاظ میں پیش کر دیا جائے، مولانا شبلی مرحوم کی یہ بات اکثر سنایا کرتے تھے کہ میں تحریر وتقریر میں مخاطب کے سامنے اس قدر مواد رکھ دیتا ہوں کہ اس کو الفاظ کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ہی نہیں دیتا۔

سید صاحب مضامین یا تصنیف و تالیف میں متقدمین کی کتابوں کے حوالوں کا مشورہ دیا کرتے تھے، سیرۃ النبی جلد اول پر جب نظر ثانی کی خدمت میرے سپرد فرمائی تو ایک موقع پر سیرت حلبیہ کے حوالہ کے بغیر چارہ نظر نہ آیا، سید صاحب نے بہت تردد کے بعد اس کو قبول فرمایا۔

پیرانہ سالی کے باوجود سید صاحب اپنے علمی کاموں میں بیحد محنت کرتے تھے، ہم لوگ تصنیف و تالیف کے اوقات میں تھک کر اپنے کمروں سے باہر نکل جایا کرتے تھے، مگر سید صاحب جس وقت سے تشریف لاتے مسلسل کام کرتے رہتے، تحقیق وتلاش کے سلسلے میں نئے رہبر کو (برادرم شاہ معین الدین صاحب کی اصطلاح میں) سید صاحب کی پیشی میں رہنا پڑتا، مجھ کو اچھی طرح یاد ہے کہ جب یہ سعادت میرے نصیب میں آئی تو یک لخت پانچ پانچ گھنٹے کھڑے کھڑے گزر جاتے تھے مگر پاس ادب سے اشارہ پائے بغیر ہٹنے کی کی ہمت نہ ہوتی تھی، اس صورت حال کا یکایک سید صاحب کو احساس ہوتا تھا اور چپراسی کو آواز دیتے کہ خالق رضا مولوی صاحب کے لئے کرسی لادو۔

سید صاحب کے ضعف و اضمحلال طبع کے باعث سب کی خواہش تھی کہ سید صاحب اب بہت کم کام کریں، ایک بار اس کا خاص اہتمام کیا گیا، موقع پاکر سید صاحب کتب خانہ تشریف لائے، اور میز پر پڑے ہوئے کاغذات کو الٹنے پلٹنے لگے فوراً کتب خانہ سے آدمی آیا کہ اندر بلایا جارہا ہے، سید صاحب صورت واقعہ کو سمجھ گئے، ہنس دیئے، اور فرمایا کہ چور چوری سے گیا، کیا ہیرا پھیری سے بھی گیا؟

اوپر کے واقعہ میں سید صاحب کی اس میز کا ذکر آگیا جس پر وہ تصنیف و تالیف کا کام کیا کرتے تھے، اس تقریب سے ایک خاص واقعہ یاد آگیا۔

اعظم گڑھ میں مسلم لیگ کا جلسہ تھا، مولانا ظفر علی خاں صاحب اس میں شرکت کے لئے لائے تھے، شہر میں ان کا قیام تھا، سید صاحب کی ملاقات کی غرض سے دارالمصنفین تشریف لائے، مگر سید صاحب اعظم گڑھ سے باہر تشریف لے گئے تھے، مولانا ظفر علی صاحب سید صاحب کی میز کے پاس تشریف لے گئے، میز پر رکھے ہوئے سید صاحب کے مضامین اور تصنیفی مسودات دیکھ کر وہ بیحد متاثر ہوئے اور کاغذ پر ایک شعر لکھا اور اس کو میز پر اس طرح رکھ دیا کہ آتے ہی سید صاحب کی نظر اس پر پڑے، شعر یہ تھا:

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

اس عہد کے تمام ممتاز علماء، صلحاء اور قومی رہنماؤں سے سید صاحب کے بڑے مخلصانہ تعلقات تھے، بالخصوص وہ اہل علم کا بیحد احترام فرمایا کرتے تھے، میرے دیسنہ کے زمانہ قیام میں مولانا ابوبکر شیث صاحب مرحوم (ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی) سید صاحب کی ملاقات کی غرض دیسنہ تشریف لائے، اہل دیسنہ کو مولانا ابوبکر شیث مرحوم کے خاندان سے کچھ شاگردی کا تعلق بھی تھا جس کو سید صاحب نے اس وقت ذکر کیا تھا مگر اب یاد نہیں ہے، سید صاحب نے مولانا کے اعزاز و اکرام میں پوری بستی کی بہت پر تکلف دعوت فرمائی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی تقریب منائی گئی ہے۔

اہل علم اور صلحاء سے تو سید صاحب بہت تواضع کے ساتھ ملتے تھے مگر ان کے سوا امراء، یا قومی رہنماؤں سے ملاقات میں وہ عالمانہ وقار کا بہت خیال رکھتے تھے۔

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں مسلم لیگ کا وہ تاریخی اجلاس ہوا تھا، جس میں اس وقت کے شیر بنگال سر فضل الحق کی گرج اور چمک نے دل ہلا دیئے تھے، لکھنؤ کے ایک مشہور تعلیمی ادارہ نے سر فضل الحق کو اپنے یہاں اس نیت سے مدعو کیا کہ آئندہ کسی موقع پر بنگال

میں ان کی وزارت عظمیٰ کے ذریعہ سے اس ادارہ کے لئے روپیہ حاصل کیا جائے، سر فضل الحق آئے۔ اعیان شہر کے سوا صوبہ کے ممتاز لوگ استقبال کے لئے موجود تھے مگر میں نے دیکھا کہ سید صاحب اس مجمع سے ہٹ گئے تھے، سر فضل الحق کی نگاہوں نے خود ہی سید صاحب کو تلاش کرلیا اور انہوں نے آگے بڑھ کر بڑے عقیدتمندانہ لہجہ میں شکوہ کیا کہ مولانا آپ تو مجھ کو بھول گئے؟

علم وعمل کی ان بلندیوں کے باوجود سید صاحب میں قبول حق کا مادہ بہت تھا، اپنی پوری تصنیفی زندگی میں انہوں نے غالبًا چار پانچ مسئلوں میں جمہور امت سے اختلاف کیا تھا (۱) معراج جسمانی (۲) فنائے نار (۳) تصویر، ایک دو مسئلے اور تھے مگر جب اللہ تعالیٰ نے ان پر امر حق کو منکشف فرمایا دیا تو کسی تأمل کے بغیر سید صاحب نے ان مسائل سے رجوع فرمایا اور معارف میں باقاعدہ اس کا اعلان فرمادیا۔

سیرۃ النبی کی پہلی جلد میں بدر کے سلسلہ میں ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سید صاحب کے قلم سے ایسے الفاظ نکل گئے تھے جو نامناسب تھے۔ سید صاحب نے اس جملہ کے موجودہ ایڈیشن میں جس طرح اس پر اظہار معذرت فرمایا ہے وہ دیکھنے کی چیز ہے۔

دارالمصنفین میں سید صاحب حیات شبلی لکھ رہے تھے، اتفاق سے اس زمانہ میں مولانا شبلی مرحوم کے مضمون (مسلمانوں کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہوکر کیوں کر رہنا چاہئے) پر میری نظر پڑی، محسوس ہوا کہ مولانا نے شامی کے جس فقرے پر اپنے اس مضمون کی بنیاد رکھی ہے اس کے صحیح پڑھنے میں ان سے سہو ہوگیا ہے، میں نے سید صاحب کی خدمت میں اپنا خیال ظاہر کیا، سید صاحب نے شامی کو ملاحظہ فرمایا اور جب خود بھی مطمئن ہوگئے تو حیات شبلی میں اس مضمون کی تصحیح کے لئے ایک نوٹ لکھ دیا، جو صفحہ ۶۳۱ و ۶۳۴ پر موجود ہے۔

سید صاحب کے احتیاط کا یہ حال تھا کہ جب حیات شبلی کا مسودہ تیار ہو چکا تو پریس

میں دینے سے پہلے نواب صدر یار جنگ مرحوم اور مخدومی مولانا مسعود علی صاحب مدظلہٗ اور نیز دوسرے متعلق حضرات کو دکھلایا کہ شاید کہیں کوئی غلطی ہوگئی ہو تو اصلاح ہوجائے۔

سید صاحب نے بچوں کے لئے ''رحمت عالم'' تصنیف فرمایا، مگر طباعت سے پہلے اس کو اپنے شاگردوں کے سپرد فرمایا، اور لفظی ومعنوی ہر گرفت کے لئے ان کو پوری آزادی دی، لیکن ظاہر ہے کہ سہو اور سبقت قلم کی اور بات تھی ورنہ اس میں غلطی کا امکان ہی کیا تھا؟

افسوس کہ وقت کم ہے اور سلسلۂ سخن دراز ہوتا جارہا ہے اور بات پر بات یاد پڑتی جارہی ہے، اس لئے اب قصداً قلم کو روکنا پڑتا ہے۔

استاذ مرحوم

(نقوش اور تاثرات)

مولانا مسعود عالم ندویؒ

ٹھیک ٹھیک یاد نہیں پڑتا کہ پہلے پہل نام کب سنا؟ حافظہ پر زور دینے سے اتنا خیال آتا ہے کہ ایک مرتبہ اپنی طالب علمی کے آغاز میں، (غالبًا گیارہ بارہ سال سے زیادہ عمر نہ ہوگی) ایک اہم سبق دوست محمد شمیم دسنوی (۱) کے گھر پہنچا تو دیکھا ایک اردو کتاب پڑھ رہے ہیں، پوچھا کیا پڑھتے ہو؟ بولے تم نہیں جانتے؟ مولوی سلیمان صاحب کی ''سیرۃ النبیؐ'' ہے، یہ ۲۲ء کا ذکر ہے، اس کے کچھ ہی دن بعد ہمارے مدرسہ (۲) میں اردو اخبارات اور رسالوں کا چرچا ہونے لگا، ایک انجمن قائم ہوئی اور رسالے اور اخبار جاری کرائے گئے، اسی سلسلہ میں پہلی مرتبہ رسالہ ''المعارف'' کا نام سننے میں آیا، بڑی ردوکد کے بعد جاری ہوا تو وہ ''المعارف'' کے بجائے ''معارف'' نکلا، سب سے پہلا پرچہ جو ہماری نگاہوں سے گذرا وہ نومبر ۲۵ء کا تھا، اس کا سپید غلاف اب تک نگاہوں کے سامنے ہے، اس میں ایک مقالہ (ہستی باری پر ایک اجمالی مگر غائر نظر) تھا، جو گو ہم نے پڑھا، مگر پلے کچھ نہ پڑا، ایک مضمون شاید مولانا عبدالعزیز میمن کا بھی تھا، وہ بھی ہماری استعداد سے بلند تھا، مگر اس کے باوجود بڑے ذوق وشوق سے رسالے کا حرف حرف پڑھا گیا اور ایڈیٹر کی وقعت وعزت دل میں گھر کرتی گئی، اور دو چار نمبروں کے بعد تو ان کے علم

کا سکہ دلوں پر بیٹھ گیا، یہ تأثر راقم اور اس کے اکثر احباب کا تھا۔

اس کے بعد ''معارف'' کے علاوہ ''مدیر معارف'' کی ایک دو کتابیں اور پڑھیں، ان میں ''خطبات مدراس'' کی یاد تازہ ہے، بڑے ذوق وشوق اور عقیدت کے ساتھ پڑھی گئی، اور مصنف سے ملنے کا خیال دل میں چٹکیاں لینے لگا، پھر قدرت کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ ۲۷ء کے اکتوبر میں مصر کے کچھ عربی رسالے نظر سے گذرے، اور ایک دوست (۳) کی عنایت سے الہلال (مصر) کی متعدد جلدیں مل گئیں، راقم بے سوچے سمجھے ان کی تلاوت میں لگ گیا، ان دنوں ''الہلال'' میں طٰہٰ حسین کے مضامین اکثر شائع ہوتے تھے، یہ نا آشنائے کوچۂ ادب پہلے پہل ان سے بہت متأثر ہوا اور جی میں آنے لگا کہ ''مصر چل کر ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے سامنے زانوئے تلمذ یہ کیجئے۔''

اس خام خیالی میں ایک اور دوست بھی ہم نوا تھے، (۴) انھوں نے تو براہ راست خط وکتابت بھی شروع کردی، راقم نے مولانا سید سلیمان ندوی (یہ اس وقت کی زبان نقل کر رہا ہوں) سے مراسلت کی طرح ڈالی، پہلا خط گھنٹوں کی محنت کے بعد ٹوٹی پھوٹی عربی میں (غالبًا میری زندگی کا یہ پہلا عربی خط تھا) اعظم گڈھ کے پتہ پر لکھا، اتفاق سے مولانا رمضان گذارنے کے لئے دیسنہ آئے ہوئے تھے، جواب وہیں سے ملا اور بہت حوصلہ افزا، مصری درسگاہوں کے متعلق استفسار کے جواب میں ارشاد ہوا، بہتر ہوگا کہ تم سال دو سال کے لئے ندوہ میں داخلہ لے لو، جواب سلیس اور سادہ عربی میں تھا، زبان دل کو لگ گئی، پڑھتے پڑھاتے خط ازبر ہوگیا، اب کیوں چوکتا، دوسرا خط فورًا ہی دیسنہ کے پتہ پر حاضر کیا، اس کا جواب بھی بروقت ملا، اس میں حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ طٰہٰ حسین اور اس کی ذریات پر سخت تنقید بھی تھی، غالبًا راقم نے خط میں اس کی ثناخوانی کی تھی، ساتھ ہی ساتھ یہ خوشخبری تھی ''میں دوسرے شوال کو اعظم گڈھ جارہا ہوں''، بس، پھر کیا تھا، دن گننے لگا، روانگی تو بہر حال بہار شریف ہی کے اسٹیشن سے ہوگی، یہ موقع کیوں ضائع کیا جائے؟ یہ دوسرا مکتوب بھی اسی سہل ممتنع زبان میں تھا، یہ بھی دوستوں کو پڑھتے پڑھاتے یاد ہوگیا اور آج ۲۶؍سال گذرنے

کے بعد بھی یہ دونوں خط اب تک حرف بحرف یاد ہیں، نوجوانی کا شوق اسی کو کہتے ہیں، یہ مارچ ۲۸ء (رمضان ۴۶ھ) کا ذکر ہے۔

۲؍شوال ۴۶ء کو وقت سے پہلے اسٹیشن پہنچ گیا، ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو ایک وجیہ نورانی چہرہ نظر آیا، سفید براق عمامہ، قاعدے کی سلی ہوئی شیروانی، ہاتھ میں ایک خوبصورت چھڑی، اور پاؤں میں گوہ کے چمڑے کا سادہ لیکن نفیس جوتہ، ہونہ ہو، یہی علامہ سید سلیمان ندوی ہیں، یقین تھا، پر کسی سے تصدیق کرلوں تو آگے بڑھوں، حسن اتفاق سے قریب ہی پٹنہ کے شہر کے طبیب حکیم عبدالقیوم صاحب ڈیانوی پر نظر پڑگئی، ان سے ڈرتے ڈرتے اپنے خیال کی تصدیق کی، پھر آگے بڑھ کر سلام ومصافحہ کی سعادت حاصل کی، فرمایا: ''میں نے تمہیں نہیں پہچانا''، عرض کیا: خاکسار کا یہ پہلا موقع ہے، پھر اپنے خطوط کا ذکر کیا، دریافت کیا، کیا پڑھتے ہو، اور کس سے پڑھتے ہو؟ پھر ارشاد ہوا: ''درسی کتابوں کے علاوہ کیا پڑھتے ہو''، الہلال اور دارالہلال کے ہفتہ وار اخباروں کا نام سن کر فرمایا: ''یہ کیا پڑھنے کی چیزیں ہیں؟ مقدمہ ابن خلدون اور المثل السائر (ابن اثیر) پڑھا کرو''، مقدمہ ابن خلدون اور المثل السائر تو اس وقت میرے بس کی نہیں تھیں، پر الہلال کے متعلق مولانا کا ارشاد نہیں بھولا۔

دوسرے دن مدرسہ پہنچا، تو اپنے ہم چشموں کو انٹرویو کی داستان مزہ لے لے کر سنائی، ہمارے مدرسہ کے ادیب مولانا انوارالحق مئوی اعظمی مرحوم دیوبند کے فارغ اور بڑے ذہین آدمی تھے، جدید مصری ادب میں ''الہلال'' کا ان پر گہرا اثر تھا، میں نے جب علامہ ندی کی رائے سنائی تو وہ جھنجھلا کر بولے، ''معارف'' میں بھی ''الہلال'' کے ترجمے کے سوا کیا ہوتا ہے؟ ایک تو علامہ کا علمی رعب، دوسرے معارف پر اپنے استاد کی ناروا تنقد نے مجھے ان سے بدگمان کردیا، آخر تین سال سے میں بھی ''معارف'' پڑھتا ہوں، ''الہلال'' کا ترجمہ کہاں ہوتا ہے؟ مولوی صاحب یقینی تعصب سے کام لے رہے ہیں، یہ خیال میرے دل میں جاگزیں ہوگیا، رسالہ الزہرا بھی قاہرہ سے آنے لگا تھا، ''الہلال''

کے مقابلہ میں راقم اس کا داعی اور ثناخوان بن گیا، انہی دنوں سیرۃ عائشہ (۵) پر الزہراء (۶) میں اس کے پختہ مغز اور صاحب علم ایڈیٹر محبّ الدین خطیب کے قلم سے ایک شاندار ریویو نکلا، اس سے علامہ ندوی کی وقعت دل میں اور بڑھ گئی، اللہ اللہ! مصر کے رسالوں میں ان کی تعریف چھپتی ہے، دوستوں سے کہتا اور اپنے ہونے والے استاذ مخدوم کے گن گایا کرتا۔

آخر یہ عقیدت ومحبت ندوہ لے گئی، اور اس طرح لے گئی کہ وہیں کا ہوکر رہ گیا، پہلی سب نسبتیں معدوم ہوگئیں، پہلی جولائی ۱۹۲۸ء کو لکھنؤ پہنچا، آٹھویں جماعت (جو اس وقت دارالعلوم کی آخری جماعت تھی) میں داخلہ ہوا، اور پورے انہماک کے ساتھ اپنے کام میں لگ گیا، پورا سال تعلیمی انہماک میں گذرا، سید صاحب (۷) قبلہ معتمد تعلیم کی حیثیت سے ہر ماہ تشریف لاتے، عام طور پر نواب علی حسن خاں صاحب طاہر ناظم ندوۃ العلماء کے یہاں قیام ہوتا، ہم لوگ وہاں پابندی کے ساتھ حاضر ہوتے، اور حضرۃ الاستاذ کے متنوع سوالات کا بوجھ سب مل کر برداشت کرتے، سید صاحب طلبہ سے سوال بہت کیا کرتے، اس لئے بعض طالب علم اُن کی خدمت میں حاضر ہونے سے جھجکتے تھے، مگر ہم لوگ، اس شرم وندامت کے باوجود جو معقول جواب نہ دینے پر محسوس ہوتی، برابر حاضر ہوتے اور استفادہ کا موقع کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے، یہ سلسلہ سال بھر جاری رہا، اس دوران میں ایک بات قابل ذکر پیش آئی، سیرۃ النبی جلد دوم میں مولانا شبلیؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف (قبل تحریم) شراب پینے کی نسبت کی ہے، اور کچھ اپنی طرف سے نہیں، بلکہ ابوداؤد کی ایک روایت کی بنا پر، ''خلفائے راشدین'' (مؤلفہ حاجی معین الدین مرحوم) چھپی تو حاشیہ میں سید صاحب قبلہؒ نے اس کی تردید کردی، اس پر ہم لوگوں میں چہ می گوئیاں رہیں، اور آخر عبدالسلام صاحب قدوائی کے مشورہ سے (جو اس وقت ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے) راقم نے سید صاحب کو ایک خط لکھا جس میں اس تردید پر اپنے عدم اطمینان کا اظہار تھا، جواب ڈاک کے بجائے زبانی ملا، اور ان الفاظ میں:

''تو کار زمین رانکو ساختی   کہ با آسمان نیز پرداختی''

اور پھر یہ لطیف فقرہ: ''آخر تمہیں حضرت علیؓ کے خلاف معرکہ آرائی کی ضرورت کیا پڑی تھی؟'' مولانا عبدالودود صاحب جیراج پوری، مدرس دارالعلوم (جو اس وقت سیدصاحب کے ساتھ تھے) بولے: ''جی ہاں! سادات کرام تو طبعاً مائل بہ اہل بیت ہوتے ہی ہیں''، ان فقروں کے بعد پھر تحقیقی طور پر اس روایت کی اصلیت (۸) واضح کی۔

اسی دور کا ایک اور واقعہ بھی نہیں بھولتا، مئوناتھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ عربی مدرسوں کا مرکز ہے، وہیں ایک مدرسہ میں والد ماجد قبلہ بھی مدرس اول تھے، راقم اس مناسبت سے مئو گیا ہوا تھا، انہی دنوں مدرسہ فیض عام (اہل حدیث) اور مدرسہ مفتاح العلوم (حنفی، جس کے صدر مدرس مولانا حبیب الرحمٰن صاحب تھے) میں سالانہ جلسے تھے، سیدصاحب قبلہ دونوں طبقوں کے مرجع تھے، ایک ہی دن صبح وشام دونوں جلسوں کی صدارت کی، مفتاح العلوم کے جلسے میں عاجز بھی ساتھ تھا، نماز کو جاتے ہوئے خادم نے استاذؒ کے جوتے اٹھالئے، استاذؒ نے مسکرا کر تمام حاضرین کے سامنے فرمایا: ''یہ میرا باضابطہ شاگرد نہیں، مگر شاگردی کا حق ادا کررہا ہے''، خادم نے دبی زبان سے عرض کیا آخر شاگرد کی تعریف کیا ہے؟

جولائی ۱۹۲۹ء میں سالانہ امتحان ہوا، اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے خاکسار نے نمایاں کامیابی حاصل کی، اور اپنی جماعت میں اول رہا، سیدصاحب قبلہ نے نتیجہ کے اعلان کے ساتھ حوصلہ افزا نوٹ لکھا، اور والد ماجد (مولانا حکیم محمد عبدالشکور صاحب مدظلہ، مولود ۱۲۹۰ھ) کو خط کے ذریعہ مبارکباد دی، اور تو اور، انہی دنوں مولانا حمیدالدین فراہی مرحوم ومغفور کسی تقریب سے ندوہ تشریف لائے، اور ہم لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو استاذ مرحومؒ نے تعارف کے انداز میں (مولانا فراہی کی طرف مخاطب ہوکر) فرمایا:

''لوگ اس سے (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے) مٹھائی مانگ رہے ہیں، یہ اپنی جماعت میں اول آیا ہے۔''

ان فقروں سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ ہوئی، اور عجیب اتفاق کہ مولانا فراہیؒ کی مجلس میں یہ میری پہلی اور آخری حاضری تھی، مگر اس کی یاد اب تک باقی ہے۔

ستمبر ۱۹۲۹ء اور اس کے بعد کا ذکر ہے، اب میں درجۂ تکمیل ادب کا طالب علم ہوں، یوں تو تکمیل کے پہلے سال میرے باقاعدہ استاذ مولانا عبدالحلیم صدیقی (استاذ تفسیر وادب دارالعلوم ندوۃ العلماء) تھے، لیکن مشورہ سیدصاحب سے ضرور کرتا، اور مراسلت بھی ہوتی، مگر بسا اوقات جواب زبانی ملتا، یہ تحریر لکھنے بیٹھا ہوں تو اس زمانے کی بھولی بسری باتیں یاد آرہی ہیں، ایک آدھ بات تو بیان کرہی دیجائے، راقم اور محمد ناظم صاحب (۹) (جو اس وقت چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے، مگر ادبی استعداد بہت بلند تھی) کو عربی کا جنون تھا، ندوہ میں بعض طلبہ ہماری اصطلاح میں 'شعوبی' یعنی عربی کے مخالف تھے، وہ اردو میں کمال پیدا کرنا ہی اپنا منتہائے نظر سمجھتے تھے، ہماری ان کی کشمکش رہتی تھی، محمد ناظم صاحب اپنی صاحب اپنی ذہانت اور اعلیٰ استعداد کے باوجود عزم کے کمزور ہیں، ان پر کبھی کبھی ''شعوبیوں'' کے طعنے کا اثر ہوجاتا، ایک شام کو ہم لوگ سیدصاحب قبلہ کے ساتھ لال باغ (۱۰) سے موتی محل کے پل کی طرف آرہے تھے کہ محمد ناظم صاحب نے کہا:

''عربی پڑھتے تو ہیں مگر یہاں اس سکّے کی کیا قیمت؟''

سیدصاحب نے یہ سن کر بڑی تسلی دی اور فرمایا:

''میرا بھی یہی خیال تھا مگر جب وفد خلافت ہیں یورپ جانا ہوا، تو یہ عربی کام آئی، اور اس وقت دارالعلوم کی ابتدائی مشق کا فائدہ معلوم ہوا، مولانا محمد علی نہ عربی بول سکتے تھے نہ فرنچ اور عرب ملکوں کے وفود عربی بول سکتے تھے یا فرنچ۔ ایسے تمام اہم موقعوں پر میری عربی کام آئی، پھر دوسری مرتبہ موتمر اسلامی مکہ مکرمہ میں اس مشق نے پورے ہندوستان کی لاج رکھ لی، گھبراؤ نہیں، جو ہر ضائع نہیں ہوتا۔''

کس قدر صائب رائے اور کتنی دوربین نظر تھی؟ آج ندوہ کے وہ طالب علم جو

عربی لکھنے بولنے پر پوری قدرت رکھتے ہیں، ہاتھوں ہاتھ لئے جارہے ہیں، خود محمد ناظم صاحب کو اس کا عملی تجربہ ہورہا ہے، اس سال کا ایک اہم واقعہ طلبۂ ندوہ کی اسٹرائک تھی، (مئی ۱۹۳۰ء)۔ بات معمولی تھی، بڑھ گئی، سید صاحب قبلہؒ نے بڑی کوشش کی، مگر نوعمر اور پرجوش طالب علموں نے ایک نہ مانی، اسٹرائک ناکام رہی، اور جولائی ۱۹۳۰ء میں دارالعلوم کھلتے ہی دھڑا دھڑ معافیاں داخل ہونے لگیں، چھ طالب علم (جن پر قیادت کا الزام تھا) خارج کئے گئے، اور ندوہ کی اصطلاح میں ''ممنوع الادخال'' قرار پائے، ان میں ایک راقم بھی تھا، گو میری حیثیت عام طالب علم کی نہیں رہی تھی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ وارڈ کونسل یا مجلس عمل کا ممبر میں بھی تھا، اس لئے میرے باب میں اسٹاف کی رائے مختلف تھی، اور اسی اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سید صاحب قبلہ نے میرا اخراج منسوخ کرادیا، باقی دوسرے پانچ قارئین کے داخلہ سے بھی حضرۃ الاستاذ کو اختلاف نہیں تھا، اور نواب صاحب بھی تیار تھے، مگر ندوہ کی مجلس انتظامی کے ایک ندوی رکن نے سید صاحب کی نہ چلنے دی، حالانکہ استاذ مرحوم معتمد تعلیم تھے، وہ چاہتے تو اپنے اختیار خاص سے انہیں معاف کردیتے، مگر سید صاحب قبلہ لڑنا نہیں جانتے تھے، اور ان کے بعض رفیقوں نے اُن کی اس نرم مزاجی سے ہمیشہ ناروا فائدہ اٹھایا، جس کا اثر اُن کی صحت پر بھی پڑتا رہا۔

تکمیل ادب کے دوسرے سال ہماری زندگی بدل گئی، ندوہ میں بہار کا موسم آیا، یعنی اگست ۱۹۳۰ء میں استاذ محترم شیخ تقی الدین محمد بن عبدالقادر الہلالی المغربی تشریف لائے، ندوہ کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک چوٹی کے عرب ادیب و زبان داں نے کرسی تدریس کو زینت دی۔ بس پھر کیا تھا، سارے مشاغل بالائے طاق رکھ کر زبان وادب کی تحصیل میں لگ گیا، علی میاں (۱۱) (جنہیں خلیل عرب (۱۲) صاحب کی صحبت میں زبان کا خاصا ذوق پیدا ہوچکا تھا، اور اب زیادہ تر حدیث کے درس میں مشغول رہا کرتے تھے) بھی از سرِ نو نحو وادب کی تجدید و تکمیل میں لگ گئے، اکثر ہم لوگوں کا ساتھ رہتا، ہلالی صاحب بھی ہم لوگوں سے بہت خوش تھے، ہمارے علاوہ محمد ناظم صاحب اور

ابواللیث (۱۳) صاحب کا بھی ہلالی صاحب کے خاص شاگردوں میں شمار تھا، سید صاحب قبلہ جب بھی تشریف لاتے ہلالی صاحب سے ملتے، اور ان کا بڑا احترام کرتے، ہلالی صاحب ہم لوگوں کی بہت تعریف کرتے، اور بار بار زور دیتے: ''ان لوگوں سے ندوہ میں تدریس کا کام لیا جائے''۔

باتیں بہت ہیں، اس دوران میں ایک اور دلچسپ بات عرض کردی جائے تو اچھا ہو، ہلالی صاحب کی آمد سے پہلے راقم یکسو نہیں تھا، طب کی تحصیل کا خیال بھی بار بار آتا، علی گڑھ سے دستور العمل منگوا کر تیاری بھی شروع کردی تھی، سید صاحب قبلہ سے مشورہ کیا تو کچھ دیر خاموش رہے، پھر فرمایا:

''جو چاہو کرو، مگر طالب علمی کو پیشہ نہ بنانا۔''

ستمبر ۱۹۳۱ء میں تکمیل ادب کا امتحان ہوا، تاثیر الاسلام فی الشعر العربی (اسلام کے اثرات عربی شاعری پر) اطروحہ (Thesis) کا عنوان تھا، اطروحہ منظور ہوا، اور راقم نے وطن کی راہ لی، اور انگریزی زبان کی تحصیل و تکمیل میں لگ گیا، ادھر ہلالی صاحب نے سید صاحب کو ایک عربی ماہنامہ نکالنے کی ترغیب دی اور راقم کا نام ادارت کے لئے پیش کیا، تجویز طے پاگئی، اور علی میاں نے فرطِ مسرت سے فوراً اطلاع دی، اور راقم انگریزی پروگرام کی بساط الٹ، لکھنؤ پہنچ گیا، مارچ ۱۹۳۲ء۔ (محرم الحرام ۱۳۵۱ھ) سے ''الضیاء'' کا اجراء عمل میں آیا، عام طور پر زبان کی تصحیح ہلالی صاحب کرتے اور دوسرے امور کے متعلق سید صاحب قبلہ ہدایتیں دیتے، یہ پہلا موقع تھا کہ حضرۃ الاستاذ کی راست نگرانی، اور سرپرستی میں کام کرنے کا موقع ملا، یہ سلسلہ تقریباً چار برس جاری رہا، پہلے دو سال ہلالی صاحب مدظلہ کے مشورے بھی رہنمائی کرتے تھے، ہلالی صاحب کے چلے جانے کے بعد دو برس صرف سید صاحب قبلہ کی نگرانی اور مشورے اس ناتجربہ کار ایڈیٹر کے لئے مشعل راہ بنے رہے، ان چار سالوں میں بہت کچھ سیکھا، اور جس چیز کو زندگی کا تجربہ کہتے ہیں، وہ پہلی مرتبہ حاصل ہورہا تھا، سید صاحب قدم قدم پر ٹوکتے،

معمولی زبان کی غلطیوں کی نشان دہی فرماتے، کتابت کے متعلق بھی مشورے دیتے، مضامین کی سطحیت پر تنبیہ کرتے، اور ساتھ ساتھ کبھی حوصلہ افزائی بھی فرماتے، اور اپنے مخصوص انداز میں۔ اسی دوران میں راقم نے عربی اخباروں میں اسلامی ہند کی سیاسیات پر لکھنا شروع کیا، اس پر کبھی ٹوکتے، کبھی خاموش رہتے، اور کبھی حوصلہ افزائی فرماتے، یہ تاکید ہمیشہ رہتی کہ شہرت کے پیچھے نہ دوڑو، کبھی لکھتے ''تمہیں عربی لکھنا آ گئی، مگر یہ نہیں معلوم، کیا لکھیں؟'' ''الضیاء'' کا پہلا افتتاحیہ خود اپنے قلم سے لکھا تھا، اور خوب تھا، آج بھی پڑھا جا سکتا ہے، ہم لوگوں کو حیرت تھی کہ بیس برس کے بعد بھی حضرۃ الاستاذ کی عربی انشاء میں بانکپن باقی ہے، اپنا عربی کلام بھی اشاعت کے لئے دیتے۔

تعلقات بڑھے تو چھٹیوں میں ایک آدھ بار دیسنہ بھی ضرور حاضر ہوتا، استاذ مرحوم عام طور پر گرمیوں کے دن وطن ہی میں گذارتے، ندوہ میں چھٹیاں ہوتیں، راقم جب بھی دیسنہ حاضر ہوتا، ایک دو مقامی دوست یا ندوہ کے کوئی پردیسی (۱۴) طالب علم ضرور ساتھ ہوتے، ۱۹۳۴ء کی گرمیوں کا ذکر ہے، ندوہ کے ایک طالب علم محمد حسن مالدہی کو لے کر دیسنہ حاضر ہوا، طعام وکلام کے سلسلہ کے بعد دوپہر کو اوپر کی منزل میں (جو برادرم ابو سہیل (۱۵) صاحب کا کمرہ تھا) آرام کرنے کا حکم ہوا، راقم دن کو سونے کا عادی نہیں، بستر پر پڑا رہا، نماز ظہر کے وقت خود حضرۃ الاستاذ تشریف لائے، سلمان (۱۶) میاں گود میں تھے، کمرے میں سہیل صاحب کی انگریزی ٹوپی (ہیٹ) لٹکی ہوئی تھی، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑے تأثر کے ساتھ بولے: ''دیکھا آب زمزم میں شراب کی آمیزش'' پھر ننھے سلمان کی طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے: ''دیکھو! بیٹا!! صرف میرے نام کے نقطے نہ مٹایا کرنا''، اس لطیف فقرے کے بعد مجھ سے فرمایا: ''کچھ سمجھے''؟ عرض کیا: ''جی ہاں! اللہ انہیں علمی میراث بھی عطا کرے۔''

یہ ۱۹۳۴ء کی گرمیوں کا ذکر تھا، اس سے چھ ماہ پہلے (دسمبر ۱۹۳۲ء۔جنوری ۱۹۳۳ء) دارالمصنفین بھی حاضری ہوئی تھی، اور رمضان المبارک کا پورا مہینہ وہیں گذرا تھا،

باضابطہ شاگردی کا موقع بھی یہیں نصیب ہوا، محمد ناظم صاحب اور ابو اللیث صاحب بھی ساتھ تھے، ہم تینوں ''قرآن مجید'' اور ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا درس لیتے، غالبا سورۂ بقرہ کا ایک ربع ہو سکا، اس کے نوٹ اب تک حسن اتفاق سے محفوظ ہیں، ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے ابتدائی ۲۵، ۳۰ صفحے ہو سکے تھے۔

دس بجے صبح کو سید صاحب کے کمرے میں درس ہوتا، اسی وقت ڈاک بھی آتی، اور بڑے لطیفے رہتے، ایک مرتبہ ایک انگریزی خط آیا، مجھے پڑھنے کا حکم ہوا، میں نے ساتھ ساتھ ترجمہ بھی شروع کر دیا، فرمانے لگے: ''میں انگریزی سمجھتا ہوں، صرف اس خط کا عادی نہیں''، بڑی ندامت ہوئی، ایک روز دفتر کا ملازم ایک پرزہ دے گیا، اور سات آٹھ روپئے، پہلے تو جیب میں رکھ لئے، پھر پرزہ اور روپئے نکال کر کہنے لگے:

> ''تم لوگ خیال کرتے ہو گے کہ میں بہت کچھ کماتا ہوں گا، بس میرا حصہ اسی قدر رہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے انتظامات ہیں، اپنے بندے کے ہاتھ سے خرچ کراتا ہے، ملازموں، عزیزوں اور دوسروں کو ان کا اپنا رزق ملتا ہے، میرے حصہ کے یہی چند روپئے ہیں، اسے اچھی طرح سمجھ لو، تم لوگ بھی اس منزل سے گذرنے والے ہو۔''

اسی دور میں ندوہ میں پھر ایک ہنگامہ ہوا، (۱۹۳۵ء)، طلبہ کی معاونت کا الزام ایسے تین افراد پر بھی تھا، جو کسی نہ کسی حد تک اسٹاف میں شمار کئے جاتے تھے، ان میں سب سے کمزور ابو اللیث صاحب تو فوراً الگ کر دیئے گئے، مفتی محمد سعید صاحب اور راقم کو دارالعلوم سے باہر رہنے کا حکم ہوا، حالانکہ ابو اللیث صاحب میرے مقابلے میں بہت نرم، بے زبان، اور مرنجان مرنج آدمی تھے، راقم کے متعلق مشہور تھا کہ اسے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ وسلم بہت مانتے ہیں، اور غالبًا اسی لئے مجھ پر سخت وار کرنے کی ہمت نہیں پڑی، ورنہ ہنگامے میں میرا رویہ حد درجہ غیر محتاط تھا، مفتی محمد سعید صاحب کا تکیہ بھی ایک بڑے ستون پر تھا، اور وہ بھی بال بال بچ گئے، اسی زمانہ میں استاذ مرحوم کا ایک بڑا مفصل خط آیا، جس میں

ذرا تند لہجے میں نصیحت کی گئی تھی، وہ خط آج بھی حکمت وموعظت سے لبریز نظر آتا ہے، نیز دارالعلوم تشریف لائے، تو ابواللیث صاحب اور خاکسار کو الگ برآمدے میں کھڑے کھڑے بڑی دردمندی ودلسوزی کے ساتھ نصیحتیں کیں، حضرۃ الاستاذؒ، ابواللیث صاحب کو بہت مانتے تھے، یہ نام (ابواللیث) بھی انہی کا رکھا ہوا تھا، (ان کا اصل نام شیر محمد تھا) اور ندوہ کے لئے انہیں مغتنم سمجھتے تھے، مگر جب ابواللیث صاحب رخصت ہونے گئے، تو ان کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو تھے، بولے، تو صرف اس قدر..... صاحب سے صفائی کرلو، سیدصاحبؒ صدمے سہنے کے خوگر تھے، اپنے اختیارات استعمال کرنا یا عام زبان میں اپنے کو assert کرنا جانتے ہی نہیں تھے، اس واقعہ کے ہفتہ عشرہ بعد ہی ان پر امراض قلب کا وہ شدید حملہ ہوا، جس سے مہینوں ذی فراش رہے، اور ہفتوں موت وحیات کی کشمکش رہی، اور پہلی سی صحت تو پھر نصیب ہی نہیں ہوئی۔

''الضیاء'' بھی اسی علالت کے دنوں میں بند کرنا پڑا، اور راقم کے ذمہ صرف تدریس کی خدمت رہ گئی، فارغ وقت میں علمی تحقیق ومطالعہ کا شوق پیدا ہوا، اور اس کے لئے سیدصاحب قبلہ سے برابر مشورہ کیا کرتا، مراسلت کے ذریعہ اور زبانی بھی، اسی زمانے میں ''لغات جدیدہ'' کی تکمیل کی، اور آغاز میں جدید اسالیب بیان پر ایک مفصل مقدمہ کا اضافہ کیا، حضرۃ الاستاذؒ بہت خوش ہوئے، اور دریافت فرمایا:

''اپنی محنت کا معاوضہ کیا چاہتے ہو؟ نام یا دام؟''

خادم نے عرض کیا: ''صرف استاذ کی خوشنودی مزاج''، کتاب کے سات نسخے مرحمت ہوئے، اور ٹائٹل پر ''مع اضافہ جدید از مسعود عالم ندویؒ'' کا اضافہ ہوا، نیز دیباچہ میں ایک حوصلہ افزا نوٹ مزید تحریک عمل کے لئے ثبت ہوا، ابھی ابھی سال دوسال ہوئے پھر مزید اضافہ کا حکم ہوا تھا، تعمیل ارشاد میں کافی اضافہ ہوچکا ہے اور ہورہا ہے مگر آہ! کہ یہ کوشش استاذؒ کی نگاہ ذرہ نواز سے محروم رہی، اور رہے گی۔

اسی دوران میں راقم نے بے اجازت مدینہ (بجنور) کے شعبۂ ادارت کی رکنیت

قبول کرلی تھی، عتاب ہوا اور حسب الحکم ڈیڑھ ماہ کے بعد ندوہ واپس آگیا (اگست ۱۹۳۷ء)۔

دسمبر ۱۹۳۷ء میں حضرۃ الاستاذؒ کی تحریک اور مخدومی مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی کوشش وتائید سے خدابخش اورینٹل لائبریری میں میرا تقرر ہوگیا، اس علمی ماحول میں بھی میرا مرجع اعظم گڑھ ہی رہا، جو کچھ بھی لکھتا، پہلے حضرۃ الاستاذؒ سے مشورہ لیتا، ادھر عربی سے تعلق کچھ کم ہوا، تو ''معارف'' میں لکھنا شروع کیا، بہت ڈرتے ڈرتے ہمت ہوئی، مگر سیدصاحب قبلہ کی حوصلہ افزائی نے یہ مرحلہ آسان کردیا، ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۴ء تک ''معارف'' کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتا رہا، سیدصاحب پٹنہ اکثر تشریف لاتے، مختلف سرکاری کمیٹیوں میں اُن کی شرکت ضروری خیال کی جاتی، مخدومی مولانا ریاض حسن خان صاحب خیال کی کوٹھی پر قیام ہوتا، استاذ مرحومؒ کے تشریف لاتے ہی مولانا کا ملازم اطلاع کرجاتا، اور جب تک سیدصاحب قیام فرماہوتے، راقم روزانہ حاضر ہوتا، اور گھنٹوں وہاں نشست رہتی، پٹنہ میں یہی ایک رئیس کا گھر تھا، جہاں یہ فقیر بے تکلف کھانے پینے میں شریک ہوتا، مولانا ریاض حسن خان خیال استاذ الاستاذ مولانا شبلیؒ کے ملنے والوں میں تھے، سیدصاحبؒ بھی ان کا احترام کرتے، اور ہم وابستگان سیدؒ وشبلیؒ کو تو وہ اپنا عزیز ہی سمجھتے، مولانا ریاض حسن خان صاحب اوران کے بڑے بھائی مرحوم مولانا اعجاز حسن خان صاحب خوب آدمی تھے، ہماری پچھلی تہذیب اور شائستگی کے زندہ نمونہ۔

پٹنہ میں خاکسار تقریباً سات سال رہا، (دسمبر ۱۹۳۷ء ۱۹۴۴ء) اس دوران میں بیسیوں ملاقاتیں ہوئیں، کبھی کبھی ندوہ میں بھی اجتماع کے مواقع ملے، ایک آدھ بار شبلی منزل بھی حاضر ہوا، دیسنہ تو بار بار جانا ہوا، باتیں بہت ہیں، مگر اس تحریر کی محدود گنجائش میں کیا کیا بیان کیا جائے؟ بہرحال دوچار ضروری باتیں تو بیان کرنا ہی پڑیں گی۔

۱۹۴۰ء تک سیدصاحب قبلہؒ سے کبھی کسی مسئلہ میں اختلاف نہیں ہوا تھا، مگر اس کے بعد اُن کے افکار ورجحان میں کچھ تبدیلی ہونے لگی جس سے پہلے پہل میرے بنے بنائے افکار وخیالات کو سخت جھٹکا لگا، سیدصاحبؒ کو خود بھی اس کا احساس تھا، پہلے تو یہ کہہ کر

تسلی دی: کہ ''میں نے بیعت میں فقہی مسلک کو آزاد رکھا ہے'' مگر اندازِ فکر بتا رہا تھا کہ فقہی مسلک میں بھی تبدیلی ہو رہی ہے، مگر بہت آہستہ، اس لئے قدرۃً ۱۹۴۰ء اور اس کے بعد ایک عرصہ تک گفتگو اور خط وکتابت جو کچھ بھی ہوتی، وہ تصوف پر، فقہی مسلک کو نہیں چھیڑتے، اس لئے کہ ذہنی طور پر وہ اپنے مسلک تحقیق پر قائم تھے، راقم گفتگو میں تو کیا جرأت کرتا، مگر خطوط میں خوب دل کھول کر لکھتا اور وہ بڑے صبر وتحمل سے جواب دیتے، اس سلسلہ میں حضرۃ الاستاذؒ نے دو چار ایسے جامع اور مفصل خط لکھے ہیں، جو بعض حیثیتوں سے تصوف کی بڑی تصنیفات پر بھاری ہیں، ایک مرتبہ گفتگو اس حد تک پہنچی کہ ''دلائل کا جواب دو یا بات مانو''، میں نے عرض کیا: ''جواب تو دے نہیں سکتا، مگر دل میں بات نہیں اُترتی۔''

فقہی مسلک کا ذکر آیا ہے تو چند لطیفے سن لیجئے، راقم شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ کی سیرت لکھ رہا تھا، اس کا پہلا باب ''معارف'' میں نمونہ کے طور پر تازہ تازہ شائع ہوا تھا، (مئی۔جون ۱۹۴۱ء) اتفاق سے انہی دنوں سید صاحبؒ پٹنہ تشریف لائے، دیکھتے ہی فرمایا: ''آج کل تمہیں نجدیات سے بڑا تعلق ہو گیا ہے'' میں کیا عرض کرتا؟ نگاہیں نیچی کر لیں، پھر میری داڑھی کی طرف دیکھ کر فرمانے لگے، خیر اب داڑھی تو بڑھ رہی ہے۔

اس سے تقریباً ایک برس پہلے (۱۹۴۰ء) کا ذکر ہے، مدرسہ اکزامینیشن بورڈ (بہار) کی مجلس تھی، سید صاحب صدر نشین تھے، موضوع اصلاح نصاب تھا، صوبہ کے تمام مشہور علماء موجود تھے، مخدومی مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، حاجی معین الدین ندوی مرحوم ان میں زیادہ نمایاں تھے، راقم بھی ایک ممبر کی حیثیت سے حاضر تھا، اس دن شام کو پٹنہ سیٹی (پٹنہ کی قدیم آبادی۔عظیم آباد) میں انجمن محمدیہ کے زیر اہتمام تبلیغی جلسہ تھا، مولانا سجادؒ نے سید صاحبؒ اور مولانا گیلانیؒ کو دعوت دے دی، اور خاکسار کو بھی ان کی معیت میں آنے کا حکم ہوا، وہاں پہنچے تو مولانا ابوالقاسم بنارسی سے ملاقات ہوئی، سب لوگ ڈائس کے قریب بیٹھ گئے، راقم وہیں مولانا بنارسی سے الگ باتیں کرنے لگا، سید صاحبؒ نے تعجب سے فرمایا، تمہارا ان سے کیا تعلق؟ میں عرض کیا: ''ہمارے اُن کے

خاندانی (۱) تعلقات ہیں''، بولے (اور میری داڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو اس وقت چھوٹی تھی) ''جی ہاں! اب تو داڑھی منڈے بھی اہل حدیث ہوتے ہیں''، مولانا ابوالقاسم صاحب اس سے بہت متاثر ہوئے اور پھر دونوں زمانے کے انقلاب کا شکوہ کرنے لگے۔

سیرت ابن عبدالوہاب میں بھی حضرۃ الاستاذؒ ہی سے مشورہ لیتا، چونکہ یہ میری پہلی علمی تصنیف تھی اسلئے بڑی تمناؤں کے ساتھ سید صاحب کے نام معنون کرنے کی جرأت کی۔

انتساب

اپنے استاذ، مربی اور مخدوم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ العالی کے نام،
جن کے مفید مشوروں نے مجھ میں لکھنے پڑھنے کا مذاق پیدا کیا، اور جن کی پدرانہ
شفقت میری زندگی کے اتار چڑھاؤ کی نگہبان رہی ہے، اور اپنی طالب علمی
کے گذشتہ تیرہ سالوں میں جن کے مشوروں کا یکسر پابند رہا ہوں۔
اپنی اس حقیر علمی کوشش کو مضمون کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں،
گر قبول افتد زہے عز وشرف

اور عجب شوئ قسمت کہ یہ سرنامہ اپنے وقت پر استاذ مرحوم کے ملاحظہ نہ آیا، یہ راز بھی کئی سال کے بعد مدینہ منورہ میں کھلا، ایک شام کو سید صاحبؒ سلمان میاں کے ساتھ غربت کدہ پر تشریف لائے، (محرم ۱۳۶۹ھ نومبر ۱۹۴۹ء) دوران گفتگو میں دریافت فرمایا: ''تمہاری محمد بن عبدالوہاب یہاں ہے؟'' کتاب نکال کر پیش کی، سرنامہ پر نگاہ ٹھٹک گئی، بہت متاثر ہوئے اور آنکھوں میں دو آبدار موتی چمکتے نظر آئے اور پھر بڑی محبت سے فرمایا، اب یہ جنس وفا عنقا ہے، وہ منظر اب تک نہیں بھولتا، اور نہ بھولنے کی چیز ہے، عرب ملکوں میں امیر شکیب ارسلان (ف ۱۹۴۶ء) ''امام الاوفیاء''، کہے جاتے ہیں، سید رشید رضا

مرحوم (ف ۱۹۳۴ء-۱۳۵۳ھ) نے بھی اپنے استاذ محمد عبدہ کے ساتھ ''حق وفا'' کو خوب نباہا، ہمارے ملک میں یہ جنس گراں بہت نایاب ہے، حضرت سید صاحبؒ اسلامی ہند کے ''امام الاوفیاء'' کہے جاسکتے ہیں، استاذؒ کی رفاقت واطاعت سے لے کر استاذؒ کے ہم نشینوں اور دوستوں تک سے جس ذاتِ گرامی نے عہد وفا کو نباہا، وہ وفا شعاروں کا قافلہ سالار نہ ہو تو کون ہو؟ اب دیکھیں کہ اس کے خوانِ علم کے زلہ ربا اس عہد وفا کو کس طرح نباہتے ہیں؟

تصوف اور فقہی مسلک کے علاوہ ایک دوسرا مسئلہ بھی اس دور میں ہمارے لئے پریشانی کا موجب رہا، ۱۹۳۷ء ہی سے اسلامی ہند میں ایک نئی فکر بیدار ہو رہی تھی، جس نے ۱۹۴۱ء-۱۳۶۰ھ میں ایک منظّم دعوت وتحریک کی صورت اختیار کرلی، اور راقم بھی پورے ذوق وشوق اور انشراح صدر کے ساتھ اس میں شریک ہوگیا۔

اصولی اتفاق کے باوجود حضرت سید صاحبؒ کو اس کے متعلق کچھ شکوک وشبہات تھے، جس سے ہم عقیدت مندوں کے لئے بڑی مشکل کا سامنا تھا، بہر حال اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے، کہ یہ مشکل سدّ راہ نہ بنی اور جہاں تک استاد مرحوم کی محبت وعقیدت اور ان کی طرف سے شفقت ومحبت کا تعلق ہے، اس میں بھی کوئی فرق نہ آیا، اور راقم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا رہا، اس سلسلہ میں سب سے بڑا مرحلہ ملازمت چھوڑ کر دار الاسلام پٹھان کوٹ جانے کا تھا، پہلے والد ماجد مدظلہ سے اجازت لی، اس کے بعد سید صاحب قبلہؒ سے اجازت کا سوال تھا، اتفاق سے سفر کے وقت لکھنؤ میں ملاقات کا پروگرام بن گیا، (اکتوبر ۱۹۴۴ء) شاہ معین الدین صاحب بھی اتفاق سے وہیں موجود تھے، وہ اور دوسرے دوست سید صاحب سے کہتے ''اُسے جانے نہ دیں''، وہ فرماتے، میں کس طرح روکوں؟ اور میں خاموش ان کے چہرے کی طرف دیکھا کرتا، کہیں آزردہ تو نہیں؟ محبت اور فرض کی کش مکش بڑی سخت ہوتی ہے، آخر الوداع کی ساعت آگئی، ہاتھوں میں ہاتھ لے کر فرمانے لگے، اب میں وہی ترکیب کروں گا، جو مولانا الیاس صاحب نے علی میاں کے لئے کی تھی، میں نے کہا، وہ کیا، فرمایا: "إلا لتجاء إلى الله" عرض کیا، اس سے کون روک سکتا ہے؟

فرمایا: ''اگر دعا قبول ہوگئی تو؟''، عرض کیا، تو پھر کیا؟ خود بخود واپس چلا آؤں گا، ان لطیف جملوں کے بعد دیدۂ پرنم کے ساتھ رخصت فرمایا، اور میں نے اسے اپنی بڑی کامیابی خیال کی، (۸/اکتوبر ۱۹۴۴ء) اس کے بعد ایک مدت تک اس سلسلہ میں خط وکتابت ہوتی رہی، موضوع زیادہ تر تصوف ہوتا اور کبھی کبھی ''جماعت اسلامی'' کے اخبارات اور بعض لکھنے والوں پر تنقید، خاکسار اپنی بساط پھر اس خلیج کے پاٹنے کی کوشش کرتا رہتا، اور کون کہہ سکتا ہے کہ بالکل ناکام رہا؟

سید صاحب قبلہ میں مہمان نوازی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اس کا صحیح اندازہ دیسنہ پہنچ کر ہوتا، شبلی منزل میں وہ مصروف رہتے، دیسنہ میں نسبۃً فرصت ہوتی، وہاں وہ اپنے شاگردوں اور چھوٹوں کی بھی بڑی آؤ بھگت کرتے، حضرت الاستاذؒ کو آموں کا بہت شوق تھا، بڑے شوق سے اپنا باغ بھی لگایا تھا، ایک مرتبہ آموں کے موسم میں دیسنہ حاضری ہوئی، تقی الدین نعمانی میرے پٹنہ کے رفیق بھی ساتھ تھے، سید صاحب اپنے ہاتھ سے ایک ایک قاش کاٹ کر تقسیم فرماتے، ایک مرتبہ سید صاحب قبلہ کے ہاتھوں میں گٹھلی رہ گئی، تقی صاحب نے ازراہ تواضع گٹھلی طلب کی، فرمایا آموں کے باب میں یہ تواضع نہیں۔

پٹنہ میں حضرت الاستاذؒ نے ایک مرتبہ راقم کے غربت کدہ پر بھی قیام فرمایا (۱۹۴۳ء)، اپنی تنگ دامانی اور استاذ مرحوم کے معمولات کے پیش نظر کبھی اس تحریک کی خود جرأت نہ ہوئی، مگر اب کی سید صاحب قبلہ نے خود ہی اطلاع دی، مدرسہ اکزامنیشن بورڈ کی مجلس منعقد ہو رہی تھی، گرمیوں کا موسم تھا، راقم کا مستقر اجتماع گاہ سے بہت قریب تھا، شاید اسی وجہ سے غربت کدہ کا انتخاب ہوا ہو، بہر حال جونہی اطلاع ملی، بڑی خوشی ہوئی، مگر ساتھ ساتھ فکر بھی دامن گیر ہوگئی، کہیں تکلیف نہ ہو، بہر حال اپنی سی ہر ممکن کوشش کی، مگر سچ یہ ہے کہ آرام وآسائش کا خاطر خواہ انتظام نہ ہوسکا، اسی موقع پر ایک دن ظہر کی نماز کے بعد کا ذکر ہے، سید صاحب قبلہ وظائف میں مشغول تھے، خاکسار اُن کے قریب

سے گذرا فرمایا: ''ٹھہرو، تم بہت نکتہ چینی کیا کرتے ہو، یہ (اذکار کی) کتاب دیکھو اس میں کونسی چیز خلاف سنت ہے''؟ الا مرفوق الأدب ''عاجز نے چھوٹی سی مختصر کتاب (جس پر غالبًا مناجات مقبول نام درج تھا) ہاتھ میں لی اور درمیان سے ورق الٹا، تو ایک منظوم شجرہ پر نظم جم کر رہ گئی، جس کی ردیف ''کے واسطے'' تھی، اس گستاخ نے فورًا انگلی رکھ دی، یہ ہے ''توسل بالأموات'' فرمایا، کوئی اور چیز بتاؤ، عرض کیا، میری کیا مجال کہ خوردہ گیری کروں؟ یہ تو صرف تعمیل ارشاد کی گئی۔

اس حکایت کے بیان کرنے سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ حضرۃ الاستاذؒ کس قدر روادار تھے؟ مسلک ور جحان فکر کی تبدیلی کے باجود ان کے علم نے کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔

اسی طرح کا، لیکن اس سے بالکل الگ ایک واقعہ مکہ معظّمہ میں پیش آیا، راقم ایک دن رباط بھوپال حاضر ہوا، خاص قسم کی مجلس تھی اور مجذوب صاحب کی غزل پڑھی جا رہی تھی، میں بھی بیٹھ گیا، کچھ دیر کے بعد سید صاحب نے فرمایا، تمہیں بھی شعر وشاعری کا ذوق ہے؟ عرض کیا اور ذرا جرأت کے ساتھ ذوق تو آپ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے، مگر خادم تو کسی اور چیز کی طلب میں حاضر ہوا کرتا ہے، اس پر میں نے طواف سے متعلق ایک سوال کیا، جس میں ہفتوں سے الجھا ہوا تھا، اور حنفی مسلک کی تائید حدیث سے نہیں ہوتی تھی، سید صاحب قبلہ کچھ دیر غور فرماتے رہے، پھر مختلف کتابوں کی مراجعت کا مشورہ دیا، نیز مولانا عبدالوہاب دہلوی سے پوچھنے کو کہا، اتنے میں وہ صاحب جو ابھی ابھی غزل سنا رہے تھے، بولے تم تو حنفی ہو، فقہائے حنفیہ کا مسلک معلوم ہو جانے کے بعد اتنی چھان بین کی کیا ضرورت؟ میرا جی جل گیا، اور عرض کیا معاف کیجئے گا میں حنفی نہیں ہوں، سید صاحب قبلہ مسکرائے اور اشاروں میں میرے اس ٹھیٹھ وہابیانہ جواب کی داد دی۔

غزل خوانی کا ذکر چھڑ گیا ہے تو ایک واقعہ مدینہ منورہ کا بھی سنا دوں، شاید اس کم سواد تحریر میں حرمین کے تذکرے سے کچھ آب وتاب پیدا ہو جائے، مدینہ منورہ میں استاذ علیہ الرحمہ کا قیام رباط بھوپال میں تھا، ایک دن نو بجے صبح کو (اپنے یہاں کے وقت سے)

حاضر ہوا، تو کیا دیکھتا ہوں، غزل خوانی ہو رہی ہے، اور کلام خود استاذؒ کا ہے، دلچسپی سے سننے لگا، اتنے میں کسی صاحب نے دریافت کیا، یہ کلام کس دور کا ہے؟ سید صاحب قبلہ میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے: ''یہ نہیں بتاؤں گا، میرے بعض عزیز ایک خاص دور کے بعد کا میرا کلام قبول نہیں کرتے''، اس پر وہ صاحب بولے: ''پھر تو آپ نے بتا ہی دیا''، کلام کی مناسبت سے واقعات کی تاریخی ترتیب قائم نہیں رہ سکی، اور نہ اس تحریر میں اس اہتمام کی خاص ضرورت تھی۔

اکتوبر ۱۹۴۴ء میں پنجاب آ گیا تھا، دو تین ماہ چکر لگانے کے بعد جالندھر کی آب وہوا سازگار نظر آئی اور وہیں اپنے کام کی طرح ڈال دی، اس دوران خط وکتابت برابر جاری رہی، شرف نیاز صرف ایک مرتبہ لکھنؤ میں حاصل ہوا، (جولائی ۱۹۴۵ء) راقم گھر جاتے ہوئے، مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے لئے ندوہ ٹھہر گیا تھا، کچھ خیال یہ بھی تھا کہ عربی لٹریچر کی تیاری کا کام یہیں رہ کر کیا جائے، پورے برصغیر پاک وہند میں عربی زبان کا کام کرنے کے لئے ندوہ سے اچھا ماحول اور بیش قیمت کتاب خانہ نہیں مل سکتا، سید صاحبؒ نے مستقل قیام کی اجازت بھی دے دی تھی، مگر پھر ارادہ بدل گیا، اور تقسیم کے بعد تو اس کا کوئی امکان ہی نہیں رہا۔

تقسیم کے بعد مدتوں حالات سے بے خبری رہی، اعزاء واحباب میری زندگی سے مایوس ہو چکے تھے، عرصہ کے بعد استاذ محترمؒ کو میری سلامتی کی خبر ملی، اور مراسلت شروع ہوئی، اس دور کے خطوط میں زیادہ تر نئی مملکت اور اس کی ہمسایہ ریاست کا حال پوچھتے، خاص طور پر خط میں برادرم سید مظفر حسین ندوی اور ان کے اعزاء واقرباء کی خیریت دریافت کرتے، بعضے بعضے خطوط کا اندازِ بیان بڑا لطیف ہوتا تھا، ان کے جواب بھی رمز وکنایہ کی زبان میں جاتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی پہ قربان جایئے، چار سال کے بعد ملاقات ہوئی تو ارض حرم میں، پہلے سے کوئی خبر نہیں تھی، راقم عراق ونجد کا چکر لگا کر مکہ مکرمہ پہنچا، (ذی

قعدہ ۱۳۶۸ھ) تو ہمارے معلم شیخ عبدالرحمٰن مظہر نے سب سے پہلے خوشخبری سید صاحبؒ کی سنائی، ان کے ایک معاون نے اس پر دریافت کیا: ''ندوی کسی خاندان کا نام ہے''، میں نے کہا ''جی ہاں! بہت بڑا خاندان ہے''، دوسرے ہی روز علی الصباح رباط بھوپال حاضر ہوا، اور دیار حرم کی اس ملاقات سے بڑی مسرت ہوئی، پھر تو برابر حاضری ہوئی۔

وہیں معلوم ہوا کہ سید صاحب کو پاکستان بلایا جا رہا ہے، پوچھنے والا ہی تھا کہ ایک روز خاص طور پر مجھے الگ بٹھا کر کچھ سرکاری کاغذات دکھائے، یہ حکومت پاکستان کی طرف سے تعلیمات اسلامی بورڈ کی صدارت قبول کرنے کی دعوت تھی، اس کے بعد میری رائے دریافت کی، عرض کیا: ''ذاتی طور پر تو مجھے بہر حال آپ کی آمد سے خوشی ہوگی لیکن ڈر لگتا ہے کہیں آپ کے انتقال مکان سے ندوہ اور دارالمصنفین کو نقصان نہ پہنچ جائے''، اس پر وہ سوچ میں پڑ گئے پھر فرمانے لگے: ''تمہارے جماعت کا رویہ کیا ہوگا''؟ اس کا جواب میرے لئے بہت مشکل تھا، بہر حال اچھی طرح غور کرنے کے بعد عرض کیا، جماعت کی پالیسی تو امیر اور اس کی شوریٰ کے ہاتھ میں ہے، لیکن جہاں تک میں جماعت کے موقف کو سمجھا ہوں اسے آپ کی آمد اور صدارت قبول کرنے سے خوشی ہی ہوگی، اس طرح پر بورڈ کے اندر بھی ایک صحیح مسلک کی توضیح ہو سکے گی، اور حکومت کو من مانی کارروائیاں کرنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔

البتہ اگر آپ کی صدارت میں بورڈ نے کہیں کوئی ایسی سفارش کی جو جماعت کی نگاہ میں قابل قبول نہ ہو تو پھر ظاہر ہے کہ جماعت مخالفت کرے گی، آپ کی شخصی نہیں، بلکہ بورڈ کے فیصلے کی، کوئی نصف گھنٹہ گفتگو رہی اور رازداری کا عہد لے کر اجازت دی، اور یہ پہلا موقع ہے کہ یہ گفتگو کھول کر بیان کر رہا ہوں۔

اتفاق سے اسی سال (۱۹۴۹ء-۱۳۶۸ھ) خواجہ شہاب الدین صاحب وزیر داخلہ (حال گورنر صوبہ سرحد) بھی ساتھ آئے ہوئے تھے، وہ نماز عشاء سے پہلے اور بعد حنفی مصلی کے پاس سید صاحبؒ کے پہلو میں بیٹھتے، اور دونوں میں روزانہ گفتگو ہوتی، خواجہ

صاحب اوراد واذکار قسم کی خالص مذہبی باتیں پوچھتے، اور حضرۃ الاستاذ امور مملکت اور زندگی کے دوسرے مسائل چھیڑتے، یہ شعوری اور مہذب مناظرہ دونوں کے درمیان برابر جاری رہا، سید صاحب کا اپنا تاثر یہ تھا کہ ''یہ لوگ معذور ہیں، اور اپنی مخصوص تعلیم و تربیت کی وجہ سے سمجھ نہیں سکتے کہ دین ایک نظام زندگی کا نام ہے''، خواجہ صاحب چاہتے تھے کہ مجلس تعلیمات اسلامی کی صدارت قبول کرنے پر انہیں راضی کر لیں، سید صاحبؒ نے انکار تو نہ کیا، مگر خواجہ شہاب الدین جیسا ہوشیار انسان بھی سید صاحب سے زبان نہ لے سکا، یا عام زبان میں کوئی (Commitment) نہ کرا سکا، ہمارے بعض احباب حضرۃ الاستاذؒ کو سادہ لوح سمجھتے تھے، یہ خیال خود سادہ لوحی پر مبنی تھا، ان کی سب سے بڑی خوبی یا کمزوری صرف ان کی حد سے بڑھی ہوئی شرافت اور مروت تھی، معاملہ فہمی میں وہ کسی بڑے سے بڑے ذہین سے ذہین اور تجربہ کار سے تجربہ کار آدمی سے کسی طرح کم نہیں تھے۔

یہ پاکستان آنے کی تمہید تھی، حسن اتفاق کہ جس دن حضرت سید صاحب قبلہؒ، دہلی سے لاہور تشریف لائے ہیں، راقم لاہور میں موجود تھا، لیکن ان کے اس پروگرام سے بالکل بے خبر۔ مولانا مودودیؒ، اور ان کے رفقاء مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور میاں طفیل محمد صاحب بیس ماہ کی نظر بندی کے بعد تازہ تازہ رہا ہوئے تھے، (اواخر مئی ۱۹۵۰ء) اور جماعت کی مجلس شوریٰ منعقد ہو رہی تھی، (جون ۱۹۵۰ء اواخر شعبان ۱۳۶۹ھ)۔

انہی دنوں ایک روز مغرب کے بعد ہم لوگ دفتر جماعت اسلامی (مرکز) کے باہر کھلے صحن میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے، کہ ''دفتر کوثر'' سے فون پر اطلاع ملی، ''مولانا سید سلیمان آئے ہوئے ہیں، اور کل صبح مولانا مودودی، مولانا اصلاحی اور مسعود عالم سے ملنے کے لئے آئیں گے''، خبر پا کر جو مسرت ہوئی، اس کا کیا پوچھنا؟ مگر فکر یہ ہوئی کہ کسی طرح اُڑ کر ''دفتر کوثر'' پہنچ جاؤں، مگر رات کو چار میل کی مسافت کس طرح طے کی جائے؟ آخر علی الصباح اپنے ایک رفیق رانا اللہ داد خان کی موٹر پر مولانا اصلاحی کو ان کے گھر سے لیتے ہوئے ''دفتر کوثر'' پہنچے، سید صاحب قبلہ ابھی چائے سے فارغ

ہوئے تھے، اور انتظار ہی کر رہے تھے، تھوڑی دیر میں اچھرہ واپس آ گئے، مولانا مودودی کے دفتر میں نشست ہوئی، اندر صرف ہم چار آدمی (۱۸) تھے، اور تمام ارکان شوریٰ اور رفقائے مرکز باہر برآمدے میں بیٹھے رہے، باتیں دیر تک ہوتی رہیں، سید صاحبؒ نے مولانا مودودیؒ کو عرصہ کے بعد دیکھا تھا، کہنے لگے: ''اب تو ماشاء اللہ آپ کی داڑھی خوب بڑھ گئی ہے''، پھر نعیم صاحب کو دریافت کیا، وہ بلائے گئے، اور ان کی پیٹھ ٹھونکی، اور دینی خدمات کی انجام دہی پر مبارک باد دی، اتنے میں رفقاء کا تقاضا ہوا کہ باہر تشریف لائیں، تاکہ سب لوگ نیاز حاصل کر سکیں، باہر برآمدے میں بھی دیر تک نشست رہی، وہاں سید نقی علی صاحب علوی (جو ان دنوں ''تسنیم'' کے اسٹاف رپورٹر مقرر ہوئے تھے، اور آج کل سنٹرل جیل میں نو سال کی قید کاٹ رہے ہیں) نے کچھ سوالات کیئے، اور تسنیم کے لئے اچھا خاصا انٹرویو تیار کر لیا۔

اس وقت تو سید صاحب خیر سگالی کے وفد میں آئے تھے، واپسی کا عزم مصمم تھا، مگر کراچی جا کر کچھ ایسی صورتِ حال پیدا کر دی گئی کہ وطن مالوف کو نہ لوٹ سکے۔

پاکستان نے حضرت الاستاذؒ کی آؤ بھگت میں کمی نہیں کی، سرکاری اور غیر سرکاری، ہر حلقہ میں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے، حکومت کی ہر ایسی چھوٹی بڑی کمیٹی جس میں اسلامی نگاہ کی نمائندگی مطلوب ہوتی، اس کی رکنیت اُن کو پیش کی جاتی، اور وہ اس میں شریک ہوتے، اپنے مفید مشوروں اور تجربوں سے کمیٹی کی مدد کرتے، دستور ساز اسمبلی کی مجلس تعلیمات اسلامی سے پہلے تو الگ رہے، لیاقت علی خان مرحوم نے بہت ترغیب دی، مگر سید صاحب ضمانت (Assarance) چاہتے تھے کہ بورڈ کے مشورے قبول کئے جائیں گے، مگر حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ بورڈ کی صدارت قبول کر لی، اور ہمارے نقطۂ نظر سے بھی ان کا قبول کرنا اچھا رہا، ''ہمارے نقطۂ نظر'' سے مراد پاکستان میں اسلامی دستور کیلئے جدو جہد کرنے والوں کا نقطۂ نظر ہے۔

سید صاحب کبھی کبھی پنڈی بھی تشریف لاتے، دو مرتبہ ''دار العروبہ'' کی بھی

عزت افزائی ہوئی، ایک مرتبہ استاذ محترم ڈاکٹر تقی الدین ہلالی (۱۹) (حال پروفیسر لندن یونیورسٹی جرمنی) کی موجودگی میں، جب کہ وہ عراق سے کچھ دنوں تفریح کے لئے پاکستان تشریف لائے تھے، (اگست ۱۹۵۱ء)۔

میرا بھی کبھی کبھی کراچی جانا ہو، اور سید صاحب کے دولت کدہ پر دلچسپ صحبتیں رہتیں، اس موقع پر فروری ۱۹۵۱ء کی ایک دعوت نہیں بھولتی، بہار کی قبولی اور سیخ کباب کا مزا کبھی بھولنے ہی کا نہیں، حکیم نصیر الدین صاحب ندوی اور خاکسار نے خاص طور پر کبابوں ہی پر اپنی توجہ مرکوز رکھی، حضرت الاستاذؒ ہماری اس بے تکلفی اور طفلانہ حرکت سے بہت محظوظ ہوئے۔

مارچ ۱۹۵۳ء میں اس گنہگار کو بھی بے گناہوں کے ساتھ سرکاری مہمان خانہ کی ضیافت نصیب ہوئی، حضرت الاستاذ پر اس کا بہت اثر ہوا، بار بار عزیزی محمد عاصم صاحب رفیق ''دار العروبہ'' سے خیریت دریافت کرتے، جیل میں بھی دو والا نامہ ملے، جن سے بڑی مسرت اور طمانیت حاصل ہوئی، پر افسوس کہ رہائی کے بعد (اگست ۱۹۵۳ء) پھر نیاز نہ حاصل ہو سکا، اور اس سے زیادہ افسوس یہ کہ آخری دنوں میں حضرت الاستاذ کی علالت سے بھی بے خبر رہا، اسے قسمت کی ستم ظریفی کے سوا اور کیا کہا جائے کہ جیل میں اچھا خاصا رہا، مگر رہائی کے بعد مرض (دمہ) کے مسلسل اور سخت حملے ہونے لگے، اور نومبر (۱۹۵۳ء) کے آغاز میں تو ایسا حملہ ہوا کہ اپنی بیماری کی پچیس سالانہ زندگی میں کبھی ایسا حملہ نہیں ہوا تھا، دو تین ماہ ذی فراش رہا، ایک دوست کو کراچی لکھا کہ استاذ محترم کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کی درخواست کیجئے، (۱۳؍ نومبر ۱۹۵۳ء) مگر ہونا کچھ اور لکھا تھا، میں بستر علالت پر روزانہ کراچی سے جواب کی راہ دیکھ رہا تھا کہ ۲۲؍ نومبر کی شب (۱۴؍ ربیع الاول ۱۳۷۳ء) ساڑھے آٹھ بجے ایک اخباری نمائندے نے آکر وفات حسرت آیات کی اطلاع دی، إنا للّٰہ وإنا إلیه راجعون۔

أيتها النفس اجملي جزعًا   إنّ ما تحذرين قد وقعا

تعزیت کے لئے بھی کراچی نہ جاسکتا تھا، چلنے پھرنے کی سکت بھی نہیں تھی، کہیں ہفتوں کے بعد جا کر سفر کے قابل ہوا، دسمبر کی ۱۶؍ کو کراچی پہنچا، اور برادرم ابو عاصم صاحب اور سلمان میاں سلمہ اللہ کی معیت میں اس قطعۂ ارض کی زیارت کی، جہاں استاذ مرحوم کا جسد خاکی مصروف استراحت ہے، اللہ تعالیٰ ان کی تربت پر رحمت کے پھول برسائے اور انہیں اعلیٰ علّیین میں جگہ دے۔

اب ہمارے نصیبوں میں ماتم ہی ماتم ہے، جو جگہ خالی ہوتی ہے، وہ پر نہیں ہوتی، ہائے شبلی منزل کی وہ دو گز زمین جسے استاذ مرحوم نے اپنی آرام گاہ کے لئے پسند فرمایا تھا، وہ اپنے استاذ کے پہلو میں استراحت کرنا چاہتے تھے، مگر قدرت انہیں ایسی جگہ لے آئی، جہاں ساحل عرب کی ٹھنڈی ہوائیں صبح وشام آیا کرتی ہیں، شاید ان کے تحت الشعور میں کوئی ایسی آرزو رہی ہو۔

علمی مقام:

سید صاحبؒ کا علمی مقام بلند تھا، اتنا بلند کہ وہاں تک شاید بہتوں کا طائر خیال بھی پرواز نہ کرسکے، ان کی ''جامعیت'' تو اس دور میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ میری نگاہ میں اس دور کے تمام اہل علم واہل نظر ہیں، صرف ہندوستان کے نہیں بلکہ دوسرے مسلمان ملکوں کے بھی۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ کوئی شخصیت علم وفن کے گوناگوں شعبوں کی ایسی جامع نظر نہیں آتی، علامہ سید رشید رضا (م ۱۳۵۳ھ-۱۹۳۳ء) قرآن وحدیث وفقہ اور عربی زبان وادب اور ان کے متعلقات کے امام تھے۔ عربی سیاسیات میں بھی انہیں درخور تھا۔ لیکن وہ کوئی مغربی زبان نہیں جانتے تھے اور نہ کوئی دوسری مشرقی زبان! ممکن ہے، ترکی سے آشنا رہے ہوں۔ تاریخ وجغرافیہ اور معقولات وغیرہ میں بھی خاص درک نہیں تھا۔ امیر شکیب ارسلان (م ۱۹۴۶ء) اور ہر لحاظ سے جامع کمالات تھے، لیکن دینی علوم میں ان کی حیثیت ایک مبتدی کی تھی۔ مولانا ابوالکلام زبان وقلم کے بادشاہ ہیں، مگر ان کا علم ٹھوس نہیں، یہ صاف بیانی شاید بعض لوگوں کو

شاق گزرے لیکن یہ رائے پوری طرح سوچ سمجھ کہ اور مولانا کو بہت قریب سے دیکھنے کے بعد عرض کی جارہی ہے۔ مولانا ابوالکلام سے عاجز کو بڑی عقیدت ومحبت رہی ہے۔ محبت تو اب بھی ہے، گو اختلاف فکر ومسلک کے باعث پہلی عقیدت نہیں رہی؛ لیکن نقد کے مقام میں محبت وعقیدت کا کوئی سوال نہیں، یہاں تو وہی بات کہی جائے گی، جو حقیقت سے مطابقت رکھتی ہو۔ اس کے برخلاف سید صاحبؒ ایک طرف قرآن وحدیث وفقہ میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں، تو دوسری طرف تاریخ وادب کے میدان میں بھی بڑے بڑے شہسواروں سے آگے ہیں۔ مولانا ابوالکلام اور ہندوستان کے دوسرے اہل علم کی طرح صرف اردو ہی میں لکھنے پر قادر نہیں تھے۔ عربی انشاء پردازی میں بھی ان کے جوہر خوب کھلتے تھے، علامہ سید رشید رضاؒ کی طرح جدید علوم اور مغربی زبانوں سے ناآشنا نہیں تھے، انگریزی اچھی جانتے تھے اور فرنچ سے آشنا تھے، فارسی ادب کا بھی ستھرا ذوق تھا۔ جغرافیہ اور خاص کر عربوں کے علم جغرافیہ پر وہ ''حجت'' (اتھارٹی) تھے۔ ممکن ہے عرب ملکوں میں کوئی ان کا ہمسر مل جائے یا ان پر فوقیت لے جائے، لیکن اسلامی ہند میں عربوں کی جغرافیہ دانی کی گہرائیوں سے واقف ان سے بڑھ کر کوئی نہیں تھا۔ یہ میں پوری قطعیت کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ ان کی تصنیفات (عربوں کی جہاز رانی اور علم الجغرافیہ عندالعرب) سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ وہ ہر فن مولا تھے، علم کے ہر شعبے میں انہیں درک تھا۔ اور تو اور، معقولات یونانی میں بھی انہیں اعلیٰ دستگاہ حاصل تھی، قدیم ہیئت سے بھی پوری واقفیت تھی۔ میں نے اس تقابل وموازنہ میں مولانا حمیدالدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا نام قصداً نہیں لیا ہے۔ مولانا فراہیؒ، استاذ الاستاذ مولانا شبلیؒ کے عزیز خاص ہیں، اور سید صاحبؒ ان سے برابر مستفید ہوتے رہے۔ سیرۃ النبی جلد سوم میں خود اس استفادہ کا اعتراف کیا ہے۔ غالبًا الفاظ اس طرح پر ہیں، ٹھیک ٹھیک یاد نہیں، معنی یہی ہیں، اس بات کا اطمینان ہے:

''مخدومی مولانا حمیدالدین سے مشکلات وغوامض کی عقدہ کشائی میں بہت مدد ملی''، (او کما کتب)، اس لئے مولانا فراہیؒ ان کے معاصرین کی فہرست میں نہیں آتے،

بلکہ ان کے مخدومین مولانا فاروق چڑیا کوٹی، (سید صاحبؒ اور مولانا شبلیؒ دونوں کے استاذ) اور مولانا شبلیؒ کی صف میں ان کا شمار کیا جا سکتا ہے۔

اخلاق وعادات:

سچ کہا ایک دوست نے: ''سید صاحبؒ میں ان کی انسانیت کے سوا اور کوئی خوبی نہ ہوتی، تو بھی وہ دنیا کے بہت بڑے آدمی ہوتے''۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی شرافت ومروت کم دیکھنے میں آئے گی۔ سید صاحبؒ کسی کو رنج کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔ ان کا غصہ بھی اپنی ایک ادا رکھتا تھا۔ ۲۵ر برس مسلسل راقم کا ان سے گہرا تعلق رہا، سخت ناگوار سے ناگوار عالم میں بھی جھڑکی نہیں سنی۔ وہ موقعے ایسے آئے کہ سخت ڈانٹ کا مستحق تھا، مگر واہ ارے! شرافت ونیکی وطبع کہ صرف معمولی تنبیہ پر قناعت کی، دارالعلوم ندوہ اور دارالمصنفین کے انتظام واہتمام میں اختلاف کے بے شمار موقعے آئے۔ ان کے رفیقوں اور چھوٹوں نے بسا اوقات انہیں تکلیف بھی پہنچائی اور وہ مکمل بااختیار ہونے کے باوجود معاف کرتے رہے۔ آخر ایک دن ایسا آیا کہ تنگ آ کر خود خاموشی کے ساتھ الگ ہو گئے۔ یہ موقع نہیں کہ ندوہ اور دارالمصنفین کی سیاست کو چھیڑوں۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مرحوم شرافت وحسن اخلاق کا مجسمہ تھے۔ وہ اپنے عزیزوں تک کو رنج کرنا نہیں جانتے تھے، اور کہیں انہیں خیال ہو جائے کہ ان کے کسی جملے سے کسی عزیز کو رنج پہنچا ہے، تو فوراً اس کی تلافی کرتے، راقم کو خود ایسے موقعے پیش آئے ہیں۔ ایک واقعہ ایام قیام کراچی کا بیان کردوں تو شاید استاذ مرحوم کی طبیعت اور مروت کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ فروری ۵۱ء میں کراچی جانا ہوا۔ اکثر حضرت الاستاذؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ ایک دن راقم کی ''دیار عرب میں'' چند ماہ کی داد دیتے ہوئے فرمایا: ''یہ تمہارا دوسرا سفرنامہ ہے، پہلا سفرنامہ حکیم ناصر خسرو کا تھا، جو باطنی مذہب کی تبلیغ کے لئے عالم اسلام کا جائزہ لینے نکلا تھا''۔ راقم کو اس تشبیہ سے سخت تکلیف پہنچی، مگر استاذؒ کے ادب سے خاموش رہ گیا، دوسرے دن اپنے دوست محمد ناظم (۲۰)

صاحب سے اس کا ذکر کیا۔ یہ تذکرہ جان بوجھ کر کیا گیا تھا، جانتا تھا کہ محمد ناظم صاحب از خود اس خادم کے تاثرات بارگاہ سید تک پہنچا ہی دیں گے اور وہی ہوا۔ دوسرے دن محمد ناظم صاحب ملے اور کہنے لگے: ''میں نے اصلاح ذات البین کے لئے سید صاحب سے ذکر کر دیا تھا۔ انہیں بہت افسوس ہوا۔ انہوں نے محض تفریحاً یہ بات کہی تھی''۔ اسی روز شام کو (چھوٹے صاحبزادے) سلمان میاں سلمہٗ اللہ حضرۃ الاستاذ کے دست خاص کا ایک رقعہ لے کر تشریف لائے، جس کی نقل ہو بہو درج ذیل ہے:

''و إنه من سليمان و أنه بسم الله الرحمن الرحيم

مؤرخہ ۱۹ر فروری ۱۹۵۱ء

اعز عزیزان مولوی مسعود عالم صاحب ندوی حفظکم اللہ تعالیٰ وسلم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، اب آپ اپنے ضروری مشاغل سے فرصت پا چکے ہیں، اس لئے جی چاہتا ہے کہ آپ کو اپنے دارالغربہ میں کل رات کو بعد مغرب اپنے ساتھ کھانے کی زحمت دوں، آپ اور آپ کے میزبان سلطان صاحب اور آپ کے رفیق تشریف لا کر مسرور فرمائیں، برادرم مولوی ناظم صاحب اور حکیم نصیرالدین صاحب کو بھی بلا رہا ہوں۔

والسلام

سید سلیمان''

یہ بالکل نئی چیز تھی، سید صاحب قبلہؒ کے یہاں بارہا ٹھیرا ہوں اور بیسیوں مرتبہ کھانے پینے میں بے تکلفی کے ساتھ شرکت کی ہے۔ صرف سلمان میاں کا آجانا کافی تھا۔ دعوتی رقعہ کا اعزاز صرف اس اثر کے دور کرنے کے لئے تھا۔ مجھ پر طبعاً اس کا بہت اثر ہوا۔ سلمان میاں سے صرف اتنا کہا: ''مجھ نیازمند کے لئے رقعہ کی کیا ضرورت تھی؟ آپ کا تکلیف کرنا کافی سے زیادہ تھا''۔

خلاصہ یہ کہ سید صاحبؒ کا حسن اخلاق ضرب المثل تھا۔ مہمان نوازی بھی ان میں

کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کا لطف کچھ دیسنہ میں ان کے نوتعمیر بنگلہ پر آتا تھا۔ کراچی کے ''غربت کدہ'' میں وہ انشراح صدر اور فراغ خاطر کہاں نصیب؟

اس کے علاوہ سید صاحبؒ کے دوسرے عادات بھی بڑے پاکیزہ تھے۔ قہقہہ تو شاید کبھی ان سے ظہور میں آیا ہی نہیں، زیر لب مسکراتے، کبھی کبھی دانت کھل جاتے۔ لباس سادہ مگر صاف اور ستھرا غذا بہت کم۔ حیرت ہوتی تھی کہ ان کی زندگی کس طرح قائم ہے؟ طبیعت میں سخاوت اور فیاضی تھی، اسراف بھی نہیں، بڑی معتدل اور ستھری زندگی تھی۔ اس مختصر سی صحبت میں کیا کیا بیان کیا جائے؟

حواشی

(۱) ڈاکٹر محمد شمیم ایم بی بی ایس
(۲) مدرسہ عزیزیہ بہار شریف
(۳) حکیم حافظ قاری یوسف حسن خاں صاحب بہار شریف پٹنہ
(۴) جواں مرگ یوسف ندوی مرحوم (۱۹۲۵ء) رمضانپوری
(۵) غالبًا محبّ الدین خطیب کی نظر سے سیرت عائشہ کا ترکی ترجمہ گذرا ہوگا
(۶) الزہراء ہر لحاظ سے معارف کا مثنیٰ تھا
(۷) ندوہ پہنچ کر اس محبوب لقب سے کان آشنا ہوئے
(۸) سیرۃ النبی جلد چہارم میں حضرت الاستاذ نے اس کی پوری تحقیق فرمادی ہے
(۹) مولانا محمد ناظم ندوی
(۱۰) لال باغ لکھنؤ کا ایک محلّہ ہے جہاں نواب علی حسن خان صاحب مرحوم کی کوٹھی تھی
(۱۱) مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی (معتمد تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء)
(۱۲) شیخ خلیل بن محمد بن حسین ندوی (یمنی الاصل)
(۱۳) مولانا ابو اللیث ندوی اصلاحی اعظمی امیر جماعت اسلامی ہند رامپور
(۱۴) ندوہ کی روایات میں داخل تھا کہ دور دراز کے طالب علم لمبی چھٹیوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ ان کے گھر جاتے اور گھر کے افراد کی طرح وہیں چھٹیاں گذارتے

(۱۵) حضرۃ الاستاذ کے بڑے صاحبزادے سید ابو سہیل عظیم آبادی بی اے (علیگ)
(۱۶) چھوٹے صاحبزادے سلمان میاں سلّمہٗ اللہ
(۱۷) والد صاحب قبلہ کے پھوپھی زاد بھائی اور استاذ مولانا سید عبدالکبیر بہاری عمر بھر بنارس ہی میں مولانا ابوالقاسم کے والد مولانا محمد سعید کنجا ہی بنارسی کے دست راست کی حیثیت سے کام کرتے رہے، مولانا سعید کے نام صاحبزادی نے انہی سے تعلیم پائی، اور انہیں ''چچا'' کہتے تھے، اور مولانا عبدالکبیر صاحب کے صاحبزادے برادر محترم حافظ عبدالقدیر صاحب مولانا ابوالقاسم کو بڑے بھائی کہتے تھے۔
(۱۸) سید صاحب قبلہ، مولانا مودودی، مولانا اصلاحی اور خاکسار
(۱۹) ہلالی صاحب کا مستقل قیام بغداد ہی میں ہے، اس سال بون یونیورسٹی نے عراقی حکومت سے ان کی خدمات مستعار لی ہیں
(۲۰) مولانا محمد ناظم ندوی، شیخ الجامعہ، جامعہ عباسیہ، بہاول پور۔

سید صاحب کی یاد

مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندویؒ

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا نام نامی تو نہ جانے کب سے کانوں میں پڑا ہوا تھا، اور نہ کیوں ہوتا، سید صاحب علیہ الرحمہ کا وطن یعنی دیسنہ ضلع پٹنہ میرے گھر مخدوم پور ضلع گیا سے صرف سولہ سترہ میل ہی کے فاصلہ پر تو تھا، مولانا کے والد بزرگوار سید ابوالحسن صاحبؒ میرے گاؤں سے چار میل پر قصبہ اسلام پور میں ایک مدت تک رہ چکے تھے، ان کی نیکی، بزرگی، علم و فضل، اور عوام سے محبت کے فسانے سارے قرب و جوار میں مشہور تھے، غرض یہ کہ جن لوگوں کا ذکر بڑوں کی محفل میں سنتا تھا، ان میں دو بزرگ یہی تھے، مولانا شاہ بدرالدین صاحب پھلواری شریف کی خانقاہ کے صاحب سجادہ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ سیرۃ النبی کے مصنف۔

سید صاحبؒ کو پہلی بار دیکھنے کا اتفاق ۱۹۲۲ء کے آخری دنوں میں ہوا، اس وقت میری عمر کا گیارہواں سال شروع ہوا تھا، مجھے والد مرحوم مولانا اوسط حسین کے انتقال کے بعد ایک سال سے تعلیم کے لئے مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے سپرد کر دیا گیا تھا، اور میں گھر سے بہت دور مئو ضلع اعظم گڑھ میں رہتا تھا، وہاں مولانا عبدالرحمٰن صاحب کا مدرسہ مدرسہ عالیہ کے نام سے قائم تھا، مولانا مرحوم حضرت میاں نذیر حسین صاحب محدث دہلویؒ کے شاگرد اور والد مرحوم کے ہم سبق تھے۔

اس زمانہ میں تحریک ترک موالات کا زور تھا، جگہ جگہ جلسے ہوا کرتے تھے، مئو میں

بھی بہت بڑے پیمانہ پر ایک جلسہ ہوا، اور سید صاحبؒ اس جلسہ کی صدارت کے لئے اعظم گڑھ سے آئے، مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے مجھے ایک تقریر لکھ کر یاد کرا دی تھی، اس جلسہ میں مجھے یہ تقریر دہرانی تھی، مجھے وہ دن اب بھی اچھی طرح یاد ہے، اتنے عظیم الشان جلسہ میں جب میرا نام پکارا گیا، اور میں اپنی تقریر دہرانے کھڑا ہوا تو میرے پیر کانپ رہے تھے، اور سید صاحبؒ زیر لب تبسم کے ساتھ مجھے شاباش و آفریں کہتے جاتے تھے، ایک مسحور یا مخمور کی طرح میں نے وہ تقریر دہرا دی، خدا جانے صحیح الفاظ بھی ادا ہوئے یا نہیں، لیکن سید صاحبؒ نے میرے سر پر ہاتھ رکھا، دل بڑھایا۔

وہ دن اور نومبر ۱۹۵۳ء میں سید صاحبؒ کی وفات سے دو تین دن پہلے کا دن، مولانا بستر علالت پر تھے، اور میں چار پائی کے قریب فرش پر بیٹھا تھا، مولانا مسکرا کر محبت وشفقت کے ساتھ کچھ دیر باتیں کرتے رہے، اور میں بیالیس سالہ ادھیڑ بلکہ بوڑھا، بچہ بچیوں کی طرح باتیں کرتا رہا، مولانا نے پھر ایک بار سر پر ہاتھ رکھا، اور میں نے ٹھنڈک محسوس کی۔

۱۹۲۶ء کے آخری حصہ میں مجھے درس نظامیہ کی تکمیل کے بعد علم حدیث کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بھیج دیا گیا، اس زمانہ میں سید صاحبؒ وفد خلافت کے لیڈر کی حیثیت سے حجاز گئے ہوئے تھے، کچھ دنوں کے بعد مولانا واپس تشریف لائے، اور طلباء و اساتذۂ دارالعلوم کی طرف سے ان کا بڑا شاندار استقبال کیا گیا، میں نے اس تقریب استقبالیہ میں ایک قصیدہ پڑھا تھا، یہ میرا پہلا اور شاید آخری قصیدۂ مدحیہ تھا، نہ پہلے کبھی کسی کی مدح کی تھی، اور نہ پھر کبھی اتفاق ہوا، اس طفلانہ کوشش کے دو شعر یہ تھے:

بر سر اوج سما ابر خرامان آمد   مژدہ اے بلبل شیدا کہ بہاراں آمد
سید آمد بہ وطن روح بہ گروید بہ تن   گل رفتہ زچمن باز بہ بستاں آمد

اس دن کے بعد سے سید صاحبؒ اکثر دارالعلوم آتے رہے، اور علمی افاضات کا

سلسلہ جاری رہا، ۱۹۲۸ء میں تاریخ اسلام کے لکچر خود سید صاحب نے کئی ماہ ندوہ میں رہ کر ہمارے درجہ میں دئے۔

۱۹۲۹ء میں دارالعلوم سے تعلیم کی تکمیل کے بعد میں اپنے وطن آ گیا، استاذ محترم نے مجھے دارالمصنفین اعظم گڑھ میں طلب کیا، لیکن ٹھیک ان ہی دنوں میں مجھے رام پور کے سرکاری کتب خانہ میں بعض قلمی کتابوں پر کام کرنے کے لئے بلایا گیا تھا، اس لئے اس وقت میں اعظم گڑھ نہ جا سکا، رام پور میں کام کرنے کی ہامی بھر چکا تھا۔

اس کے بعد دارالمصنفین جانے کا بارہا اتفاق ہوا، گیا سے رسالہ ندیم جاری کیا تو سید صاحبؒ سے زبانی وتحریری اصلاح وہدایات حاصل ہوتی رہیں، حیدرآباد دکن کے طویل عرصۂ قیام کے دوران میں بھی بارہا اعظم گڑھ حاضر ہوا، اور بارہا مولانا خود حیدرآباد کسی نہ کسی کام سے گئے تو استفادہ کیا۔

سید صاحبؒ اپنے طلبہ کو جس محبت وشفقت کے ساتھ تعلیم دیتے تھے وہ اپنی آپ مثال تھی، چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر ٹوکتے تھے، لیکن اتنے شیریں انداز میں کہ کبھی طبیعت میں جھنجھلاہٹ پیدا نہ ہونے پاتی تھی۔

ندوہ کے دوران تعلیم کا ایک واقعہ ہے کہ میں بائیں ہاتھ میں کتاب لئے ہوئے درجہ میں جا رہا تھا، سید صاحبؒ کے آنے کی مجھے اطلاع بھی نہ تھی، عباسی ہال کے دروازے پر حضرت چند اساتذہ کے جھرمٹ میں کھڑے مل گئے، اور پیش قدمی کر کے خود ہی فرمایا، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، میں نے سلام کا جواب دیا اور بچ کر نکل جانے ہی کو تھا کہ ہاتھ بڑھا کر فرمانے لگے مصافحہ تو کر لو، میں نے ایک ہاتھ سے مصافحہ کیا، مسکرا کر خیریت پوچھی، اور کہنے لگے، ایک ہاتھ سے مصافحہ آپ نے فیشن کے ماتحت کیا یا روایت کے ماتحت، میں نے عرض کیا کہ روایت کے ماتحت، "المصافحة باليمنى" والی حدیث پڑھ کر سنائی، فرمانے لگے، لیکن جناب آپ جیسے طالب علم حدیث کو اس مسئلہ میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے، حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کی روایت آپ کو یاد نہیں کہ "كفى بين كفي

رسول اللہ صلى الله عليه وسلم"، اس کے بعد مولانا نے مصافحہ کی مختلف روایات سنائیں، ان پر بحث کی، روایات سے استنباط مسائل کا طریقہ بتایا، اور باتوں باتوں میں اتنا کچھ پڑھا دیا کہ مہینوں کے مطالعہ سے بھی بہ مشکل ہی حاصل ہوتا۔

ایک دن حیدرآباد دکن میں مولانا میرے ہاں تشریف فرما تھے، قرآن مجید میں جن قدیم اقوام کا ذکر ہے، ان کے کچھ تاریخی حالات پر میں باتیں کر رہا تھا، اہل علم کی ایک چھوٹی سی جماعت موجود تھی، مولانا نے بحث کے اختتام پر ایک بات کہی، اور اتنی محکم بات کہی کہ آنکھیں روشن ہوگئیں، فرمانے لگے، عزیزم! کیا قرآن مجید کے بیان سے زیادہ قابل وثوق کوئی تاریخی شہادت کہیں مل گئی ہے؟ اگر نہیں تو قرآن مجید کے بیان کو بعینہٖ تسلیم کرنا ہی پڑے گا، دوسرے بیانات وآثار سے ان کی تفصیل تو مہیا کی جا سکتی ہے لیکن ان کی توثیق وتردید کیوں کر ممکن ہوگی؟

سید صاحبؒ کی عادت تھی کہ جب کسی بات کی تحقیق نہ ہوتی وہ اسے بیان نہ کرتے تھے، عربی میں ایک مثل ہے: "لا أدري نصف العلم"، حق بھی یہی ہے کہ دعوائے ہمہ دانی کرنے والا ایسا جاہل ہوتا ہے کہ اپنی جہالت کا علم بھی اسے نہیں ہوتا، اہل علم کی ہمیشہ سے یہی شان رہی ہے کہ جس بات کی پوری تحقیق نہ ہو، اس پر قطعی رائے نہیں دیتے، اور تو اور خود حضرت امام اعظمؒ نے بارہا مسائل کا جواب دینے کے بجائے "لا أدري" کہا ہے۔

جس زمانہ میں خاکسار مولانا محمود حسن خاں مرحوم کی نگرانی میں معجم المصنفین کی تالیف کا کام کر رہا تھا، ایک مصنف احمد بن طغرل بک کا حال تلاش کرنے میں حیران تھا، یورپ کے مشاہیر مستشرقین کو لکھا، مسٹر مارگولیتھ نے جو جواب دیا وہ پایۂ تحقیق سے گرا ہوا تھا، میں نے مولانا کو وہ جواب بھیج کر ہدایت طلب کی، اور اپنے شبہات ظاہر کئے، جواب ملا کہ:

"خود تحقیق کر لو، چھٹی ساتویں صدی کے فقہاء پر میں نے کوئی تحقیقی کام نہیں کیا ہے، دوسرے علماء اور مستشرقین کی تخفیف نہ کیا کرو، یہ طریقہ اہل علم کی شان

سے بعید ہے، دوسروں کی تخفیف وتغلیط میں جو وقت صرف کیا جاتا ہے، ضائع ہوتا ہے، جب تک خود تحقیق نہ کرلو، کچھ نہ لکھو، دوسروں کی تحقیق کو اس وقت تک کے لئے قبول کرو جب تک خود تحقیق نہ کرلو"۔

پارسال میں جب انڈونیشیا سے واپس آیا، مولانا کی خدمت میں سلام کے لئے حاضر ہوا، حالات سفر اور انڈونیشی مسلمانوں کے احوال پوچھتے رہے، انڈونیشیا میں دین اسلامی کے مبلغ ملک ابراہیم گوجر کے متعلق بات ہورہی تھی، ان کے حالات مولانا نے کچھ بیان فرمائے، اور آخر میں فرمایا:

"یاد نہیں کہ کہاں ان کے حالات پڑھے ہیں، میری تحقیق نہیں، اتفاق سے دوران مطالعہ میں کہیں حالات دیکھے ہیں، تحقیق کرلینا، میری گفتگو پر بھروسہ نہ کرنا"۔

اتنے میں ایک صاحب تشریف لائے، مؤتمر عالم اسلامی کا ذکر نکل آیا، انہوں نے مولانا سے بہ اصرار کہا کہ قرآن مجید میں ایتمار کا مصدر اسی معنی میں آیا ہے، فرمانے لگے کہ قرآن مجید میں تلاش کرلیجئے، مجھے صرف اس قدر معلوم ہے کہ قرآن مجید میں یہ لفظ سورۂ طلاق میں صرف ایک جگہ زن وشو کے مابین مصالحت کے لئے آیا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

سید صاحب علیہ الرحمہ گفتگو میں بہت ہی محتاط تھے، اول تو وہ بہت ہی کم سخن آدمی تھے، اور جو کچھ فرماتے تھے اس میں بھی دعوے کا انداز کبھی نہیں اختیار کرتے تھے، مناظرانہ تحدی، سخت ایراد والزام ہمیشہ سطحی علم رکھنے والوں کا شیوہ رہا ہے، اہل علم اس سے پرہیز کرتے ہیں۔

دوسرے علوم وفنون میں سید صاحب کی جامعیت کے علاوہ یہ کہا جاتا تھا کہ تاریخ اسلام پر دنیا کے سب سے بڑے عالم یہی تھے، میں نے سید صاحب کے متعلق یہ تعریف مصر، عراق، حجاز اور شام میں بھی سنی، اور ہندوستان و پاکستان کے اہل علم ونظر سے بھی،

میری اپنی رائے اس سلسلہ میں کیا ہوسکتی ہے، میں اس کا اہل بھی نہیں کہ کوئی رائے دے سکوں، بڑی مشہور مثل ہے: "إنما يعرف من الناس ذوی الفضل ذووه"، کسی عالم کا مقام علم وعرفاں پہچاننے کے لئے بھی تو کچھ نہ کچھ علم وفضل چاہئے، اور اس ہیچ مداں کو علم وفضل سے اتنا حصہ بھی کہاں ملا ہے۔

خاکسار کے لئے تو حضرت علامہ کی ذات ایک شفیق استاذ، ایک محبت بھرے بزرگ کی ذات تھی، اور یہ کہہ سکتا ہوں کہ مشرق ومغرب کے سفر میں اس متانت وسنجیدگی، اس وسعت مطالعہ اور اس محبت وشفقت کا آدمی دیکھنے میں نہیں آیا، مجھے انہوں نے بارہا تنبیہ کی ہے لیکن اس طرح کہ ان کا ٹوکنا کبھی جبر نہیں نظر آیا، میرے چست چوڑی دار پائجامے پر انہوں نے مجھے ٹوکا، کہ ٹخنے سے نیچے تک پائچے خلاف سنت ہیں، ان کی ممانعت ہے، پھر اس میں کوئی خاص فائدہ بھی نہیں، کیا ضرورت ہے کہ آدمی بغیر ضرورت اتباع سنت کے اجر سے محرومی اختیار کرلے، لیکن جب کبھی میں دوسرے ممالک کے سفر پر روانہ ہوا تو میرے سوٹ کو کبھی برا نہ کہا۔

ایک دن لباس کے مسئلہ پر گفتگو ہورہی تھی، فرمانے لگے:

"اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے، ہر ملک، ہر نسل، اور ہر زمانہ کے لئے، اس لئے مسلمانوں کو کسی خاص لباس ووضع کا پابند نہیں کیا گیا۔

لباس تین ضروریات کی بنا پر پہنا جاتا ہے، حیا کے لئے، زینت کے لئے، اور عافیت کے لئے، اسلام نے ان میں حیا کو اولیت کا مرتبہ دیا ہے"۔

مولانا اس طرح معمولی بات چیت کے دوران میں بعض اتنی بڑی حقیقتیں بیان کردیتے تھے کہ برسوں کے مطالعہ سے ایک طالب علم وہاں تک پہنچ سکتا ہے۔

پٹنہ میں ایک بار مولانا کی خدمت میں ہم چند طلبہ حاضر تھے، مجھے ان دنوں سرزمین ہند میں مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ پر ایک مقالہ لکھنا تھا، ایک بڑی مشہور علمی کانفرنس میں یہ مقالہ پیش کیا جانے والا تھا، میں اس مقالہ کا خاکہ حضرت کی خدمت میں

پیش کررہا تھا، فرمایا:

''تمہیں معلوم ہے کہ عہد مامون کے بعد سے یوسف لنگاہ کے دور تک تقریباً ساڑھے چارسو سال کی تاریخ سندھ کے متعلق کافی معلومات کیوں نہیں ملتی ہیں؟ خود ہی جواب دیا کہ سندھ میں تاریخی تصانیف کا کوئی ذوق پیدا نہیں ہوا تھا، اور دربار خلافت سے منقطع ہوکر طوائف الملوکی نے عرب مصنفین کو ان سے بےتعلق بنادیا تھا''۔

سید صاحبؒ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے شاگرد کوئی درجہ دوم کی تحریر بھی لکھیں، ایک دن مجھے ایک کتاب کی اشاعت پر بڑی سختی سے تنبیہ فرمائی، اور کہنے لگے، ''کہ کسی موضوع پر لکھنے کا ارادہ اس وقت کرو جب بقدر امکان اس پر مطالعہ کرکے کافی مواد جمع کرلو، پھر اپنی تحریروں کو اشاعت کے لئے اس وقت تک نہ دو جب تک دوبارہ وسہ بارہ اس پر نظر ثانی نہ کرلو''۔ خاکسار اس زمانہ میں ایک روزنامہ کا چیف ایڈیٹر تھا، عرض کیا کہ حضور ہمارے پاس کسی تحریر کو دوبارہ وسہ بارہ پڑھنے کے لئے وقت ہی نہیں ہوتا، یہ کہاں ممکن ہے کہ مقالات پر بار بار نظر ثانی کی جائے، میں یہ عذر کرتا رہا لیکن مولانا اپنی بات پر اڑے رہے، اور یہی کہتے رہے کہ وقت نکالو۔

مولانا خود اس کے پابند تھے، وہ بڑی احتیاط سے لکھتے تھے، اور لکھنے کے بعد جس طرح بھی موقع ملے، تحریر کو دوبارہ وسہ بارہ ضرور دیکھ لیا کرتے تھے، ان کے ذوق مطالعہ وشوق تحقیق کا یہ عالم تھا کہ بیماری میں بھی کتابوں کا مطالعہ جاری رہتا، اکثر رات کو دیر تک مطالعہ کرتے، اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے آرام فرماتے، اور پھر بیدار ہوکر تہجد، نوافل، اور یاد اللہ۔

حیدرآباد کے مشہور علمی ادارہ دائرۃ المعارف العثمانیہ کی طرف سے ایک بار کانفرنس ہوئی، ملک کے مشہور اہل علم وتحقیق حضرات تشریف لائے، میں چند نوجوانوں کے ساتھ رات کو مہمان خانہ میں ان بزرگوں سے ملنے کے لئے حاضر ہوا، لوگ باتوں میں

مشغول تھے، کہیں کہیں پر قہقہے بھی سنائی دیتے تھے، ہم مختلف کمروں میں لوگوں سے ملتے ہوئے ایک کمرے کے سامنے پہنچے تو دیکھا کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ تنہا بیٹھے ہوئے کسی کتاب کی روٹوگراف کاپی پر غور کررہے ہیں، مقالہ کے اوراق سامنے پڑے ہوئے ہیں، اور قلم ہاتھ میں ہے، ہم نے سلام کیا، انہوں نے جیسے نیند سے چونک کر جواب دیا، خیریت پوچھی، اور اپنے کام میں لگ گئے، دوچار منٹ کے بعد ہم واپس آگئے، راستہ میں مجھ سے ایک نوجوان نے پوچھا، آپ کی رائے میں کس کا مقالہ اس کانفرنس میں سب سے بہتر قرار پائے گا، میں نے کہا سید صاحبؒ کا، آپ نے دیکھا کہ اس سے بار بار نظر ثانی کرنے کے بعد ان کے ذوق تحقیق کی سیری نہیں ہوئی ہے، حیدرآباد پہنچتے ہی انہوں نے حوالہ کے لئے کتب خانہ آصفیہ سے روٹوگراف کاپی منگوائی، اور اس وقت شاید دسویں بار اس کی نظر ثانی کررہے ہیں، میرا مقالہ بھی تو آپ نے دیکھا ہے، ایک بار لکھ لیا، زیادہ سے زیادہ دوسری بار اسے پڑھ لیا، اور کل کانفرنس میں دُہرادوں گا، بھلا اس قسم کے مقالوں کا سید صاحبؒ کے مقالے سے کیا مقابلہ ہوگا، اور واقعہ یہی ہوا کہ اس کانفرنس میں سب سے زیادہ قیمتی مقالہ سید صاحبؒ ہی کا مقالہ قرار پایا۔

برطانوی میوزیم لندن میں ملٹن کی ایک تحریر کا مسودہ رکھا ہے، ملٹن نے اس مسودہ پر سولہ مرتبہ نظر ثانی کی تھی، کہا جاتا ہے کہ علامہ ابن تیمیہ المتوفی ۷۲۸ھ نے اپنی ایک کتاب ''الرد علی المنطقیین'' کو ستائیس بار دیکھا تھا۔

بات یہ ہے کہ علم کی کوئی انتہا نہیں، اور جو شخص اپنی کسی بات کو انتہائے تحقیق قرار دے وہ ایک ایسا جاہل ہے جسے اپنے جہل کی بھی خبر نہیں، اس لئے اہل علم ہر اس چیز کو جسے دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں حتی الامکان بہتر سے بہتر شکل دینا چاہتے ہیں۔

سید صاحبؒ کی تصانیف میں سے ارض القرآن کو جو مقام حاصل ہے، اس سے اہل علم اچھی طرح واقف ہیں، یہ کتاب اپنے موضوع پر دنیا کی بہترین کتاب مانی جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود جب کبھی ان سے اس کے نئے ایڈیشن کی درخواست کی گئی، انہوں

نے اس پر نظر ثانی اور تکمیل واضافہ ضروری قرار دیا۔

بہت دن ہوئے ایک زمانہ میں حکومت حیدرآباد نے قانون ٹاڈ کی ترتیب کا فیصلہ کیا، دارالمصنفین سے درخواست کی گئی کہ اس کا مسودہ مرتب کرے، اور فقہ حنفی کی پابندی کے ساتھ مرتب کرے، ایک مدت کے بعد یہ مسودہ مرتب ہوا، اور حیدرآباد آیا، سید صاحبؒ کو تکلیف دی گئی کہ وہ حیدرآباد تشریف لاکر چند ماہ قیام فرمائیں، اور اس پر نظر ثانی کی جائے، مولانا نورالضیاء حیدرآباد کے مشہور فاضل اور ہائی کورٹ کے سابق جج کے ساتھ چند فاضل قانون داں حضرات اور سید صاحبؒ کئی ماہ تک اس کی نظر ثانی کرتے رہے، مولانا نورالضیاء نے یہ خدمت میرے سپرد کی تھی کہ ہر دفعہ اور ہر استثناء کا ماخذ فقہ حنفی سے ڈھونڈھ کر حاشیہ مسودہ پر بعینہٖ درج کردوں، یہ بڑا دلچسپ کام تھا، اتنے جلیل القدر علماء اور ایسے فاضل قانون دانوں کی بحثیں سننے کا موقع ملتا رہا، ان دنوں میں سید صاحب کو دیکھتا تھا کہ ایک طالب علم کی طرح محنت و دیدہ ریزی کے ساتھ جزئیات پر نظر ثانی کرتے تھے، اور اس پوری کمیٹی کے لئے ایک زندہ کتب خانہ اور حوالہ کی ایک جیتی جاگتی کتاب کا کام انجام دیتے تھے۔

اس کام کے دوران میں مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ سید صاحب مسلک کے اعتبار سے حنفی تو ہیں لیکن ایسے حنفی ہیں جیسے امام ابو یوسف، امام محمد اور امام زفر رحمہم اللہ تھے، یعنی وہ یہ خیال نہیں رکھتے کہ کسی ایک مسئلہ میں امام اعظمؒ کی رائے سے اختلاف رکھنا جرم ہے، یا اس اختلاف کی وجہ سے آدمی حنفی مسلک کا آدمی نہیں رہتا، نہ وہ قرآن وحدیث کی طرح فقہ کو غیر متبدل مجموعہ شرعی کا مقام دیتے ہیں، ہاں! وہ اسے البتہ ناپسند کرتے کہ بے وجہ کاہلی، شریعت کی پابندی سے آزادی حاصل کرنے کے جہالت کے باوجود کوئی مجتہد علی الاطلاق ہونے کا مدعی بن بیٹھے۔

وہ چاہتے تھے کہ فقہ کی تشکیل جدید کی جائے، تمدن جدید نے جو مسائل پیدا کئے ہیں ان کے لئے قرآن وحدیث کی روشنی میں حل پیدا کئے جائیں، وہ اسلامی تاریخ کے

سب سے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے، وہ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ نہ فقہ کے ابتدائی مرتبین نے اور نہ ان کے بعد ان کے عظیم المرتبت جانشینوں نے کبھی فقہ کو ہر زمانہ میں یکساں طور پر بغیر ترمیم واجب العمل قرار دیا تھا، اور نہ آج یہ ممکن ہے، اس لئے پھر سے مرتب ہو تو قابل عمل ہوگی ورنہ اس کے حصۂ معاملات پر پوری طرح عمل شاید آج ممکن نہ ہو سکے گا، بات یہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام میں سے صرف علامہ ندوی ہی وہ شخص تھے جو اسلامیات پر ماہرانہ نظر کے ساتھ دور حاضر کے مسائل سے واقف تھے، اس لئے وہ ان دقتوں سے بھی کماحقہ واقف تھے جو عمل کے سلسلہ میں پیش آسکتی ہیں، اور ان وسعتوں اور پابندیوں پر بھی نظر رکھتے تھے، جن کے مجموعہ کا نام شریعت اسلامی ہے۔

سید صاحب اگر چہ اپنی قوم کی ضروریات سے مجبور ہو کر سیاسی خدمات بھی انجام دیتے رہے، انہوں نے تحریک ترک موالات میں بڑا کام کیا، خلافت کانفرنس، اور جمعیۃ ہند و جمعیۃ علمائے اسلام کی صدارت کی، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے کچھ دنوں تک رکن بھی رہے، وفد حجاز کی قیادت کی، وفد خلافت کے رکن ہو کر لندن میں کام کیا، لیکن ان ساری خدمات اور اچھے سیاست داں ہونے کے باوجود سیاست کار نہ تھے، ان کو خداوند تعالیٰ نے ایک عالم ومحقق کی طبیعت عطا فرمائی تھی، اور یہی ان کا مزاج تھا، ان کو سیاست میں وہ انہاک نہ ہوتا تھا، جو سیاست کاری کے لئے ضروری ہے، وہ لندن میں برطانوی میوزیم کی لائبریری سے بے نیاز ہو کر ارکان پارلیمان سے ملاقاتوں میں وقت صرف کردینا اپنے لئے کچھ بہت اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

وہ اس دوعملی کو جو انگریزی سیاست کاری کی وجہ سے ہماری قومی تعلیم میں پیدا ہوگئی ہے، (اور) عربی مدارس اور انگریزی کالجوں کے درمیان کی خلیج ناقابل عبور بن گئی ہے، اپنی قوم کے لئے نہایت مضر سمجھتے تھے، انہوں نے اپنی ساری زندگی میں ہر مناسب موقع پر خطبات، اور تقریروں میں اس کے خلاف آواز اٹھائی، وہ چاہتے تھے کہ پورے نظام تعلیم کو یکسر بدل دیا جائے، اور ایک ایسا نظام پیدا کیا جائے جس میں ایک اچھا قانون

داں اچھا فقیہ بھی ہو، ایک انجینیر علم دین سے خاصا واقف نکلے، اور ایک گورنر خود صاحب افتاءِ عالم کی خدمت بھی انجام دے سکے، لیکن اس میں دونوں طرف سے ڈھیل ہی نہیں بلکہ کسی قدر مخالفتیں بھی ہوتی رہیں، دونوں گروہ اپنی اپنی مملکت کے حدود دوسرے گروہ والوں کے لئے حدودِ ممنوعہ بنائے رکھنے پر مصر رہا، اور اس کا جو نتیجہ نکلا وہ آج ہمارے اور آپ کے سامنے موجود ہے۔

علم وفضل کے اس مرتبۂ اعلیٰ کے علاوہ جس پر سید صاحب مرحوم فائز تھے، سید صاحب کی زندگی میں سیرت وکردار کی ایسی تابناکیاں موجود تھیں کہ:

یک نفس در صحبتے با اولیاء

بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

کا مشہور شعر ان کی محفل میں ایک حقیقت نفس الامری بن جاتا تھا، میں نے پچھلے اکتیس بتیس سال کی مدت میں کبھی ان میں نہ خشونت وسختی دیکھی، اور نہ مداہنت ومصلحت پرستی، پچاس سال کی مشغول مدت میں کسی معاصر نے یہ شکایت نہ کی کہ سید صاحب کے قلم یا زبان سے اسے کوئی گزند پہنچا ہے، وہ اپنی محفلوں میں معاصرین کا تذکرہ نہ مبالغہ کے ساتھ کرتے تھے اور نہ تخفیف واستہزاء کے ساتھ، یہی حال ان کی تحریروں کا تھا، آج بھی ان کے وہ نوٹ موجود ہیں جو مشاہیر کی وفات پر یا ان کی زندگی میں انہوں نے بعض لوگوں کے متعلق لکھتے ہیں، کہیں آپ کو یہ کمزوری نظر نہ آئے گی، اور تو اور، خود اپنے استاذ شبلی نعمانیؒ کے متعلق لکھ دیا کہ:

بہر حال شبلی شبلی تھے، جنید وشبلیؒ نہ تھے!

ایک بار کا ذکر ہے کہ یہیں کراچی میں ایک شخص نے ان کی خدمت میں ایک واقعہ بیان کیا، ایک صاحب کے وہ الفاظ نقل کئے جو انہوں نے سید صاحب کے متعلق کہے تھے، الفاظ کیا تھے خاصی گالیاں تھیں، اور وہ بھی بے جا، بے قصور، اور بلاوجہ، لیکن سید صاحبؒ نے ایک خاموشی کے ساتھ برداشت کرلیا، جب بیان کرنے والے صاحب

جانے لگے تو بڑے اطمینان اور نہایت شفقت کے ساتھ انہیں سمجھا دیا کہ ایک جگہ سنی ہوئی بات دوسری جگہ پہنچانا کچھ اچھا کام نہیں، گناہ ہے، آپ نے جن صاحب کا ذکر کیا میں ان کی خوبیوں کا قائل ہوں، ان کے درشت الفاظ سے میں اپنی رائے نہیں بدل سکتا، چلو بات ختم ہوئی، بیان کرنے والے صاحب کی ایسی اصلاح ہوئی، کہ پھر دو تین سال کی مدت میں انہیں ایسی باتیں کرتے میں نے نہیں دیکھا۔

ایک زمانہ میں حیدرآباد دکن سے سید صاحب کے نام مبلغ دوسو روپیہ ماہانہ کا علمی وظیفہ جاری ہوا، فرمان شاہی ہوگیا تھا، کچھ دفتری اندراجات میں پیروی کی ضرورت تھی، میں نے عرض کیا کہ فرمائیں تو میں اس کے دفتری مراحل طے کرادوں، ایک دن تو فرمایا کہ بہت اچھا، صیغۂ حساب میں جاکر پیروی کردینا، دوسرے یا تیسرے دن جب میں نے پھر عرض کیا تو فرمانے لگے، جانے دو، نظام چاہتے ہیں کہ اس وظیفہ کے بدلے میں میرا ایمان خریدلیں، اب مجھے یہ وظیفہ منظور نہیں، مجھے حیرت ہوئی جب دریافت حال کیا تو معلوم ہوا کہ ایک اجتہادی مسئلہ میں نظام نے مولانا سے اپنے موافق رائے کی درخواست کی تھی، مولانا نے نہ صرف اختلاف کیا بلکہ منظورہ وظیفہ سے بھی متنفر ہوگئے۔

اسی طرح ایک بار مجلس اتحاد المسلمین کے مرکز دارالسلام میں سید صاحب تقریباً بیس پچیس ہزار کے مجمع کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کے حالات بتارہے تھے، تقریر کے اختتام پر ایک نوجوان نے سوال کیا، کہ مولانا اسلام میں بادشاہ کا کیا مقام ہے؟ حیدرآباد کی دنیا میں جہاں مطلق العنان بادشاہت کارفرما تھی، اور شاہی چشم وابرو کے اشاروں سے قسمتیں بدل جاتی تھیں، اس قسم کے سوالات کا جواب دینا کچھ آسان کام نہ تھا، مصلحت بینی کو بہتوں کے ایمان وتقویٰ پر غالب آتے ہوئے میں نے دیکھا ہے، سوال سن کر میں اور سارا مجمع گوش برآواز ہوگیا، لوگ نہ جانے کس کس طرح الفاظ کے گورکھ دھندے میں جواب کے گم ہونے کی امید کررہے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ اپنی رحمتوں میں جگہ دے علامہ سید سلیمان ندویؒ کو، انہوں نے نہایت اطمینان وسکون کے ساتھ واضح الفاظ میں

اعلان کردیا کہ:

''اسلام میں کسی قسم کی بادشاہت کے لئے کوئی گنجائش نہیں، اور نہ کسی غاصب اختیارات کی اطاعت کرنا جائز ہے''۔

سارا مجمع چپ تھا، اور تو اور، نواب بہادر یار جنگ چپ تھے، اور بولے تو صرف اسی قدر ''سبحان اللہ وبحمدہ، حق تو یہی ہے جو حضرت نے فرمایا''۔

اس حق گوئی کا نتیجہ وہی نکلا جو متوقع تھا، دوسرے ہی دن مولانا کو حیدرآباد میں تقریروں سے ممانعت کردی گئی، اور شاید تیسرے چوتھے دن مولانا وہاں سے واپس چلے آئے، یہ مضمون طویل ہوتا جارہا ہے، حالانکہ ارادہ چند سطور میں اپنے تأثرات قلم بند کرنے کا تھا اسلئے یہیں ختم کرتا ہوں، علامہ سید سلیمان پر بہت کچھ لکھا جائے گا، اور یقیناً لکھا جانا چاہئے، کسی قوم میں اتنے بڑے لوگ روز روز نہیں پیدا ہوتے، اقبال نے سچ کہا ہے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

سید صاحبؒ

(نقوش وتأثرات)

سید رئیس احمد جعفری ندویؒ

مجھے اپنے والد کی صورت یاد نہیں، لیکن ان کا سانحۂ وفات خواب سا یاد ہے، گھر میں کہرام مچا ہوا تھا، میں حیران وپریشان ادھر ادھر دیکھ رہا تھا، کہ اتنے میں شبرتیا آئی، یہ ہمارے گھر کی پروردہ تھی، اگر چہ عجیب الخلقت تھی، یعنی نوجوان مردوں کی طرح مسیں بھری ہوئی تھیں، اور سبزہ آغاز بھی تھی، لیکن میں اس سے مانوس بہت تھا، وہ خود بھی رو رہی تھی، بار بار اپنے دوپٹہ سے آنسو پونچھتی تھی، اس نے میری انگلی پکڑی، اور پڑوس کے ایک گھر میں لے گئی، وہاں کے بچوں نے مجھے گھیر لیا، اور میں گھر کا سانحۂ عظیم بھول کر ان کے ساتھ کھیل میں لگ گیا، خدا نے ماں ایسی دی تھی جس نے پورے طور پر باپ کی قائم مقامی کا فرض ادا کیا، والدہ نے میری اور میرے بڑے بھائی سید عقیل احمد جعفری کی جس استقلال وعزیمت کے ساتھ تربیت کی، اس کی مثال کم ملے گی، ہر طرح کے ناموافق حالات کا انھوں نے مردانہ وار مقابلہ کیا، اور اپنا کام جاری رکھا، والد کے انتقال کے وقت بھائی صاحب انگریزی مدرسہ میں پڑھ رہے تھے، میں اگر چہ ابھی تعلیم وتدریس کی پابندیوں سے آزاد تھا، پھر بھی گھر پر ایک حافظ جی رکھ لئے گئے، انھوں نے قرآن شریف سے تعلیم کا آغاز کیا، والدہ کی نیت یہ تھی کہ ایک بیٹا انگریزی پڑھے، اور دوسرا عربی، کچھ عرصہ بعد والدہ

اپنے والد سید نیاز احمد صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پاس بھوپال چلی گئیں، وہاں پھر ایک حافظ صاحب تلاش کئے گئے، بھوپال کی آب وہوا راس نہ آئی، چند ماہ کے بعد ہمارا قافلہ وطن واپس پہنچا، اور ازسرنو حافظ کی تلاش شروع ہوئی، کوئی معقول آدمی نہ ملا تو غم جدائی برداشت کرکے لکھنؤ مدرسہ فرقانیہ میں بھیج دیا، کچھ دن وہاں گزرے، لیکن بھائی صاحب مچل گئے، ''معارف'' بڑے بابا (حضرت ریاض) کے پاس آتا تھا، معارف پڑھتے پڑھتے وہ مولانا سید سلیمان ندوی کے بڑے قائل اور معترف ہوگئے تھے، ہر وقت ان کا ذکر کرتے، اور والدہ سے اصرار کرتے کہ مجھے ندوہ بھیج دیں، جب یہ سوال اٹھتا بڑے بابا بھی ان کی پُرزور تائید کرتے، نتیجہ یہ ہوا کہ میں ندوہ میں داخل کر دیا گیا، یہ ۱۹۲۴ء کا واقعہ ہے، میری عمر اس وقت ۱۰-۱۱ر سال کی تھی، ندوہ میں داخل ہوتے وقت میرے دل میں دبا ہوا ایک شوق یہ بھی تھا کہ مولانا سید سلیمان ندوی کو دیکھوں گا، لیکن وہ وہاں کہیں نظر نہ آئے، اب میں اپنے ذہن میں ان کی تصویر تصور کے موئے قلم سے بنانے لگا، ممکن ہے وہ سیتاپور کے حافظ کلّو کی طرح نابینا اور سیاہ رو ہوں، ممکن ہے وہ خیرآباد کے مولوی حفیظ الدین کی طرح چگّی داڑھی والے اور دراز قد ہوں، ممکن ہے وہ بھوپال کے قاری بختیار کی طرح خوش گو اور خوش اندام ہوں، ممکن ہے وہ مدرسۂ فرقانیہ کے حافظ معصوم علی کی طرح بڑی بڑی آنکھوں والے اور ہر وقت ہنسنے والے ہوں، لیکن وہ کہاں ہیں؟ کیوں نہیں آتے؟ کب آئیں گے؟ اُن میں اور ندوہ میں اتنا بُعد کیوں ہے؟ بھائی صاحب تو کہا کرتے تھے ندوہ انہی کی ذات سے قائم ہے۔

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

دن گزرتے گئے، یہاں تک کہ تعلیم کا پہلا سال ختم ہوگیا، رفتہ رفتہ سید صاحب کو دیکھنے کا اشتیاق بھی مرور ایام کی نذر ہوگیا، البتہ کبھی کبھی ایک بات ضرور دل کو پریشان کرتی تھی، بھائی صاحب ضرور دریافت کریں گے، تم نے سید صاحب کو دیکھا؟ پھر میں کیا جواب دوں گا؟ لیکن دنوں کے گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ کھٹک بھی ختم ہوگئی۔

ندوہ کا دوسرا تعلیمی سال شروع ہوا، بورڈنگ ہاؤس میں صبح ۹ر بجے کھانا ملتا تھا، اور شام کو مغرب کے فوراً ابعد، کبھی کبھی دیر ہوجاتی کھانے پکنے میں، تو یہ وقت دریائے گومتی کے کنارے کھیل کود اور بات چیت میں صرف ہوتا، گومتی اور ندوہ میں صرف ایک سڑک حائل ہے۔

ایک روز کھانے میں کچھ دیر تھی، اور لڑکے مختلف ٹولیاں بنائے ہوئے، ادھر ادھر مٹر گشت کر رہے تھے، ندوہ میں حفظ مراتب اور چھوٹے بڑے کا بہت خیال رہتا تھا، ایک چھوٹا لڑکا ایک بڑے لڑکے کا اتنا ہی احترام کرتا تھا، جتنا ایک چھوٹا بھائی کا کرسکتا ہے، چنانچہ جب ٹولیاں بنتی تھیں، چھوٹوں اور بڑوں میں حد فاصل قائم رہتی تھی، تھوڑی دیر میں دیکھتا کیا ہوں، ایک بڑے طالب علم عبدالسلام صاحب صفا کے ساتھ ایک وجیہ اور خوش شمائل مولانا ڈائننگ ہال کی طرف بڑھ رہے ہیں، اور بہت سے بڑے لڑکے ادب وتمیز سے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں، ان صاحب کی وضع ندوہ کے عام اساتذہ سے بالکل مختلف تھی، سر پر سفید براق عمامہ، سیاہ داڑھی، شیروانی کے تمام بٹن گلے تک لگے ہوئے، ہاتھ میں ایک چھڑی، چہرہ دل آویز، سحر انگیز آنکھیں، پتلے پتلے ہونٹ، آواز نہ پست نہ بلند، لیکن اس میں ایک خاص قسم کا وقار، ہونٹ تبسم سے آشنا، زبان جواب دینے میں مصروف، باتیں کرنے والے طالب علموں میں ہر شخص بے تکلف بھی، اور مؤدب بھی۔

مجھے اشتیاق پیدا ہوا، یہ کون بزرگ ہیں؟ ایک سے پوچھا، دوسرے سے پوچھا، لیکن کوئی جواب نہیں دیتا، اور وہ قافلہ کے ساتھ ساتھ چلنے میں ہمہ تن منہمک، چند قدم کا فاصلہ تھا، ذرا دیر میں ڈائننگ ہال پہنچ گئے، یہاں پہنچ کر معلوم ہوا یہ ہیں مولانا سید سلیمان ندوی.....، آہا یہ ہیں؟ اب کیا تھا، بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا میں بھی پہنچ گیا، لیکن ہر طرف سے دھکے دے کر نکالا گیا، ....کوفت ضرور ہوئی، لیکن کوفت پر مسرت غالب تھی، مولانا سید سلیمان کو دیکھ لیا، گھر پہنچوں گا تو سب سے پہلے بھائی صاحب کو ''آنکھوں دیکھا حال'' سناؤں گا!

اب سید صاحب بار بار ندوہ آنے لگے، اور انہیں دیکھ دیکھ کر جی خوش ہونے لگا، لیکن یہ فصل بہار جلد ہی ختم ہوگئی، جلد ہی اندازہ ہوگیا، چھوٹے لڑکوں کے لئے سید صاحب درشت مزاج بھی ہیں، اور سخت گیر ممتحن بھی، ذرا سی غلطی پر رکھائی سے سے ٹوکتے ہیں، اور (ایک مرتبہ نہیں) ہر ملاقات میں اگلا پچھلا سبق ضرور پوچھتے ہیں، یہاں یہ کیفیت کہ سالانہ امتحان وبال جان بنا ہوا تھا، یہ بار بار کا امتحان دینے پر کون تیار ہوتا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ سید صاحب سے جی کھٹا ہوگیا، طبیعت بجھ گئی، اب وہ آتے تو خوشی نہ ہوتی، طبیعت منغض ہوجاتی، نہ جانے کس غلطی پر ٹوک بیٹھیں، نہ جانے کیا سوال کر ڈالیں؟

یہ کیفیت میری ہی نہیں کئی بڑے طالب علم بھی اس مرض میں مبتلا تھے، مثلاً سید سعید اشرف صاحب ندوی کا شمار طلبائے کبار میں ہوتا تھا، عربی ادب پر طالب علمی ہی کے زمانہ میں اچھا درک حاصل کرلیا تھا، برجستہ عربی تقریر اور فی البدیہہ عربی تحریر کے لئے اکثر اساتذہ کی طرف سے وہ دوسرے معزز مہمانوں کے سامنے پیش کئے جاتے، سید صاحب ان کی کافی قدر کرتے تھے، لیکن یہ

نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی

کی مصیبت میں گرفتار رہتے، نمایاں اور ممتاز طالب علم تھے، لہذا کیری بن کر پتوں کی آڑ میں نہیں چھپ سکتے تھے، اتفاق کی بات سالانہ امتحان میں مضمون میں اچھے نمبر حاصل کئے، لیکن فلسفہ کے مضمون میں چند نمبروں سے فیل ہوگئے، مہتمم صاحب کی سفارش پر معتمد تعلیمات یعنی سید صاحب نے ترقی دے دی، ترقی حاصل کرنے کے بعد پہلی مرتبہ سعید اشرف صاحب سید صاحب کے سامنے آئے، سید صاحب نے چھوٹتے ہی سوال کیا:

''کہئے امتحان میں پاس ہوگئے آپ؟'' بڑا چبھتا ہوا سوال تھا! کسی اور نے یہ سوال کیا ہوتا تو شاید سعید اشرف صاحب علی الاعلان اپنے پاس ہونے کا اقرار کرلیتے، لیکن یہ سوال وہ کررہا تھا جس نے ترقی دی تھی، سعید اشرف صاحب سٹ پٹا گئے، بے ساختہ فرمایا:

''جی میں ''مترقی'' ہوں.....''

سید صاحب نے فوراً ٹوکا،

''مترقی'' کس کو کہتے ہیں؟.......ذرا اس لفظ کی تشریح تو کیجئے!؟

اگر کسی جلسۂ عام میں سعید اشرف صاحب کے فیل ہونے کا یہ بانگ دہل اعلان کیا جاتا تو بھی شاید ان کی یہ حالت نہ ہوتی، جو اس وقت نظر آرہی تھی، جواب دیا وہ بھی غلط!.....اور حالت یہ کہ زبان لڑکھڑا رہی تھی، پاؤں کانپ رہے تھے، اتنے میں کاشغری صاحب آگئے، اور سعید صاحب کی جان بچی، لیکن جان بچی کہاں، وہ تو جا چکی تھی، بہت دیر کے بعد، بلکہ بہت دنوں کے بعد واپس آئی۔

شروع میں جتنا حسن ظن میرے دل میں سید صاحب کا تھا وہ اب دہشت اور خوف میں تبدیل ہوگیا، ڈرانے کے لئے مولانا محمد سلیم، مولانا کلیم احمد اور مولانا محمد شبلی فقیہ کیا کم تھے، کہ اور ہستی نمودار ہوگئی، جس سے ڈرنا من جملۂ واجبات بن گیا، مجھے اگر فطرت کی طرف سے کچھ ذہانت عطا ہوئی تھی، تو وہ صرف اس کام میں صرف ہونے لگی کہ میری اور سید صاحب کی بورڈنگ کے کمرہ یا تعلیم کے درجہ میں مڈبھیڑ نہ ہونے پائے، اور جہاں تک مجھے یاد ہے میں اس مقصد جلیل میں پوری طرح کامیاب رہا، یعنی کبھی اس کی نوبت نہیں آئی کہ میں ان کی زد پر آگیا ہوں، انھوں نے مجھے ٹوکا ہو، یا میرا امتحان لیا ہو، لیکن ''بکری کی ماں کب تک خیر مناسکتی تھی''۔ کئی سال بعد ایک روز آمنا سامنا ہو ہی گیا، میں غالبًا درجہ چہارم میں پڑھتا تھا، ایک روز دفعۃً سید صاحب تشریف لے آئے، اور بجائے اس کے کہ حسب معمول امتحان لیں، دریافت فرمایا:

''اس درجہ میں رئیس احمد کون لڑکا پڑھتا ہے؟''

اس اعزاز پر سب کی نظریں میری طرف اٹھ گئیں، اور اس ابتلا پر میری نظریں جھک گئیں، اب کیا ہوگا؟ میں اپنی جگہ بت بنا کھڑا رہا، سید صاحب میرے قریب ہی کھڑے تھے، اور زیادہ قریب آگئے، فرمایا:

"ماجد میاں (۱) تمہاری ذہانت اور سلامت روی کی تعریف کرتے ہیں، تم مجھ سے کیوں نہیں ملتے؟"

میں نے عرض کیا،

"اب حاضر ہوا کروں گا!"

بات ختم ہوگئی، سید صاحب تشریف لے گئے، اور میں سوچنے لگا، یہ تو بڑی مشکل ہوئی، ماجد میاں میں اور سید صاحب میں زمین آسمان کا فرق ہے، وہ شگفتہ روئی سے ملتے ہیں، ہنستے ہیں، ہنساتے ہیں، امتحان کبھی نہیں لیتے، صرف ایک مرتبہ امتحان لیا تھا، "اللّٰہ یستھزء بھم و یمدّھم فی طغیانھم" پڑھ کر "یعمھون" کے معنی پوچھے تھے، لیکن میری گھبراہٹ دیکھ کر خود ہی جواب دے دیا، اور پھر کبھی اس طرح کی کوئی بات نہیں کی، اپنے ساتھ تانگہ میں بٹھا کر کبھی فرنگی محل لے جاتے ہیں، کبھی الناظر بک ایجنسی، راستہ بھر اچھے اچھے اشعار سناتے ہیں، مزے مزے کی باتیں کرتے ہیں، ان سے تو نبھ رہی ہے، لیکن یہ؟ یہ ضرور کسی لفظ کی تعلیل، کوئی گردان، کسی جملہ کی ترکیب، کسی بیڈھب لفظ کے معنی پوچھیں گے، اور ذرا سی غلطی پر جھاڑ کر رکھ دیں گے پھر کیا ہوگا؟ لیکن اسی زمانہ میں ایک واقعہ ایسا پیش آیا، جس نے میری دہشت نکال دی، اور میری مشکل حل کر دی۔

ہوا یہ کہ ایک روز سید صاحب درجہ میں تشریف لائے، انھوں نے چاک سے بلیک بورڈ پر لکھا:

"حسب ذیل الفاظ چھوٹے چھوٹے عربی جملوں میں کھپایئے:

(۱) چھری (۲) میز (۳) ہیٹ (۴) دیاسلائی (۵) لوٹا۔

سب لڑکے سر جھکا کر لکھنے کی کوشش کرنے لگے، میرے پاس میرے ایک ہم وطن دوست بیٹھے تھے، وہ ٹوٹے پھوٹے جملے تو کسی نہ کسی طرح بنا لیتے تھے، لیکن اللہ اور رسول کے علاوہ شاید کوئی عربی نام انہیں یاد نہیں تھا، جب اس طرح کا مرحلہ پیش آتا، وہ ساتھ والوں کے حافظہ سے فائدہ اٹھا کر کام چلا لیتے، آج میری باری تھی، وہ میرے پاس

تشریف فرما تھے، میں ابھی ایک جملہ بھی نہیں لکھ پایا تھا کہ اختر نے ٹھوکا لگایا، اور رازدارانہ انداز میں سرگوشی کرتے ہوئے پوچھا:

"چھری کی عربی کیا ہے؟"

میں نے کہا:

"سکّین"..... لیکن اب نہ پوچھنا، خود میری جان پر بنی ہوئی ہے، اور کہیں باتیں کرتے سید صاحب نے دیکھ لیا تو اور غضب ہو جائے گا!.... لیکن اختر ایسی باتیں سننے کے عادی نہیں تھے، جو مطلب کی نہ ہوں، تھوڑی دیر میں پھر انھوں نے ٹھوکا لگایا، اور پوچھا:

"میز کی عربی کیا ہے؟"

میں نے کہا: "الغندوز"

انھوں نے لکھ لیا،..... پھر دریافت کیا:

"ہیٹ کو کیا کہتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا: "الخراطیس"

یہ بھی جلدی سے لکھ لیا، شاید وہ ایک ہی دفعہ میں سب الفاظ لکھ لینا چاہتے تھے، پھر فوراً سوال ہوا:

"اور دیاسلائی؟"

میں نے پورے اطمینان کے ساتھ بتایا: "الحمراء"

یہ بھی نوٹ کر لیا، اب ایک ہی لفظ رہ گیا تھا، پوچھا:

"لوٹا؟..... لوٹے کو کیا کہتے ہیں؟"

"الغبراء لکھ لو!"

بیچارے نے پوری سعادت مندی سے یہ بھی لکھ لیا۔

دس پندرہ منٹ کے بعد ہم نے اپنی اپنی کاپیاں سید صاحب کی خدمت میں پیش کر دیں، غلط جملے کاٹ دئے، قابل اصلاح جملوں پر اصلاح دے دی، سب کی کاپیاں مل

گئیں، لیکن اختر صاحب یونہی بیٹھے رہے، سید صاحب نے پوچھا:

''یہ کاپی کس کی ہے؟'' اختر صاحب انعام کی امید میں کھڑے ہوگئے، سید صاحب نے انہیں ایک نظر دیکھا، اور فرمایا:

''یہاں آیئے!''

خوش خوش پہنچے، سید صاحب نے پوچھا:

''آپ نے یہ الفاظ کس لغت میں دیکھے ہیں؟''

کہیں دیکھے ہوتے تو بتاتے، چپ! اب کی سید صاحب نے بارعب اور بلند آواز میں فرمایا:

''آپ الفاظ تصنیف کرتے ہیں؟......!''

اختر صاحب کی سٹی گم ہوگئی، لیکن فوراً ہی وہ اعلائے کلمۃ اللہ پر تُل گئے، انہوں نے میری طرف اشارہ کرکے بڑے معصوم لہجہ میں فرمایا:

''انہوں نے بتائے ہیں!''

اب میری پیشی ہوئی، سید صاحب نے ایک تبسم کے ساتھ پوچھا:

''یہ کیا حرکت تھی؟''

میں نے کہا: ''پہلا لفظ میں نے صحیح بتایا تھا، اور منع کر دیا تھا، اب نہ پوچھنا، لیکن یہ پوچھتے گئے، میں نے بھی جو جی میں آیا بتا دیا۔''

سید صاحب نے شفقت بھری نظروں سے مجھے دیکھا، مسکرائے، اختر کو کاپی دی، اور واپس چلے گئے!

اسی تبسم نے مجھ سے کہا: ''سید صاحب کو تم نے غلط سمجھا ہے!'' میں نے مان لیا، اور ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگا، البتہ اتنی احتیاط ضرور کرتا تھا، قبل اس کے کہ سید صاحب کوئی سوال مجھ سے کریں، میں خود کوئی اشکال بیان کرکے انہیں جواب دینے پر مجبور کردوں!

زمانہ آگے بڑھ رہا ہے؛ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوں۔

ندوہ کی زندگی میری رگ رگ میں سرایت کرچکی ہے، ندوہ کے سانچہ میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی مسلسل کوشش کررہا ہوں، سید صاحب سے اب اجنبیت نہیں رہی، انس پیدا ہوگیا ہے، وہ آتے ہیں تو وقت کا زیادہ حصہ انہی کی خدمت میں صرف کرتا ہوں، ان کے حلقۂ درس میں بیٹھتا ہوں، ان سے استفادہ کرتا ہوں، ان کی تقریریں سنتا ہوں، ان کے مضامین پڑھتا ہوں، ان کی کتابیں پڑھتا ہوں، جو بات سمجھ میں نہیں آتی، بے تأمل پوچھتا ہوں، وہ میری تقریریں سنتے ہیں، اصلاح دیتے ہیں، تیاری کے اصول بتاتے ہیں، مغز اور مواد کی طرف متوجہ کرتے ہیں، مضامین دیکھتے ہیں، حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں، نکات بتاتے ہیں، رخ بدلنے کی کوشش کرتے ہیں، ایک مرتبہ ہم چند دوست ان کی دعوت کرتے ہیں، وہ از راہ شفقت تشریف لاتے ہیں، اسی زمانہ میں ''نگار'' میں میرا ایک چھوٹا سا مضمون چھپا ہے، اس کا ذکر کرتے ہیں، اور فرماتے ہیں، یہ مضمون اگر زیادہ تیاری کے ساتھ تم لکھتے تو مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوسکتا تھا، میں جواب میں ندوہ پر اور خود ان پر تنقید کر ڈالتا ہوں، میں گستاخ لب ولہجہ میں کہتا ہوں.....ندوہ ہمیں صرف کتابیں پڑھاتا ہے، اور کچھ نہیں سکھاتا، آپ کو مولانا شبلی نے تیار کیا، ہمیں کوئی نہیں تیار کرتا، وہ آپ کو عنوانات دیتے تھے، ماخذ بتاتے تھے، پھر کانٹ چھانٹ کرتے تھے، ہم نہ لکھیں تو کوئی اکساتا نہیں، لکھیں تو بڑھاتا نہیں، ہم خود ہی اپنے معلم ہیں، خود ہی مربی، خود ہی ہدایت کار، جی چاہے لکھیں، جی چاہے، نہ لکھیں خواہ امام بخاری پر لکھیں، خواہ ٹیگور پر، ہم سبزۂ خود رو ہیں، خود ہی ابھرے ہیں، خود ہی دب جائیں گے، آپ کی طرح تھوڑی، کہ قدم قدم پر استاد کی ہدایت، رہنمائی، اصلاح۔

عبدالسلام صاحب قدوائی دم بخود تھے، حامد علی سرد کی طرح خاموش اور ''پابہ گل''..... کیونکہ اصل میزبان وہی تھے، اور میں اپنی کہے چلے جارہا تھا، یقین تھا آج سید صاحب ضرور خفا ہوں گے، اور اس گستاخی پر بری طرح ڈانٹیں گے لیکن میں نے نظر

اٹھا کر دیکھا تو ان کے ہونٹوں پر تبسم کھیل رہا تھا، آنکھوں سے شفقت کی بارش ہو رہی، بلکہ اگر میں یہ کہوں تو شاید مبالغہ نہ ہو کہ اعتذار کا رنگ بھی جھلک رہا تھا۔

پھر بڑی شفقت کے ساتھ فرمایا:

''ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے.....انتظار کیجئے!''

اور کچھ مدت گزر گئی!.....!

مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی تفسیر قرآن کا درس دیتے تھے، شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' پڑھاتے تھے، مولانا سید علی زینبی اصول فقہ کی کتاب ''توضیح تلویح'' پڑھاتے تھے، مولانا عبدالودود صاحب اعظمی ابن سینا کی کتاب ''نجاۃ'' کا درس دیتے تھے، اور یہ حضرات، اپنے اپنے فنون کی اقلیم پر شہریاری کرتے تھے، اپنے موضوع پر سند سمجھے جاتے تھے، سید صاحب کی عظمت دل میں تھی، عربی ادب پر ان کی مہارت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا، لیکن اس کا وہم وگمان بھی نہیں تھا کہ وہ صحیح معنی میں جامع معقول ومنقول ہیں، ایک مرتبہ مولانا صدیقی کے گھنٹہ میں تشریف لائے، اور قرآن کے ''ربط آیات'' پر ایک ایسی دل نشیں اور مدلل ومسکت تقریر فرمائی کہ آنکھیں کھل گئیں، کتاب الاغانی کی وہ حکایت یاد آگئی کہ ایک مشہور گویّا ابراہیم موصلی اپنے فن کار لڑکے اسحٰق موصلی کو لے کر ایک مشہور گویئے معبد کے پاس پہنچا، اور استدعا کی، کچھ سنایئے، اس نے نئی لے میں نیا راگ سنایا، واپسی میں بیٹے سے باپ نے پوچھا:

''کہو بیٹے، کیسا پایا تم نے اس مغنّی کو؟''

بیٹے نے کہا: ''پدر محترم، آج سے پہلے تک دنیا میں آپ سے اچھا کوئی مغنّی میری نظر میں نہ تھا، لیکن معبد کا گانا سن کر آپ ہیچ رہ گئے؟''

باپ نے بیٹے کی پیٹھ ٹھونکی، اور بہت سا انعام دیا، مجھ سے اگر مولانا صدیقی سید صاحب کے درس کے بارے میں پوچھتے تو میں وہی کہتا، جو اسحٰقؑ نے اپنے باپ ابراہیمؑ سے کہا، خواہ مولانا میری پیٹھ ٹھونکتے یا سر۔

مولانا حفیظ اللہ خود سید صاحب کے استاد تھے، اور سید صاحب ان کا بے حد احترام کرتے تھے، لیکن ایک مرتبہ حجۃ اللہ البالغہ کے درس میں ''حظیرۃ القدس'' پر سید صاحب نے جو تقریر فرمائی، وہ آج تک کانوں میں گونج رہی ہے، مولانا حفیظ اللہ دوسروں کے کمالات کا اعتراف کرنے میں بڑے بخیل تھے، علامہ شبلی کے معاصر تھے، اور ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے، سید صاحب کے بھی وہ زیادہ قائل نہیں تھے، البتہ جب ہم انہیں یہ یاد دلا دیتے تھے کہ وہ آپ کے شاگرد بھی تو ہیں تو ذرا مان جاتے تھے، لیکن آج کی تقریر وہ بھی کامل محویت اور استغراق کے ساتھ سن رہے تھے، اس انہماک اور استغراق میں تأثر تھا، بیزاری، اور اکتاہٹ نہ تھی، توضیح تلویح، اور نجات کے اسباق میں بھی بارہا سید صاحب تشریف لائے، اور ہم پر نہیں ہمارے اساتذہ پر اپنا نقش بٹھا کر واپس گئے۔

واقدی کے روایات حوالہ کے کام میں آتے تھے، بڑے بڑے مصنفین اس کی ثقاہت اور استناد کو تسلیم کرتے تھے، لیکن سید صاحب نے کتب اسماء الرجال کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد واقدی پر تنقیدی مقالہ لکھا، اس نے اگرچہ علمی دنیا میں ایک ہنگامہ پیدا کر دیا، لیکن بالآخر اصحاب علم وخبر کو ماننا پڑا، واقدی کیسا مجروح راوی تھا، اور اس کے روایات کے ضعف کا کیا عالم تھا؟

۱۹۳۰ء کی اسٹرائک ندوہ کی سب سے زیادہ ہنگامہ خیز اور انقلاب انگیز اسٹرائک تھی، ایک معمولی سی بات پر طلباء اور منتظمین میں تصادم ہوا، بات بڑھی، نوبت اسٹرائک تک پہنچ گئی، تفصیل کا یہ موقع نہیں، اسٹرائک کے ''رنگ لیڈر'' خارج کر دئے گئے، جن میں ایک ان سطروں کا لکھنے والا بھی تھا، لیکن اتنی نرمی رکھی گئی کہ اگر معافی مانگ لیں تو داخلہ کا امکان ہے۔

ہم دو تین ساتھی معافی مانگنے پر تیار نہیں ہوئے، لہٰذا داخلہ بھی نہیں کیا گیا، اسی اثنا میں سید صاحب تشریف لے آئے، اس اسٹرائک پر سب سے زیادہ برہم سید صاحب کو ہونا چاہئے تھا، اس لئے کہ معتمد تعلیمات وہی تھے، ان سے ملاقات ہوئی تو ایسا معلوم ہوا جیسے

ہم نے کوئی قصور ہی نہیں کیا تھا، اور اگر کیا تھا تو وہ اسے معاف بھی کر چکے، اس فضا میں جی کھول کر گفتگو ہوئی، انہوں نے معافی کا سوال ہی نہیں اٹھایا، اور بہ حیثیت معتمد تعلیمات ہمارے داخلہ کے احکام جاری کر دئے اور اعظم گڑھ واپس تشریف لے گئے، جب تک سید صاحب لکھنؤ میں رہے کوئی بھی نہ بولا، ان کے جاتے ہی مہتمم صاحب کی چین پیشانی اور زیادہ ابھر آئی، ناظم صاحب کا رنگ عتاب اور زیادہ چوکھا ہو گیا، پروفیسر عبدالباری صاحب بھی بجا طور پر ہم سے بہت زیادہ نالاں، بیزار اور برہم تھے، اور لکھنؤ میں تشریف رکھتے تھے، ان کی یہ برہمی بھی ناظم صاحب اور مہتمم صاحب کے پلڑے کا وزن بن گئی، نتیجہ یہ ہوا، کہ سید صاحب کے حکم پر عمل نہیں کیا گیا، ہمارے لئے یہ بات خلاف توقع نہ تھی، لہذا صدمہ بھی نہیں ہوا، سید صاحب کے لئے تھی، انہیں صدمہ بھی ہوا، لیکن وہ کسی سے لڑنے کے عادی نہیں تھے، ہر وار اپنے قلب ناتواں پر سہہ لیتے تھے، خواہ دل وجگر کا کچھ ہی عالم ہو، دوستوں، رفیقوں اور ماتحتوں کا یہ وار بھی انہوں نے سہہ لیا، کچھ روز کے بعد وہ پھر لکھنؤ تشریف لائے، اور حسب معمول نواب علی حسن خاں ناظم ندوۃ کے ہاں ٹھہرے، ہم بھی وہاں پہنچے، یہ ممکن نہ تھا کہ سید صاحب لکھنؤ میں ہوں اور ہم ان سے نہ ملیں، بہت ملول ومغموم اور متأثر تھے، آنکھیں چار کر کے بات نہیں کر رہے تھے، میں نے عرض کیا:

''اب جامعہ ملیہ کا قصہ ہے! ذرا صاحب کو ایک خط لکھ دیجئے!''

سید صاحب نے فوراً ڈاکٹر ذاکر صاحب کے نام ایک پُر اثر خط لکھا، اور ان سے استدعا کی کہ زیادہ سے زیادہ مراعات عطا فرمائیں۔

دوسرے یا تیسرے دن وہ پھر اعظم گڑھ روانہ ہو گئے، چار باغ اسٹیشن پر میں پہنچانے گیا، گاڑی چھوٹنے میں ابھی دیر تھی، ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں، پھر یک بیک بڑی شفقت سے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا، اور فرمایا:

''جب میں ندوہ چھوڑ کر پونہ روانہ ہو رہا تھا، تو مولانا شبلیؒ نے مجھ سے کہا تھا:

''سلیمان، اگر میرا بس چلتا، اور میرے اختیار میں ہوتا تو تمہیں پونہ نہ جانے دیتا، یہیں

اپنے پاس رکھتا، یہی میں تم سے کہتا ہوں! میں نے پُرنم آنکھوں سے اپنے شفیق استاذ کو دیکھا اور کچھ نہ کہہ سکا، کہہ سکنے کی سکت ہی کہاں رہ گئی تھی؟''

دلی پہنچنے کے بعد میں نے سید صاحب کو ایک مفصل خط لکھا، جس میں جامعہ کے کوائف درج تھے، اور کچھ اپنی ذاتی پریشانیوں کا تذکرہ تھا، خلاف معمول اس خط کے جواب میں تاخیر ہوئی، حیرت تھی ایسا کیوں ہوا، آخر کافی انتظار کے بعد ایک روز سید صاحب کا گرامی نامہ آیا، تحریر فرمایا تھا:

خط میں دیر اس لئے ہوئے کہ میں اپنی جیب سے تمہاری کچھ خدمت کرنا چاہتا تھا''، میرے خط میں اشارۃً بھی اس خدمت کا مطالبہ نہیں تھا، لیکن نہ جانے کیوں انہوں نے اس کی ضرورت محسوس فرمائی، غور فرمالیجئے، یہ شفقت اور توجہ اس شخص کے ساتھ تھی جو بغاوت کے جرم میں اپنی مادر علمی سے نکالا گیا تھا!

جامعہ جانے کے بعد ندوہ سے اب کوئی علاقہ باقی نہیں رہ گیا تھا، لیکن

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد

کے مصداق، ہم چند دوستوں نے انجمن طلبائے قدیم کا احیاء کیا، اور جلسۂ سالانہ کا اعلان کر دیا کہ فلاں تاریخوں میں ندوہ میں ہوگا، اور سید صاحب اس کی صدارت فرمائیں گے، بڑا شاندار جلسہ ہوا، اور جو لوگ یہ سمجھ کر خوش ہو رہے تھے کہ سید صاحب نے ہمیں عاق کر دیا ہے، وہ یہ دیکھ کر بہت غمگین ہوئے کہ سید صاحب نہ صرف ہمارے طلب کئے ہوئے جلسہ میں موسم سرما کی شدّت کا مقابلہ کرتے ہوئے زحمت سفر برداشت کر کے شریک ہوتے ہیں بلکہ اس کی صدارت فرماتے ہیں، اور ان کی صدارت میں وہ تمام تجویزیں منظور ہوتی ہیں جو ہماری طرف سے پیش کی جاتی ہیں۔

جلسہ کئی روز تک جاری رہا، جلسہ کے اوقات کے علاوہ بھی سید صاحب سے نیاز حاصل ہوتا رہا، ایک روز عصر کے وقت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، نواب صاحب اپنی کوٹھی کے برآمدہ میں رونق افروز تھے، ان کے قریب ہی ایک کرسی پر سید صاحب

تشریف فرما تھے اور کوئی نقشہ الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے، دیکھتے دیکھتے وہ نقشہ میری طرف بڑھایا، اور نواب صاحب کے سامنے محبت بھرے لہجہ میں فرمایا:

"یہ ندوہ کی مجوزہ عمارتوں کا نقشہ ہے، دیکھئے..... ممکن ہے ان کی تکمیل آپ ہی کے ہاتھوں ہو۔"

اتنے میں جگر مرادآبادی تشریف لے آئے، وہ بھی نواب صاحب ہی کے ہاں ٹھہرے تھے، نواب صاحب نے پوچھا: "کوئی نیا شعر؟"

جگر صاحب نے فرمایا:

خار کو گل، اور گل کو خار، جو چاہے کرے
تو نے جو چاہا کیا، اے یار جو چاہے کرے

تھوڑی دیر کے بعد میں اٹھا، سید صاحب نے پوچھا:

"کہاں کا قصد ہے؟"

میں نے عرض کیا: "ذرا ندوہ تک جاؤں گا۔"

فرمایا: "میں بھی چلتا ہوں۔"

نواب صاحب نے کہا: "موٹر لے لیجئے۔"

سید صاحب نے فرمایا: "نہیں یونہی ٹہلتا ہوا جاؤں گا۔"

لال باغ سے جہاں سید صاحب ٹھہرے ہوئے تھے، ندوہ تک کافی مسافت ہے، لیکن وہ پاپیادہ چلنے پر تیار ہوگئے، پاپیادہ چلنے کی مصلحت آگے چل کر سمجھ میں آئی، راستہ بھر ندوہ کے حال و مستقبل کے بارے میں گفتگو فرماتے رہے، اس گفتگو میں امید بھی تھی اور حوصلہ بھی۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد قیصر باغ کی طرف سے ایک موٹر تیز رفتاری سے ناک کی سیدھ آتی ہوئی دکھائی دی، سید صاحب گفتگو میں محو تھے، انہوں نے موٹر کی طرف دھیان نہیں دیا، جب وہ قریب آگئی، تو میں سید صاحب کے سامنے آگیا، اور انہیں پیچھے

ہٹادیا، موٹر دَن سے نکل گئی، سید صاحب چلتے چلتے کھڑے ہوگئے، کئی منٹ تک کھڑے رہے، پھر جب سانس سنبھل گیا تو آگے بڑھے، جب تو نہیں اب اندازہ ہوتا ہے کہ قلب اسی زمانہ سے کمزور ہو چلا تھا۔

جامعہ میں چند سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۳۴ء میں یک بیک میں مولانا شوکت علی کے ساتھ ممبئی پہنچ گیا، اور روزنامہ خلافت کی کرسی ادارت پر بغیر کسی سابقہ تجربہ کے بٹھادیا گیا، خلافت کمیٹی یا دوسرے الفاظ میں مولانا شوکت علی اور سید صاحب کے تعلقات میں کچھ جھول پیدا ہوگیا تھا، کیونکہ سیاسی مسلک دونوں بزرگوں کا جداگانہ ہوگیا تھا، بمبئی ویسے بھی ان کے راستہ سے دور تھا، اس طرف آنا شاذونادر ہی ہوتا تھا، لیکن کبھی کبھی آ بھی جاتے تھے، اور جب آتے تھے تو جی بھر کے شرف حضوری حاصل کرنے کا موقع دیتے تھے، ایک مرتبہ وہ ممبئی تشریف لائے اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی ایم۔اے۔ کے دولت کدہ پر مقیم ہوئے، ایک روز فرمایا:

"ندوہ کا تم پر حق ہے۔"

میں نے کہا: "ضرور ہے۔"

فرمایا: "کیا دیتے ہو ندوہ کو لاؤ۔"

میں نے جیب میں جو کچھ تھا نذر کر دیا، بہت خوش ہوئے، نجیب صاحب اس وقت تشریف نہیں رکھتے تھے، وہ آئے تو ان سے خاص طور پر ذکر کیا، دوسرے روز نجیب صاحب سے ملاقات ہوئی، تو کہنے لگے:

"بڑے گن گا رہے ہیں سید صاحب تمہارے، کیا دے دیا ہے تم نے انہیں؟"

میں نے عرض کیا: "چند کھجوریں۔"

نجیب صاحب بڑے بذلہ سنج اور شگفتہ مزاج شخص ہیں، میرے اس جواب پر کہنے لگے:

"ہمی پر مذاق کی مشق کرو گے؟"

میں نے کہا: ''غالبًا جنگ تبوک کا واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کے لئے صحابۂ کرام سے مالی ایثار کا مطالبہ کیا، حضرت عثمانؓ نے بہت کچھ پیش کردیا، حضرت عمرؓ اپنی آدھی پونجی لے آئے، حضرت ابوبکرؓ سب کچھ لائے، اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر ڈال دیا، دوسرے صحابہؓ نے بھی حسب امکان ومقدرت بہت کچھ دیا، ایک صحابیؓ کے پاس کچھ نہیں تھا، چند کھجوریں تھیں، انہوں نے وہی پیش کردیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس ہدیہ پر اتنے مسرور ہوئے کہ جملہ مال وزر پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کھجوریں بکھیر دیں، سید صاحب ایک مذہبی کام (ندوہ) کے لئے چندہ طلب کر رہے ہیں، یہ زرداروں کا شہر ہے، لوگ بہت کچھ دے چکے ہوں گے، بہت کچھ دیں گے، بھلا میں ان کا کیا مقابلہ کرسکتا ہوں، چند سکے تھے، وہ نذر کردئے، یہ کرم ہے کہ انہوں نے اتنی بے حقیقت بات کا آپ سے ذکر کیا''۔

نجیب صاحب مسکرائے، کہا: ''بڑے استاد ہو، یہ نسخہ ہمیں نہ بتادیا پہلے سے۔''

ایک مرتبہ تحریک پاکستان کے عین عالم شباب میں سید صاحب بمبئی تشریف لائے، بمبئی کی جمعیۃ العلماء سالانہ جلسہ کررہی تھی، سید صاحب اس کے صدر منتخب ہوئے تھے، میں مسلم لیگ اور پاکستان کے فدائیوں میں تھا، سید صاحب خلافت ہاؤس کے اسی کمرہ میں ٹھہرے تھے، جو کبھی مولانا شوکت علی کا مسکن رہ چکا تھا، میں بھی ملنے کے لئے گیا، جمعیت کے چند مقتدر اصحاب تشریف فرما تھے، یہ وہ لوگ تھے جن کی میں اپنے اخبارات میں مخالفت کرتا تھا، میرے سامنے انہوں نے سید صاحب سے میری شکایت کی، دیکھئے جعفری صاحب پاکستان کی حمایت کے جوش میں ہم لوگوں کی سخت مخالفت کرتے ہیں، مجھے یہ بات بہت بُری معلوم ہوئی، میں نے ذرا تلخ لہجہ میں کہا:

''ہاں کرتا ہوں، لیکن یہ نہ بھولئے کہ میں صرف آپ کے مسلک کی مخالفت کرتا ہوں، اور آپ اپنے مخالفوں پر کفر کے فتوے صادر کرتے ہیں، میں مخالفت کے باوجود مولانا ابوالکلام، مولانا کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد کا بے حد احترام کرتا ہوں، ان کے

اختلاف کو اجتہادی اختلاف جو حسن نیت پر مبنی ہوتا ہے، قرار دیتا ہوں، اور آپ؟ آپ قائد عظیم کو بدترین خلائق ثابت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں، میں ذاتیات میں نہیں الجھتا، اور آپ کا سارا زور شور ذاتیات ہی پر ہے، میری سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہاں وہ اپنی آزاد اور خود مختار حکومت کیوں نہ قائم کریں؟ آخر عبارت النص، دلالت النص، اشارۃ النص کس بنیاد پر آپ اس جائز اور مستحسن مطالبہ کی مخالفت کرتے ہیں؟''

آج بڑا نازک موقعہ تھا، دل دھڑک رہا تھا، کہیں سید صاحب برہم نہ ہوگئے ہوں، لیکن آج بھی ان کے ہونٹوں پر وہی شفقت آمیز تبسم موجود تھا، جو آج سے بہت پہلے میں نے ایک موقعہ پر ندوہ میں دیکھا تھا۔

پاکستان بن گیا!

لاکھوں آدمی ادھر سے ادھر ہوگئے، انہی میں ایک میں بھی تھا، یہاں آنے کے بعد ہندوستان سے رشتہ منقطع ہوگیا ہندوستان کی شخصیتوں سے جدائی ہوگئی، ہندوستان کے ادارے چھوٹ گئے، سید صاحب کی یاد دل میں تھی، لیکن یہاں آکر حالات نے کبھی اس کا موقع نہ دیا کہ انہیں خط لکھ سکوں۔

ایک روز دفعۃً میں نے یہ خبر سنی کہ سید صاحب تشریف لائے ہیں، جمعہ کی نماز جس مسجد میں سید صاحب نے پڑھی وہیں میرے ایک عزیز ابوالحسن صاحب نے بھی پڑھی، نماز کے بعد وہ میرے واسطہ سے سید صاحب سے ملے، سید صاحب نے فرمایا:

''آپ ملنے آگئے، لیکن وہ نہ آئے!''

انہوں نے آکر مجھ سے کہا، میں دل میں بہت نادم ہوا، اور اپنے آپ پر لعنت ملامت کرتا رہا، لیکن عجیب اتفاق کہ پھر بھی نہ جاسکا، ایک روز حکیم نصیر الدین ندوی نے سید صاحب کی دعوت کی۔

حکیم صاحب میرے محبوب دوستوں میں ہیں، آج سے نہیں، ندوہ کے درجہ اول

سے، ان کا حکم رد نہ کر سکا، دعوت میں گیا، سید صاحب تشریف لا چکے تھے، میں نے سلام کیا، انہوں نے معانقہ کیا، میں دور ہٹ کر بیٹھ گیا، انہوں نے پاس بلا کر بٹھایا، ''دید و شنید'' ہاتھ میں تھی، اس کی ورق گردانی فرما رہے تھے، حکیم صاحب نے وہ صفحہ کھول دیا، جس میں ان کا ذکر تھا، اسی نشست میں مضمون پڑھ لیا، پھر مسکرا کر کتاب بند کر دی۔

اسی مجلس میں ایک صاحب سے معلوم ہوا، کہ لاہور میں مولانا مودودی نے سید صاحب کی دعوت کی، اور دریافت کیا: ''سنا ہے حکومت نے آپ کو تعلیمات اسلامی بورڈ کا صدر بنا دیا ہے۔''

سید صاحب نے پوری سنجیدگی سے فرمایا:

''ایجاب ہو چکا ہے، قبول باقی ہے۔''

حکیم نصیر الدین صاحب سراپا جذب و کشش شخصیت کے حامل ہیں، پھر ایثار، محبت، خلوص، اور وضع داری کے صفات مستزاد، ندوہ میں سید صاحب سے حکیم صاحب کو زیادہ واسطہ نہیں رہا، اس لئے کہ وہ ابھی چھوٹے طالب علم تھے، نیز کچھ ہی عرصہ بعد وہ طبیہ کالج دہلی چلے گئے، لیکن کراچی میں وہ سید صاحب پر چھا گئے تھے، سید صاحب نے ان کی طبیعت کو سمجھ لیا تھا، انہوں نے سید صاحب کے مزاج کو پالیا تھا، سید صاحب ان پر بے انتہا التفات صرف فرماتے تھے، اور وہ سید صاحب پر پروانہ وار قربان ہوتے تھے، سید صاحب انہیں مکدر دیکھ کر خود مکدر ہو جاتے، اور وہ سید صاحب کی ذرا سی تکلیف یا بے چینی اپنے لئے ناقابل برداشت محسوس کرتے تھے۔

ٹنڈو آدم میں مجلس ندوۃ العلماء کا جلسہ ہوا، واپسی جس گاڑی سے ہوئی اس کے مسافروں میں سید صاحب، حکیم صاحب، راقم الحروف اور کئی دوسرے لوگ تھے، گاڑی مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، لہذا ہر شخص الگ الگ ڈبہ میں بیٹھا، کراچی کے صدر اسٹیشن پر میری اور حکیم صاحب کی ملاقات ہوئی، یوں تو کئی بار ہوئی، میں قطب کی طرح اپنی جگہ پر بیٹھا تھا، وہ ہر اسٹیشن پر اترتے تھے ایک مرتبہ سگریٹ کی ڈبیہ پھینک گئے، ایک

مرتبہ پانی کے کچھ قطرے وضو کرنے کے بعد پھینک گئے، لیکن صدر کے اسٹیشن پر اطمینان سے ملاقات ہوئی، میں نے دیکھا کافی پریشان اور گھبرائے ہوئے سے نظر آرہے ہیں، پوچھا کیا بات ہے؟ کہنے لگے سید صاحب پر تنفس کا دورہ پڑا ہے، سید صاحب گھر روانہ ہو گئے، حکیم صاحب اسٹیشن سے ٹیکسی کر کے اپنے دواخانہ گئے، اور جتنی بھی قیمتی اور مفید ادویہ ممکن ہو سکتی تھیں، انہیں لے کر سید صاحب کے حضور میں پہنچ گئے۔

آخری علالت کے دوران میں اپنی بدقسمتی کے باعث میں حاضر نہ ہو سکا، اتفاق کی بات حکیم صاحب بھی نہ جا سکے، ایک روز خود سید صاحب نے حکیم صاحب کو فون کیا، اور بڑے شاعرانہ الفاظ میں یاد کیا، یہ فوراً پہنچے، سید صاحب نے کہا، دیکھ لیجئے انہوں نے معائنہ بھی شروع کیا، دوران معائنہ میں پیٹ دبایا، اور پوچھا، درد تو نہیں ہوتا؟ فرمایا:

''ان انگلیوں سے میں درد محسوس کر سکتا ہوں۔''

آہ! وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں۔

سید صاحب

(خصوصیات وامتیازات)

پروفیسر سید نجیب اشرف دسنوی ندویؒ

سید صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت ان کے ضمیر کی بلندی اور پاکی ہے، وہ جس چیز کو بھی صحیح یا غلط سمجھ لیتے تھے اس کے متعلق ان کا رویہ بہت صاف ہوجاتا تھا اور وہ اس کے اظہار میں بے باک ہوجاتے، لیکن اس کے ساتھ ہی اگر ان کو اپنے کسی خیال یا تحقیق کے متعلق پتہ چلتا کہ وہ غلط تھا تو بڑی آزادی اور خوشی کے ساتھ اس کی اصلاح کرلیتے، انہوں نے کبھی کسی قیمت پر اپنے ضمیر کی آواز کو نہیں دبایا، ان کی دوسری مابہ الامتیاز خصوصیت ان کا وہ ایثار تھا جو اپنے مقصد کے حصول کے لئے بلا کسی جھجک کے کرتے تھے، دارالعلوم ندوہ پھر الہلال اور پھر دکن کالج پونہ کی سرکاری ملازمت سے علیٰحدگی اور دارالمصنفین کے قیام کے ابتدائی صبر شکن ایام اس کا بین ثبوت ہیں، ان کی تیسری خصوصیت ان کی انتہائی شریفانہ فطرت ہے، وہ انتہائی سے انتہائی اشتعال انگیز موقع پر بھی ضبط وخاموشی کا وہ مظاہرہ کرتے تھے کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے تھے، آج تک انہوں نے کسی کو بھی کوئی خفگی والا جملہ اونچی آواز سے نہیں کہا، وہ بڑے صلح جو اور سکون پسند تھے، اور اس کے حصول کے لئے انہوں نے بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں، ان کی چوتھی اور سب سے بڑی خصوصیت ان کی ہمہ گیر محبت تھی خواہ وہ اپنے گاؤں میں اپنے چھوٹے بڑے عزیزوں کے درمیان ہوں یا کسی شہر کی بڑی سے بڑی کانفرنس میں، اپنے نیازمندوں میں ہوں یا اپنے مخالفوں میں، ان کا چہرہ محبت والفت کا آئینہ

ہوتا تھا، وہ بچوں میں معصوم، جوانوں میں زندہ دل، نوجوان اور بزرگوں میں محترم بزرگ ہوتے تھے۔ شاید اب ان صفات کا حامل کوئی دوسرا نہ ملے، خاکسار کو سن ۱۹۰۱ء سے ان کے آخری وقت تک ان کی محبت وشفقت، ہدایت ورہنمائی حاصل کرنے کی سعادت حاصل رہی ہے اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے متعلق کیا لکھا جائے اور کیوں کر لکھا جائے۔

وہ دسنہ ضلع پٹنہ (بہار) میں ۱۳۰۲ھ میں پیدا ہوئے، ان کا اصلی نام ابونجیب تھا، ان کے والد حکیم ابوالحسن ایک بڑے حکیم اور صوفی تھے، ابتدائی تعلیم وطن اور پھلواری شریف میں حاصل کرنے کے بعد ندوہ گئے، وہاں تعلیم سے فراغت پاکر ادب کے استاذ مقرر ہوئے اور اس سلسلے میں ان کی پہلی تصنیف ''دروس الادب'' ہے، ندوہ کی مدرسی کے زمانے ہی میں انہوں نے الندوۃ والبیان کی اشاعت کی خدمت اور ادبی تحقیق کا کام شروع کیا، چنانچہ ان کی پہلی ادبی وعلمی تصنیف ''لغات جدیدہ'' ہے جو ندوہ کے اس اجلاس کے موقع پر شائع ہوئی جبکہ علامہ رشید رضا مصر سے صدارت کے لئے تشریف لائے تھے، اس کے بعد جب سیرت کا کام شروع ہوا تو وہ مدرسی سے الگ ہوکر اس کام میں مصروف ہوگئے، پھر الہلال سے وابستہ رہے، اس کے بعد دکن کالج پونہ کے استاذ مقرر ہوئے اور مولانا شبلیؒ کی وصیت پر اس ملازمت کو ترک کرکے اعظم گڑھ آگئے، اس کے بعد انہوں نے جو عظیم الشان علمی، ادبی، مذہبی، سماجی، تعلیمی اور دینی خدمات انجام دیں، اس سے کون واقف نہیں، شاید خدمت کا ہی شوق تھا جس نے ان کو کبھی مشرق میں کلکتہ، کبھی دکن میں پونہ اور کبھی شمال میں لکھنؤ اور اعظم گڑھ تک پہنچایا۔ اور بالآخر مغرب میں پہنچ کر انہوں نے اسی کے لئے جان دے دی۔ یہ تو ہندوستان کے سفر کا حال تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اسلامی ممالک کے سلسلے میں یورپ، مصر، حجاز تک کا سفر کیا تھا، اور آخری دنوں میں خدا رسول کی محبت نے ان کے دل کو وارفتہ کردیا تھا۔ آخر اسی بیماری دل نے ان کا کام تمام کیا۔ إنا لله وإنا إليه راجعون۔

اگر ہم ان کی خدمات کی قدر کرتے ہیں اور خدمت کی روح کو باقی رکھنا چاہتے ہیں تو ہمارا یہ عین فرض ہے کہ ان کے دل وجگر دارالمصنفین اور دارالعلوم ندوہ جس قیمت پر بھی ہو قائم رکھیں کہ انہی کی بقا میں اس روح کی بقا ہے۔

تاثرات (۱)

(مکتوب بنام مولانا عبدالماجد دریابادیؒ)

مولانا سید ہاشم ندوی استھانویؒ

حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کے انتقال پرملال کے بعد سے کئی بار چاہا کہ جناب کو بطور تعزیت کوئی خط لکھوں، صدق کے مقالات غائر نظر سے پڑھتا رہا، خدا کا شکر ہے جناب نے اخلاص وموت ظاہری و باطنی کا جو منظر ان مقالات میں پیدا کیا ہے وہ شاید کسی دوست یا عزیز سے ممکن نہ تھا، اللہ تعالیٰ فلاح دارین عطا فرمائے۔

حضرت علامہ میرے رشتہ میں ماموں ہوتے تھے، میری والدہ اور حضرت مرحوم پھوپھیرے بھائی بہن تھے، یہی رشتہ والد مرحوم سے بھی تھا۔ حضرت نے میری تربیت والد مرحوم حکیم سید محمد احسن صاحبؒ کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے فرمائی، بچپن سے میں شوخ تھا، اور اس شوخی پن نے بہت تکلیف پہونچائی، لیکن ان کی علمی زندگی کا ہمیشہ گرویدہ اور دلدادہ رہا، اکثر تجاویز میں خاکسار کے مشورے کو مقدم رکھا، تین سال پاکستان کے کچھ ایسے گذرے کہ میں دور ہوگیا، آخری الفاظ ان کی زبان سے حیدرآباد میں یہ نکلے کہ تم اب میرے ساتھ رہو.......... میں نے عرض کیا کہ میں بک گیا ہوں جس پر ارشاد ہوا کہ ''قدر عافیت کسے داند کہ بہ مصیبتے گرفتار آید''، حقیقت میں یہ الفاظ جس محبت سے نکلے وہ صحیح

ہوئے۔ ۵۰ء میں دہلی بلایا تھا لیکن میری حاضری سے قبل کراچی تشریف لے گئے، میں نے نواب علی یاور جنگ بہادر کی خدمت میں ایک رپورٹ میں ان کا تذکرہ کیا تھا کہ حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ اتفاقی طور پر پاکستان تشریف لے گئے ہیں ان کو ہندوستان آنے کی دعوت منجانب حکومت ہند پیش کی جائے، افسوس ہے کہ ارباب دائرۃ المعارف نے اس رپورٹ کی نقل حکومت ہند کو نہیں بھیجی۔

مولانا عبدالباری صاحبؒ سے کئی بار تذکرہ رہا، اور مولانا کا سفر پاکستان اسی نقطۂ نظر سے تھا، الحمدللہ ان کی رپورٹ سفر ''صدق'' میں شائع ہوئی اور اس نے دونوں حکومتوں کے ارباب حل وعقد کو اپنی طرف متوجہ کیا، اس حادثہ کے بعد جب میں دہلی سے لکھنؤ گیا تو مولانا عبدالباری صاحبؒ نے بہت درد بھرے الفاظ میں تعزیت فرمائی، میں نے عرض کیا تھا کہ بعض وجوہ سے مولانا عبدالماجد صاحبؒ سے نیاز حاصل نہ کرسکوں گا، البتہ اعظم گڑھ جانے کا مصمم ارادہ تھا لیکن جناب مولانا ابوالکلام آزادؒ کی علالت کی بنا پر یہ کام مکمل نہ ہوسکا، خیال ہے کہ حضرت سید صاحب علیہ الرحمہ کے متعلق کچھ تاثرات لکھوں، جس میں ان کے بعض مکاتیب کا بھی تذکرہ کروں، لیکن ابھی تک سکون نہیں ہوا ہے، جب یہ تحریر مکمل ہوگی بحیثیت صدر نشیں مجلس دارالمصنفین پیش کرنے کی عزت حاصل کروں گا۔

حاشیہ

(۱) مولانا سید ہاشم ندوی ندوۃ العلماء کے ممتاز ونامور فضلاء میں ہیں، متعدد بلند پایہ علمی کتابوں کے محقق اور دائرۃ المعارف حیدرآباد کے ناظم تھے، انہوں نے جس مضمون کا اس مکتوب میں وعدہ کیا ہے وہ شاید تحریر نہیں کیا جاسکا، یہ مکتوب ان کے بعض تاثرات پر مشتمل ہے اس لئے اہمیت کے پیش نظر اسے اس مجموعے میں شامل کیا گیا ہے۔

کچھ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے متعلق

سعید الحق عاشق دسنویؒ

مجھ کو یہ فخر ہے کہ علامہؒ مرحوم سے میرے تعلقات سے بہت ہی عزیزانہ تھے، ان سے کوئی خاندانی یا نسلی رشتہ نہ تھا، لیکن نجی تعلقات خونی رشتہ سے زیادہ تھے، وہ سید تھے، میں ملک ہوں، لیکن ہم وطنی اور ہمسائیگی کا شرف حاصل تھا، میرے گھر والوں سے ان کی آمد ورفت، میل ملاپ، یگانگت وموانست ایسی تھی کہ اکثر لوگوں کو دھوکہ تھا کہ ہم لوگ ان کے قریبی رشتہ دار ہیں، میرے والد جناب رشید الحق صاحب قبلہ ابتدائی تعلیم میں علامہؒ مرحوم کے ہم درس تھے، ان کا بیان ہے کہ علامہ بچپن ہی سے بہت خاموش اور متین آدمی تھے، اور ان کے ساتھی ان کی کمسنی میں بھی ان کو عزت اور محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، وہ دار العلوم ندوہ سے جب دیسنہ آتے تو ان کے والد حکیم ابو الحسن صاحب مرحوم ان کی خاموشی دیکھ کر مایوس ہوتے، اور کہتے کہ یہ دنیا میں کیا کرے گا، لیکن اس وقت کس کو معلوم تھا کہ اس طالب علم کی خاموشی کی تہ میں علم وفضل کا سمندر موجزن ہے، میرے چچا مولوی محمد بشیر الحق صاحب دسنوی نے مجھ کو ایک موقع پر تحریر فرمایا کہ ''میں نے مولانا سید سلیمان ندوی کا بچپن دیکھا تھا، وہ عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے، بچپن میں وہ میرے مکان کی گلی سے ہو کر اپنے پرانے مکان سے اپنے نئے مکان میں جاتے تھے، میں ان کی جس چیز سے سب سے زیادہ متأثر ہوں وہ ان کے علم سے زیادہ ان کی انسانیت ہے۔'' میرے خسر جناب محمد صدیق صاحب قبلہ مختار کو علامہؒ مرحوم چچا کہتے تھے، اور ان کا بہت احترام کرتے تھے، ان کے حوالہ سے بعض باتیں

علامہؒ مرحوم نے سر سید احمد کے متعلق حیات شبلی میں لکھی ہیں، کیونکہ وہ سر سید کے معاصر تھے، اور تقریباً ہر سال آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کرتے تھے، ان کا مکان دیسنہ میں علامہؒ مرحوم کے مکان سے متصل تھا، علامہؒ مرحوم ان سے اس طرح عزت ومحبت سے ملتے تھے، جس طرح بیٹا اپنے باپ سے ملتا ہے، باہر کے لوگوں کو یہی گمان ہوتا تھا کہ وہ ان کے حقیقی چچا ہیں، علامہؒ مرحوم کی جب آخری شادی مظفر پور میں ہوئی، تو تقریب عقد میں شرکت کے لئے قبلہ جناب محمد صدیق صاحب موتی ہاری (چمپارن) سے تشریف لائے، جہاں کے وہ بڑے کامیاب اور مشہور قانون داں سمجھے جاتے تھے، علامہ کے سسرال والے ان سے اچھی طرح واقف تھے، جب انھوں نے علامہ کی زبان سے میرے قبلہ کو چچا کہتے ہوئے سنا تو آپس میں سرگوشیاں شروع ہوگئیں کہ سید سلیمان تو ملک معلوم ہوتے ہیں، اس معاملہ کی نزاکت کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو صوبہ بہار کی معاشرت سے واقف ہیں، جہاں شرافت ونجابت کا معیار خصوصاً شادی وبیاہ کے معاملہ میں نسلی امتیاز پر مبنی ہے، میرے عزیز ڈاکٹر محمد امام جو میرے خسر کے لڑکے اور اس وقت پٹنہ میڈیکل کالج کے سپرنٹنڈنٹ ہیں، بیان کرتے ہیں، ۱۹۲۴ء میں بہار صوبائی خلافت کانفرنس کی صدارت کے لئے علامہؒ مرحوم موتی ہاری تشریف لائے، اور اپنے ''صدیق چچا'' کے یہاں ٹھہرے، اور انعقاد کانفرنس سے تین دن پہلے موتی ہاری آگئے تھے، تاکہ چچا بھتیجے میں اطمینان کی ملاقات رہے، آنے کے ساتھ ہی بھتیجے نے کہا: ''چچا میں آپ کو اپنا خطبہ سنانا چاہتا ہوں''، لیکن جب خطبہ تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ دیسنہ میں چھوٹ گیا ہے، بہت پریشان ہوئے، اتنا وقت نہ تھا کہ کوئی وہاں سے جاکر لاسکے، چنانچہ فوراً ہی اطمینان خاطر کے ساتھ دو آدمیوں کو طلب کیا، اور خود بولتے جاتے، اور دونوں لکھتے جاتے تھے، اس طرح خطبۂ صدارت تیار ہوگیا۔

میں نے جب ہوش سنبھالا اور ان کو دیکھا تو اس وقت ان کی عمر کوئی ۳۵؍سال کی ہوگی، مگر اس وقت وہ اپنے علمی تبحر کی وجہ سے بہت مشہور ہو چکے تھے، اور ان کا شمار ممتاز لیڈروں میں ہوتا تھا، جب وہ دیسنہ تشریف لاتے تھے تو میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کو

اسی طرح دیکھتا تھا، جس طرح اپنے نصاب میں سقراط، ارسطو اور افلاطون کی تصویریں دیکھا کرتا تھا، اور پھر ہم لوگ فخر، غرور اور پندار کے نشہ سے سرشار ہوجاتے تھے کہ وہ ہمارے ہم وطن بھی ہیں اور بزرگ بھی، جب وہ وفد خلافت کے رکن کی حیثیت سے مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور ڈاکٹر سید حسین کے ساتھ انگلستان گئے، تو دیسنہ کے تمام چھوٹے چھوٹے بچے خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے، اور جب ان کی قیادت میں خلافت کا وفد سعودی عرب جانے لگا تو مجھ کو اور میرے گھر والوں کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ قومی عزت اور وقار اپنے خاندان ہی کو حاصل ہوا ہے، اور جب یہ خبر ملی کہ مکہ معظّمہ میں مؤتمر اسلامی کے اجلاس کے وہ نائب صدر منتخب ہوئے، تو ہمارے تمام ہم وطنوں کو ایسا معلوم ہوا کہ عالم اسلام نے عزت کا یہ تاج ان ہی کے سر پر رکھا ہے، سلطان عبدالعزیز ابن سعود کی خواہش کے مطابق مؤتمر اسلامی کے صدر حافظ محمد وہبہ ہوئے تھے، اگر یہ انتخاب لوگوں کی رائے سے ہوتا تو صدر علامہ ہی ہوتے، اس زمانہ میں ہندوستان کے انگریزی اخباروں نے اس خبر کو جلی حرفوں سے یوں شائع کیا تھا، Great honour for an Indian (ایک ہندوستانی کے لئے بڑی عزت) اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اس وقت کے غلام ہندوستان کے ایک فرزند کا ایک عالمی کانفرنس کا نائب صدر ہونا کوئی معمولی بات نہ تھی، مہاتما گاندھی ان کو Young Maulana (نوجوان مولانا) کہا کرتے تھے، اور ان کو بڑا صاحب الرائے سمجھتے تھے۔

میں نے بچپن میں دیکھا کہ وہ بہت ہی سنجیدہ، متواضع اور منکسر المزاج تھے، علمی تبحر نے ان میں کبھی خودنمائی یا خود پسندی کا جذبہ پیدا نہیں ہونے دیا، ایک انگریزی محاورہ کے مطابق ''ان کا علم ان کے کاندھوں پر سبک نشیں تھا۔'' وہ اپنی بڑائی اور عظمت کبھی کسی سے منوانے کی کوشش نہ کرتے تھے، ہمیشہ کم اور آہستہ بولتے، نہایت ہی حلیم اور بردبار تھے، ہم لوگوں نے ان کو کبھی کسی سے خفا ہوتے ہوئے نہیں دیکھا، اگر کسی سے ناراض ہوتے بھی تو خاموش ہوجاتے، اور ناراضگی ظاہر نہ ہونے دیتے، اس قدر آہستہ بولتے تھے کہ ان کی باتوں کو غور سے سننا پڑتا تھا، ایک صاحب جو ان کے زیر بار احسان تھے، کسی معاملہ میں ان

سے بڑی بلند آواز سے باتیں کرنے لگے، علامہ صرف اتنا کہہ کر خاموش ہوگئے کہ اپنی بلند آواز سے کسی کو دبانے کی کوشش نہ کیجئے۔

جب وہ دیسنہ آتے تو ''علامگی'' کو اعظم گڑھ ہی میں چھوڑ کر آتے، یہاں اگر کوئی ان کو مولانا یا علامہ کہتا تو وہ خفا ہوتے تھے، دیسنہ میں وہ یا سلیمان تھے، یا سلّو تھے، یا سلیمان چچا تھے یا سلیمان بھائی، وہ دیسنہ کے بزرگوں کا بڑا احترام کرتے، دوستوں سے بڑی بے تکلفی اور خندہ پیشانی سے ملتے، اور بچوں سے محبت کرتے، ایک بوڑھی بیوہ کو جو ملک تھیں وہ پھوپھی کہتے تھے، ایک دفعہ جب وہ ان سے ملنے گئے تو بوڑھی بیوہ نے ان سے پوچھا: ''بیٹا! کتنی تنخواہ ملتی ہے''، علامہ نے بتلادیا، پھوپھی نے پھر پوچھا: ''اور اوپر کی آمدنی'' مولانا ہنس پڑے، یہ وہ زمانہ تھا، جب اصلی آمدنی تنخواہ کی نہیں، بلکہ وہ سمجھی جاتی تھی جو ''غیب'' سے آتی تھی۔

دنیا نے علامہ سید سلیمان ندوی کی علامگی کو دیکھا، اور ہم دیسنہ والوں کو یہ فخر ہے کہ ہم نے سلیمان اور سلو کو دیکھا، عام طور سے لوگ سمجھتے ہیں کہ ان میں صرف خشک علمی وقار تھا، اور وہ لطیف مزاح اور تفریحی چھیڑ چھاڑ کی باتوں سے معرا تھے، لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے، وہ دیسنہ میں اپنے احباب سے بڑی بے تکلفی سے ملتے تھے، ایک بار کسی مجلس میں اشعار سنا رہے تھے کہ اپنے بچپن کے ایک دوست کو مخاطب کرکے کہا کہ سنئے ایک شعر، یہ خاص آپ کے لئے ہے۔

دست گستاخ کو اجازت دو   ہائے مطلب کہا نہیں جاتا

دیسنہ ہی میں برادر محترم سید نجیب اشرف ندوی (سابق رفیق دارالمصنفین پھر استاذ اسمٰعیل کالج بمبئی) کی شادی کے موقع صوبہ بہار کے کچھ شعراء جمع ہوئے تھے، علامہ نے ان کے ترنم اور نغمہ سرائی کو سن کر کہا ''پہلے زمانہ میں ایسی تقریبات میں بھانڈ جمع کئے جاتے تھے، اس تقریب میں شعراء آئے ہیں''، اسی موقع پر لطیف پیرایہ میں فرمایا کہ بزرگوں نے شادی کی رسموں کو اتنا دلچسپ بنادیا ہے کہ جی چاہتا ہے، بار بار شادی کی جائے۔

جس زمانہ میں علامہ کی دوسری بیوی کا انتقال ہوا، اسی زمانہ میں ان کے ہم وطن ڈاکٹر احمد کریم صاحب عرف حسا (سول سرجن) کی اہلیہ نے بھی وفات پائی تھی، مولانا نے

ایک موقع پر ان سے فرمایا: ''حسا بھائی! ہم دونوں لیڈی ڈاکٹر سے بیاہ کرلیں، تاکہ وہ اپنا علاج خود کرسکے'' میں جب پٹنہ کالج کا طالب علم تھا، تو وہ ایک بار پٹنہ تشریف لائے، اور اپنے ایک عزیز سید عبدالمنعم صاحب ڈسٹرکٹ سب رجسٹرار سے ملنے آئے، ان ہی کے ساتھ محبّی صباح الدین عبدالرحمٰن رہتے تھے، جو اس وقت دارالمصنفین میں موجود ہیں، وہ بھی پٹنہ کالج میں تعلیم پا رہے تھے، میں باہر سے مکان میں داخل ہوا تو میری نظر علامہ پر نہیں پڑی، میں نے صرف صباح الدین کو دور سے دیکھا اور طالب علمانہ انداز میں کہا: ''آپ نہایت بیہودہ ہیں''، اندر آیا تو دیکھا کہ مولانا موجود ہیں، انھوں نے ہلکے تبسم کے ساتھ کہا: ''کون بیہودہ ہے!''۔

اس سلسلہ میں کچھ بیرونی زندگی کے لطیفے بھی یاد آرہے ہیں، وہ جب کراچی سے ڈھاکہ تشریف لائے تو ان کے ایک دوست مولانا دین محمد ندوی ان سے ملنے کے لئے آئے، ان کو دیکھ کر علامہ نے فرمایا: ''آیئے آیئے پاکستان تو آپ ہی کے لئے بنا ہے''، مولانا دین محمد سن کر حیران ہوئے کہ اس کا کیا مطلب ہے، علامہ نے ان کی پریشانی دیکھ کر فرمایا: ''دین محمد یعنی اسلام کے لئے بنا''، جمعیۃ العلماء مشرقی پاکستان کی صدارت کے موقع پر سبجکیٹس کمیٹی میں کچھ لوگوں نے تجویز پیش کی کہ پاکستان کی سرکاری زبان عربی ہونی چاہئے، علامہ نے کہا بہتر ہے، اسی جلسہ سے اس کے ابتداء کی جائے، اور ممبروں سے فرمایا کہ تمام کاروائی عربی میں لکھی جائے، مگر کسی میں اس کی قابلیت نہ تھی، اس لئے پھر فرمایا کہ جب ہم علماء عربی نہیں لکھ سکتے تو آپ کیوں کر دعویدار ہوسکتے ہیں کہ عربی پاکستان کی قومی زبان ہو، واپسی میں علامہ ڈھاکہ میں حاجی متین احمد کے یہاں ٹھہرے، ایک صاحب ان سے ملنے آئے جو بنگلہ زبان اور بنگلہ رسم الخط کے بڑے حامی اور اردو کے بڑے مخالف تھے، انھوں نے علامہ سے کہا: ''مولانا عربی کو قومی زبان بنایا جائے، علامہ نے نہایت لطیف پیرایہ میں جواب دیا کہ جب آپ کو عربی رسم الخط تک گوارا نہیں تو عربی کو کیسے چاہتے ہیں۔''

۱۹۲۹ء میں جب میں پٹنہ کالج میں بی اے کا طالب علم تھا، اس وقت میں نے

علامہ کی معرکۃ الآراء کتاب ''خطبات مدراس'' کا انگریزی میں ترجمہ کرنا شروع کیا، یہ کتاب جیسا کہ سب کو معلوم ہے سیرت نبوی ﷺ کے مختلف پہلوؤں پر آٹھ خطبات کا مجموعہ ہے، علامہ کے بیان سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کو اپنی تمام تصانیف میں یہ کتاب سب سے زیادہ پسند ہے، مجھ سے ایک موقع پر فرمایا کہ یہ خطبات رمضان شریف کے مہینہ میں لکھے گئے، اور اسی مبارک مہینہ کی برکت سے یہ کتاب مقبول ہوئی، اسی ترجمہ کے سلسلہ میں انھوں نے مجھ کو اعظم گڑھ بلایا تھا اور میں وہاں ایک مہینہ رہا تھا، روزانہ شام کو اور رات کے کھانے کے بعد دلچسپ صحبتیں رہتی تھیں، اس علمی ماحول میں علامہ کو بہت ہی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، وہ جب علمی گفتگو کرتے تو معلومات کا دریا بہا دیتے، ان کی ان باتوں کو سمیٹنا ممکن نہیں، ان ہی گفتگوؤں میں انھوں نے بیان کیا تھا کہ مولانا شبلی مرحوم کی نگاہ انتخاب ان پر کیسے پڑی، فرماتے تھے کہ جب وہ دارالعلوم ندوہ میں دارالمباحثہ کے معتمد مقرر ہوئے تو انھوں نے پہلی بار ایک جلسہ کا اعلان عربی میں لکھ کر کیا، مولانا شبلی کی نظر اس اعلان پر پڑی، تو پوچھا یہ کس نے لکھا ہے، اس طالب علم کو بلاؤ، اس سے پہلے اعلان اردو میں لکھا جاتا تھا، اس واقعہ سے دونوں کے درمیان ایک ایسا رشتہ قائم ہوا جو علم کی تاریخ کی ایک درخشاں مثال ہے۔

میں نے دارالمصنفین کے قیام میں سید صاحب کو بہت نفاست پسند پایا، غذا بہت کم مگر عمدہ کھاتے تھے، کہتے تھے کہ مجھے چائے اچھی ملنی چاہئے، اس لئے کہ کھانا زندہ رہنے کے لئے کھاتا ہوں، مگر چائے تو تعیش ہے، نہایت جامہ زیب تھے، جو کپڑا بھی پہنتے تھے ان پر زیب دیتا رہتا تھا، دستار ان کے سر پر تاج شاہی ہوتی تھی، میں نے سر سکندر حیات مرحوم کے سوا کسی دوسرے کے سر پر دستار اس طرح زیب دیتے نہیں دیکھا، ان کی داڑھی دیکھ کر ان کے علم، زہد اور تقویٰ کا اندازہ ہوتا تھا، ان کا چہرہ شروع ہی سے منور تھا، حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت ہونے کے بعد اور بھی بُقعۂ نور ہوگئے تھے۔

میں اعظم گڑھ ہی میں تھا کہ علامہ کے پاس ریاست حیدرآباد دکن سے ایک بڑی تنخواہ کی معزز ملازمت کے لئے ایک خط آیا...... سید صاحب نے یہ خط اپنے رفیق کار

مولانا مسعود علی کو دکھا کر پوچھا، آپ کی کیا رائے ہے، مولانا مسعود علی نے اس خط کو لے کر پھاڑ دیا، اور کہا: ''میری یہ رائے ہے''۔ اگر آپ جاتے ہیں تو میں بھی یہاں سے چلا، پھر دارالمصنفین کا جو بھی حال ہو، چنانچہ علامہ نے اس پیشکش کو منظور نہیں کیا، اور دارالمصنفین کے قلیل وظیفہ پر زندگی گزار دینے کو ترجیح دی۔

دارالمصنفین ہی کے قیام کے زمانہ میں میں نے ''خطبات مدراس'' کا انگریزی ترجمہ مکمل کرلیا، علامہ نے اس کو ٹائپ کرا کے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کے پاس جامعہ ملیہ نظر ثانی کرنے کے لئے بھیجا اور مدراس کے سیٹھ جمال نے اس ترجمہ کو شائع کرنے کا وعدہ کیا، مگر وہ جلد ہی عالم بقا کو سدھار گئے، اس لئے اس کی اشاعت نہ ہوسکی، علامہ نے مجھ کو لکھا کہ بڑی مشکل ہے کہ ہندوستان کا اہل علم اہل سرمایہ نہیں ہے، میرے پاس دام نہیں کہ اس کو چھپواسکوں، میں ۱۹۴۴ء میں رانچی (جھارکھنڈ) میں تھا، تو وہاں کے ایک پریس کو چھاپنے کیلئے دے دیا تھا، لیکن ابھی پانچ لکچر چھپے تھے کہ میرا تقرر آل انڈیا ریڈیو میں دہلی کے سنٹرل نیوز آرگنائزیشن میں اسسٹنٹ نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے ہوگیا، اس لئے میں نے مجبوراً صرف پانچ لکچروں کو کتابی صورت میں شائع کردیا، اور اس کا نام علامہ کی تجویز سے Living Prophet رکھا، جب ۱۹۵۳ء میں علامہ پاکستان ہسٹریکل کانفرنس کی صدارت کے لئے ڈھاکہ تشریف لائے، تو میں بھی وہیں تھا، ان سے ملاقات ہوئی، فرمایا کہ میری بہت خواہش ہے کہ ''خطبات مدراس'' کا مکمل انگریزی ترجمہ شائع ہو، اور مجھ سے اس کی مطبوعہ کاپی طلب کی، اور بقیہ خطبات کے ترجمے کو بھی کراچی بھیج دینے کے لئے فرمایا، مگر افسوس کہ ان کی یہ آرزو دل ہی میں رہ گئی، ڈھاکہ میں جانے کے بعد ہی وہ مالک حقیقی سے جاملے، اسی ملاقات میں انھوں نے مجھ سے فرمایا تھا، کہ ایک ایرانی اسکالر کراچی آئے تھے، وہ کہتے تھے کہ انھوں نے Livingh Prophet پڑھی ہے، اور تعجب سے فرمایا کہ انھوں نے یہ کتاب کہاں پڑھی، میں نے عرض کیا کہ........ جب شاہ ایران پاکستان تشریف لائے تھے، تو میں نے ڈھاکہ میں اس کی ایک جلد ایران کے دربار شاہی کے شاعر آقائے سرمد کو

ہدیۃً دی تھی، شاید اس ایرانی اسکالر کو یہ کتاب ان ہی سے ملی ہو۔

میرے قیام دارالمصنفین ہی میں علامہ نے مجھے اپنی کتاب ''عرب و ہند کے تعلقات'' کے مسودے کا (جو اس وقت چھپی نہیں تھی) ایک باب انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لئے دیا، اور یہ ترجمہ علامہ نے اسلامک کلچر حیدرآباد دکن کے ایڈیٹر محمد مارماڈیوک پکھتال کو بھیج دیا، جب یہ ترجمہ اس رسالہ میں شائع ہوا تو علامہ نے مجھ کو لکھا: ''ممکن ہے کہ کچھ معاوضہ بھی ملے، تو انعام کی نقرئی مٹھائی آپ کو پیش کی جائے گی''، ترجمہ کی اشاعت سے میری ہمت بڑھی، اور میں نے پوری کتاب کا ترجمہ کرڈالا، جو متعدد قسطوں میں اسلامک کلچر میں شائع ہوا، لیکن افسوس ہے کہ اب تک کتابی صورت میں شائع نہ ہوسکا ہے، سر عزیز الحق مرحوم وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی نے اس کو یونیورسٹی کی جانب سے شائع کرنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن ان کی وفات جلد ہی ہوگئی، اس زمانہ میں پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر چندریشور پرشاد نرائن سنہا تھے، جو اب مشرقی پنجاب کے گورنر ہیں، ان کو اس کتاب کی اہمیت معلوم ہوئی تو اس کو پٹنہ یونیورسٹی کی جانب سے شائع کرنے پر آمادہ ہوگئے، لیکن کاپی رائٹ کے شرائط طے نہ ہوسکے، اس کی طباعت واشاعت کی کوشش کے سلسلہ میں ۱۹۴۷ء سے بہت پہلے میں بہار کے مشہور کانگریسی لیڈر پروفیسر عبدالباری مرحوم کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد سے ملا، مولانا نے فرمایا: ''اس کی بڑی ضرورت ہے کہ اسلامی مواد کو انگریزی میں پیش کیا جائے، یہ خانہ ابھی خالی ہے''، لیکن افسوس ہے کہ اب تک یہ ترجمہ کتابی صورت میں شائع نہ ہوسکا، یہ خطبات علامہ نے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی فرمائش پر اکیڈمی میں دئے تھے، کسی جلسہ میں پنڈت جواہر لال نہرو بھی شریک تھے، انھوں نے خطبہ سن کر کہا:
''مولانا آپ نے بہت سی سنسکرت کتابوں کو اردو میں کردیا۔''

۱۹۵۰ء میں جب وہ کراچی آئے تو میں ڈھاکہ میں تھا، مجھ کو برابر خبر ملتی رہی کہ ان کو اعظم گڑھ اور دارالمصنفین چھوڑنے کا بے حد غم ہے، ۱۹۵۱ء میں وہ ڈھاکہ تشریف لائے تو میں نے دوران ملاقات میں پوچھا: ''کیا آپ کی فیملی بھی کراچی آگئی ہے''۔ اس

سوال سے کچھ خوش نہ ہوئے اور بہت ہی دل گیر ہوکر صرف اتنا کہا: ''عجب انقلاب ہے''۔ اور اس سلسلہ میں کوئی مزید گفتگو کرنا پسند نہیں فرمایا، خیال تھا کہ یہ گوہر شب چراغ پاکستان کو ضیا بار کرے گا، اور ان کے قیمتی مشوروں کی مانگ ہر جگہ رہی، وہ پاکستان میں ''دائرۃ المعارف'' کے نام سے ایک ادارہ دارالمصنفین کی طرح قائم کرنا چاہتے تھے، اور مجھ کو معتبر ذرائع سے معلوم ہوا تھا کہ لیاقت علی خاں مرحوم نے اس کے لئے ایک معقول رقم کا وعدہ بھی کیا تھا، لیکن آہ

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

۱۹۵۳ء میں جب وہ آل پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کی صدارت کے لئے ڈھاکہ تشریف لائے تو ان کے ساتھ ایک بہت ہی ناخوشگوار واقعہ پیش آیا، انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں ایک جگہ فرمایا تھا کہ ہندو اقتدار کے زمانہ میں بنگلہ زبان ہندو تخیل اور ہندو دیومالا سے بھر گئی تھی، بعض لوگوں نے اردو جاننے والے طلبہ کو اس کا مطلب کچھ کا کچھ سمجھا دیا، جس سے طلبہ نے غیظ وغضب میں آکر ایسی حرکتیں کیں، جن کو سنجیدہ لوگوں نے سخت ناپسند کیا، اور یونیورسٹی کے بعض اساتذہ علامہ کے پاس معذرت کے لئے آئے، آپ نے صرف اتنا فرمایا کہ: ''پہلے اپنے قلب کی صفائی کر لیجئے۔'' مجھ کو بڑا دکھ تھا کہ ایسی ذات کو جس سے کبھی کسی فرد کو کوئی ایذاء نہیں پہنچی، اتنی بڑی تکلیف پہنچائی گئی، مگر خود ان کے ظرف وتحمل کا یہ حال تھا کہ اس واقعہ کے بعد جب میں ان کے پاس گیا تو انھوں نے طلبہ کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا، صرف ان کی ناسمجھی پر افسوس کیا اور فرمایا: ''وہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں''، یاد رہے کہ یہ وہی الفاظ ہیں جو حضرت مسیحؑ نے اس وقت کہے تھے، جب ان کو تختہ دار پر چڑھایا جا رہا تھا، علامہ کو قلب کی بیماری پہلے ہی سے تھی، اس واقعہ نے اس کو اور بڑھا دیا، ان کے ایک عزیز ڈاکٹر سید محمد شمیم جو ڈھاکہ کے بہت ہی کامیاب ڈاکٹر ہیں، ان کا علاج بڑی دل سوزی اور تن دہی سے کیا، جب طبیعت سنبھل گئی تو کراچی واپس ہوگئے، علامہ کے خلاف ان ہی لڑکوں نے ہنگامہ برپا کیا تھا جو ان کی عظمت سے بے خبر اور

ان کے خطبہ کی عالمانہ ہوشگافیوں کو سمجھنے سے بالکل قاصر تھے، ان کو اس پر بڑا تعجب تھا کہ ایک مولوی ہسٹاریکل کانفرنس کی صدارت کر رہا ہے، میں اس واقعہ سے بے حد متأثر تھا، اس تأثر میں ڈھاکہ کے مشہور اخبار ''مارننگ نیوز'' میں ایک مضمون لکھا، جس کا عنوان تھا، "Who is Sulaiman Nadvi" (سلیمان ندوی کیا چیز ہیں)، اس کو پڑھ کر طلبہ کو بڑی ندامت اور پشیمانی ہوئی کہ ایسے عظیم المرتبت اہل علم اور انسانیت اور شرافت کے پیکر کے ساتھ جو سلوک کیا گیا، وہ کس قدر نازیبا تھا، مشرقی پاکستان کے مشاہیر، علماء اور عمائدین نے اس کی مذمت کی، اور ڈھاکہ کے ارمنی میدان کے ایک بڑے جلسہ میں بنگالی عالم مولانا عبدالعلی فرید پوری نے بڑے تأسف کا اظہار کیا، اور جب اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں کے بعد علامہ کی وفات کی خبر ریڈیو سے سنی گئی، تو ڈھاکہ ریڈیو اسٹیشن کے اسٹاف کے تمام بنگالی اصحاب بے حد مغموم ہوئے اور اسٹیشن ڈائرکٹر زین العابدین صاحب نے مجھ سے خواہش کی کہ میں علامہ پر ایک تقریر نشر کروں، ان کی خواہش پر میں نے بھی آخری بار ریڈیو کے ذریعہ اپنی عقیدت ومحبت کا خراج مولانا کی روح پر فتوح کے سامنے پیش کیا، اس کے بعد بنگال کے اکابر کے تعزیتی بیانات شائع ہوتے گئے، جن سے علامۂ مرحوم کی ذات سے ان کی عقیدت ومحبت کا اظہار ہوتا تھا، ان میں مجھ کو جناب حسین شہید سہروردی کا بیان زیادہ پسند آیا، جس میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا: ''کہ سید صاحب امام ابن تیمیہ کے پایہ کے عالم تھے''۔ اسی زمانہ میں مجھ کو مشرقی پاکستان کے گورنر عزت مآب چودھری خلیق الزمان سے ملنے کا شرف حاصل ہوا جو علامۂ مرحوم کے دوستوں میں ہیں، انھوں نے فرمایا کہ مولانا سید سلیمان ندوی کا کسی بات پر مسکرا دینا اور ان کا ایک ہلکا اور معنی خیز تبسم ایسی چیز تھی جو کسی اور میں نہیں دیکھی، اس کی کیفیت کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کو مولانا کی صحبت نصیب ہوئی ہے۔

حضرتؒ کا سلوک وتصوف اور طریقۂ تربیت

مولانا قاضی سید عبدالرؤوف اورنگ آبادی ندویؒ

آہ! علم وادب، تاریخ وسیر میں یگانۂ روزگار، سلوک وتصوف میں ممتاز اور جملہ اسلامی علوم میں جامع وباکمال ہستی دنیا سے رخصت ہوگئی

خدایا بران تربتِ نامدار
بفضلت کہ بارانِ رحمت ببار

اور اپنی تحقیقاتِ علمیہ، حقائقِ دینیہ، نکاتِ احسانیہ اور رموز روحانیہ کے ایسے نقش ونگار چھوڑ گئی، جو مدتوں باقی رہیں گے۔ ایسی جامع کمالات ہستی صدیوں میں کہیں پیدا ہوتی ہے

عمر ہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

علمی بزم کے تو وہ صدر نشین تھے ہی، سلوک وتصوف میں بھی اُن کا بڑا درجہ تھا اور اس کے وہ اسرار ورموز اور معارف وحقائق بیان فرماتے کے دل کیف یقین سے لبریز ہو جاتا، اس مختصر مضمون میں اس کے بعض جلوے دکھائے جائیں گے۔ اس راہ میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ علمی صدارت کی بھری مجلس میں اپنی علمی لغزشوں اور کوتاہیوں کا اعتراف اور ہر اس تحقیق ورائے سے جو کتاب وسنت کے موافق نہ ہو، رجوع کر کے ''از کردۂ ناصواب توبہ یارب'' کی صدا برملا بلند کی۔ عملی سلوک وتصوف کی یہ وہ تجلی تھی کہ

مدعیان علم وعمل کی آنکھیں خیرہ ہوکر رہ گئیں۔ نفس پرستی کے اس دور میں محض رضائے الٰہی اور اتباع حق کے لئے اتنی بڑی ہستی کا اپنی قلمی لغزشوں کا اعتراف اور اس سے براءت کرنا عرفان حقیقت کے کمال اور فنائیت وفنائے نفس کی روشن دلیل ہے۔

فنائے ذات اور اتباعِ حق کی یہ وہ مثال تھی، جس پر خود شیخ طریقت نے مرید کی شان میں مدحیہ اشعار ارشاد فرمائے اور اس ناچیز کی عقیدتمندانہ نظر پہلی مرتبہ حضور والا رحمۃ اللہ پر پڑی۔ ناچیز اس زمانہ میں حضرت مجدد تھانویؒ کی بیعت سے مشرف ہوکر مولانا محمد عیسیٰ صاحب کے زیر تربیت تھا۔ حضرت والا رحمۃ اللہ نے تحریر فرمایا کہ اگر وہ مصلح پسند نہیں ہیں، تو مناسب حال کوئی دوسرا مصلح منتخب فرمالیں۔ اس کے کچھ دنوں کے بعد حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ سے لکھنؤ اسٹیشن پر ملاقات ہوگئی اور شاہ گنج تک رفاقت کا شرف رہا۔ اس مختصر صحبت کا دل پر ایسا اثر پڑا کہ خط کے ذریعہ نذرِ عقیدت پیش کی۔ اس کے بعد حضور کے حسب طلب کئی مرتبہ آپ کے وطن دیسنہ میں حاضری کا موقع ملا اور دوسرے سفر میں اخذ بیعت وارادت اور فیوض وبرکات حاصل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد بارہا شرفِ زیارت حاصل ہوا، مگر پاکستان کی ہجرت کے بعد اس سے محرومی رہی۔ البتہ مراسلت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

اس دس سالہ مدت میں حضور کی زبان وقلم سے جو ارشادات نکلے ہیں، افادۂ عام کے خیال سے ان کے مختصر اقتباسات درج کئے جاتے ہیں کہ شاید ان سے کسی قلب سلیم کو فیض وبرکت حاصل کرنے کی توفیق ہو، اس سے حضور کی سلوک وتصوف کی حقیقت اور آپ کے طریقۂ تربیت کا بھی اندازہ ہوگا۔

تواضع:

آپ میری نسبت یہ سمجھ لیں کہ یہ خاکسار حضرتِ والا رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں سب سے کمتر اور رُتبہ میں بھی فروتر ہے۔ اس پر بھی اگر اس ذرۂ بے مقدار کی طرف اپنے

دل کی کشش بے تکلف محسوس کریں تو ظاہر فرمائیں، ایسا نہ ہو کہ بعد کو پچھتاوا آئے، میرے حالات کی بھی تحقیق فرمالیں کہ میں اس قابل بھی ہوں، اگر ان سب باتوں کے بعد بھی دل کا میلان ہو تو خدمت سے انحراف نہیں۔

مقصد بیعت اور تفویض امانت:

بیعت کا مقصد تو یہ ہے کہ مرشد و مسترشد میں اس امر کا معاہدہ ہوتا ہے کہ مرشد تعلیم و ارشاد میں تاامکان غفلت و دریغ نہ کرے اور مسترشد تاامکان اطاعت و انقیاد میں کوتاہی سے کام نہ لے۔ مرشد کے ذمہ جو فرائض عائد ہوتے ہیں، اس کی ادائیگی پر بلا اخذ بیعت بھی تیار ہوں اور چونکہ میں اپنے میں کوتاہی پاتا ہوں، اس لئے تاخیر کر رہا ہوں یا ابھی وقت اس امانت کی سپردگی کا نہیں آیا ہے، وقت کا انتظار کیجئے، جب وقت آئے گا، تو خود بخود یہ دولت نصیب ہو جائے گی۔

پیر اور مرید کے فرائض:

غالبًا یہ ذہن نشین ہوگا کہ یہ عمر بھر کا سودا ہے۔ اس لئے اس راہ میں جو قدم رکھا جائے، وہ خوب سوچ سمجھ کر رکھا جائے۔ پیر کی نسبت صرف اتنا اعتقاد رکھنا شرط ہے کہ میری تلاش میں میری نافعیت کے لئے اس سے بہتر کوئی شخص اس وقت نہیں ہے۔ بہر حال یہ طرفین سے الحب فی اللہ کا معاہدہ ہے کہ طالب تعمیل میں اور مطلوب یعنی شیخ تعلیم میں کوئی کمی اخلاص میں نہ کرے گا۔ اس سلسلہ میں چار باتیں بمنزلۂ اصول کے ہیں۔

اعتقاد، انقیاد، اطلاع، اتباع، اس راہ میں ضروری ہے کہ اپنے کو مربی کے ہاتھ میں اس طرح دیدیں، جس طرح مریض طبیب کے ہاتھوں میں اپنے کو دیدیتا ہے۔ اُصول اربعہ کی پیروی رہے، میں نے پہلے ہی لکھ دیا ہے کہ اپنے شیخ کی نسبت یہ اعتقاد رکھنا چاہئے کہ میری نافعیت کے لئے میری تلاش میں یہ سب سے بہتر ہے۔ پس دوسروں سے انکار کی ضرورت نہیں ہے، مگر اتباع ایک کی چاہئے، ایک ساتھ دو طبیبوں کا مریض مصیبت

میں رہتا ہے، اعتقاد اور اختیار تو معلوم کر لیا، اطلاع سے مقصود شیخ سے مکاتبت اور اتباع سے احکام شیخ کی پیروی ہے۔

نماز کی حقیقت:

نماز کو اپنی طرف سے پورے ظاہری و باطنی آداب اور خضوع و خشوع کے ادا کرنے کی کوشش کیجئے، جس قدر ہو اللہ کا شکر کیجئے، اور آئندہ کے لئے ہمت کیجئے اور دعا کیجئے، ہمارے حضرت کی تحقیق ہے کہ مبتدی نماز میں یکسوئی کے لئے لفظ کی طرف اور متوسط معنی کی طرف، منتہیٰ ذات کی طرف یہ تصور کرے کہ بندہ اپنے آقائے حقیقی کے سامنے کھڑا ہے اور وہ اس کو دیکھ رہا ہے، اس کا اثر یہ ہو کہ قلب میں سکون اور جسم میں پستی اور تواضع کی شان پیدا ہو، نماز میں اصل شے خضوع اور خشوع ظاہری و باطنی ہے اور نیز ہر قسم کے رذائل سے حسب امکان دوری اور فضائل کے حصول کی کوشش اور اطاعت الٰہی پر مداومت اور حصول رضائے الٰہی کا شوق، باقی غیر مقصود ہیں۔ تو امور مقصودہ میں ان امور کی طرف بیشتر متوجہ رہیں۔

التزام سنن و نوافل اور تہجد:

نماز پنجگانہ کے بعد حسب ذیل نمازوں پر حتی الامکان مداومت کی جائے۔ نماز تہجد، بعد مغرب ۶ رکعات نفل اوابین، طلوع آفتاب کے بعد ۲ یا ۴ رکعت نفل چاشت، نوافل مسنونہ نماز پنجگانہ کے بعد، نماز میں اعتدال ارکان اور حضور قلب کی کوشش رہے۔
تہجد کا التزام از بس ضروری ہے، یہی مفتاح اسرار ہے، اگر رات کو احیاناً ناغہ ہو جائے، تو بوقت چاشت بارہ رکعات پڑھیں۔ تہجد عجیب عبادت ہے، جس پر خود حضور انور ﷺ نے عملاً دوام فرمایا ہے۔ اس لئے سنتِ مؤکدہ ہے (سنت مؤکدہ کی تعریف اس پر صادق ہے، البتہ قولاً تاکید نہیں فرمائی، شفقةً علی الأمة، مگر اپنے عمل میں اس کو مؤکد ثابت کر دیا)، اب اہل محبت کے لئے کیا گنجائش رہی، فضائلِ اعمال کے اکتساب کا سبق

محدثین سے نہ لیں، محبین سے لیں، "علیکم بقیام اللیل فإنّه داب الصالحین" تو لزوم پر دال ہے، تہجد با جماعت اگر اتفاقاً ہو تو جائز ہے، ورنہ اہتمام اور تداعی کے ساتھ نہیں، غور کرنا چاہئے کہ اس میں ریا اور نمود کی خواہش تو پوشیدہ نہیں، اگر تہجد قضا ہو جائے تو طلوعِ آفتاب کے بعد سے دوپہر سے پہلے تک بارہ رکعتیں پڑھ لی جائیں، تہجد کی نماز ذرا جہر سے پڑھنا مستحب ہے۔

دعا کا اہتمام:

تہجد کے بعد بارگاہِ الٰہی میں پورے درد والحاح کے ساتھ اپنے لئے دعا کیجئے۔ دعا میں تضرع وخضوع ہونا چاہئے، عصر اور صبح کی نماز کے بعد دعا خوب کیا کیجئے، اور مانگئے جو آپ کے لئے مناسب ہو، ان شاء اللہ ملے گا، اس در سے کوئی محروم نہیں پھرا ہے۔ "ادعونی استجب لکم" ..... الخ، اس کا اعلان ہے اور "الدعاء مخ العبادة" ارشاد ہے۔

احتسابِ نفس:

اپنے عیوب کی تلاش میں رہیے اور جو عیب سب سے زیادہ اُبھرا ہو، علی العیان معلوم ہو، اس کے دفعیہ کی کوشش کیجئے۔ مثلاً کبر، عجب، ریا، حسد، وغیرہ، ان عیبوں کی حقیقت دریافت کیجئے، اور پھر اس کا علاج معلوم کیجئے۔ اپنے میں شکستگی، افتقار، تواضع ہونی چاہئے اور ہر وقت اپنے عیوب پر نظر جمی رہے اور اس کے اصلاح کی فکر دامنگیر ہو، استکبار وافتخار وغرور کہ ہمچوں من دیگرے نیست کے شیطانی پھندے میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ اپنے کو مجموعۂ ذمائم اخلاق سمجھنا خیر وبرکت ہے۔ برسبیل تذکرہ اسرار قلبی اور راز روحانی کو ظاہر کرنا بھی استکبار وریا میں داخل ہے۔ غیبت بہت بُری چیز ہے، اس سے نیکیاں دوسروں کو مل جاتی ہیں، اپنے قلم سے خود کو مولوی لکھنا کبر کے آثار میں ہے۔ گویا اس کا اظہار ہے کہ لوگ اس کو بڑا سمجھیں، مکائد النفس بہت دقیق ہیں، اللہ تعالیٰ پناہ میں رکھیں، تواضع اور

فنائے ذات کی راہ پیشِ نظر رہے۔ فنائے نفس کے لئے "اللّٰھم اجعلنی فی عینی صغیرًا" کی دعا مفید ہے۔ اپنے کو سب سے بدتر سمجھنا بہتر ہے، اس کا ہمیشہ اور ہر کام میں خیال رہے، بس اپنے عیوب پیش نظر رہیں اور اُن کی اصلاح کا خیال غالب اور اس باب میں اپنے نفس کے مکائد پر نظر رہے۔

اصل سلوک:

حصولِ تقویٰ، تحلی بالفضائل اور تخلی عن الرذائل برائے رضائے الٰہی اصل سلوک ہے۔ ہر قسم کے رذائل سے بقدر امکان دوری اور فضائل کے حصول کی کوشش اور اطاعتِ الٰہی پر مداومت اور حصول رضائے الٰہی کا شوق اور باقی غیر مقصود ہیں۔ اپنی اصلاح وتربیت کی دھن میں لگے رہئے، تا آنکہ اللہ کے سوا دل سے ہر چیز کی محبت فنا ہو جائے، ریا، عجب، کبر رنگ برنگ صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور یہ سالک کے لئے سخت خطرناک ہیں، اس لئے ان سے احتراز کا اہتمام نہایت ضروری ہے۔ بری چیز یہ ہے کہ اپنے پر نظر بڑائی کی نہ پڑے، یہ راستہ مردودیت کا ہے۔ "أبیٰ واستکبر و کان من الکافرین"، ہر حال میں تواضع اور فنا پر نظر رہے اور ذمائم اخلاق پر۔

حصولِ تقویٰ:

منہیات واوامر کی تصریح پیشِ نظر رہے۔ مقصود تقویٰ ہے کہ قرآن پاک "ھدی للمتّقین" ہے، عبادت کا منشا بجا آوری کے بعد حصول تقویٰ ہی ہے "لعلّکم تتقون". بعد فرائض سنن ونوافل کی پابندی علی مراتب الوجوب والاستحباب کے منہیات شرعیہ سے احتراز کا لزوم کیا جائے۔

اہتمام والتزام عمل:

اعمال تو سب کو معلوم ہیں، ضرورت عمل کی ہے اور حصولِ تقویٰ اور رضائے الٰہی

کے لئے ساری کوشش اسی کی چاہئے، باقی سب فلسفہ ہے، کام میں لگے رہیں

تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

عمل خیر لوجہ اللہ تعالیٰ ہو، اصل یہ ہے کہ امتحان کی تیاری کے لئے جو وقت صرف ہوتا ہے، وہ بیکار نہیں جاتا ہے، نمبر اسی سے ملتے ہیں، کسی اضطراری عذر کے سبب سے اگر کسی معمول میں کمی ہو جائے تو ان شاء اللہ تعالیٰ ہم کو ہماری نیت کے مطابق حق تعالیٰ اُس کی جزاء عنایت فرمائیں گے، یہ ان کی شانِ رحیمی و کریمی ہے۔ عمل کے لئے صرف ہمت وعزیمت، دوامِ عمل اور صحتِ فکر ونظر کی ضرورت ہے، عمل، عملیات اور تعویذ کی نہیں، مقبولیت کی خواہش اس راہ کا کانٹا ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا کے سوا عمل کا دوسرا محرک نہ ہو اور ہر حال میں ذکر لساناً قلباً وعملاً جاری رہے۔

احکامِ الٰہی کی اطاعت اور رضائے الٰہی کی طلب:

اصل شے احکامِ الٰہی کی کلی اطاعت، حلال حرام کا خیال، معاملات میں صفائی، اخلاق کی نزاہت، اتباعِ نبوی کا دھیان، التزامِ سنت کا اہتمام ہے، بدعات ورسوم سے تمام اُمور میں احتراز، اور تمام اُمور میں رضائے الٰہی کی طلب، ان اُمور کی طرف توجہ فرمایئے، کہ یہ اصول ہیں اور باقی سب فروع اور تدابیر، دوام ذکر کا ظہور یہی ہے، طاعات ومرضیات الٰہی کی اتباع کا ذوق بڑھے، اور اللہ تعالیٰ کی یاد حالاً ہو، باقی کیفیات تو آتی جاتی رہتی ہیں۔

استقامت بڑی دولت ہے:

اب تو زندگی کے آخر لمحہ تک یہ استقامت قائم رکھنا ہے، "توفني مسلمًا و ألحقني بالصالحين" کی دعا چاہئے۔ اپنے کام میں تادم آخر استقامت کے ساتھ لگے رہئے، یہی بڑی دولت ہے

تادم آخر دمے فارغ مباش

معمولات پر استقامت مبارک، "الاستقامة فوق الكرامة، قال الله تعالىٰ:

﴿قل الله ثم استقم﴾ سلوک کی اصل کلید ہے۔ عوارض کی وجہ سے کمی باعثِ افسوس نہیں، وہ کمی افسوس کے قابل ہے جو غفلت یا کوتاہی کے باعث ہو، اپنی تکمیل اور اصلاح سے کبھی غفلت نہ برتیں، ہر حالت میں ناقص ہیں، یادِ الٰہی سے غفلت نہ ہو، ذکر کا مقصود یہی ہے۔

ذکر دوام:

﴿أدعوا ربّكم تضرّعًا و خيفةً إلى و لا تكن من الغافلين﴾ تلاوت فرما کر دوام ذکر کے فضائل، ثمرات اور وعدے اور غفلت کے نتائج بد اور وعید بیان فرمائے، اور پھر ﴿و من يعرض عن ذكر الرحمٰن...... الخ﴾ کے تفسیری نکات بیان کئے اور ہر حرکت وسکون پر عمل وقول میں ذکر کی تاکید فرمائی۔ یادِ الٰہی کو مرکوزِ خاطر کرنے کی ہدایت فرمائی اور بیان کیا کہ احکامِ شرعیہ کی روح ذکر ہی ذکر ہے، جمال، نوال، کمال کے اعتبار سے ذاتِ باری تعالیٰ ہی کو محبوبیت حاصل ہے، تو اسی محبوبِ حقیقی کی یاد واجب ہے۔ ﴿الذين آمنوا أشد حبًّا لله﴾ منصوص ہے، دنیا اور تعلقاتِ دنیا کے ساتھ یادِ الٰہی بڑی چیز ہے اور یہی سنتِ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ رضوان اللہ علیہم ہے۔ چنانچہ حضرت عروہؓ کا پاؤں جب کاٹا جانے لگا، تو ہوش وحواس ہی میں پاؤں کاٹنے کا انھوں نے حکم دیا۔ اسم ذات یعنی اثبات ونفی کے ذکر کے جمالی اور جلالی ہر دو طریقوں کو عملاً ظاہر فرما کر تکرار کی ہدایت کی اور فرمایا کہ وقت ذکر، قربت حق، ساعتِ حق، رحمتِ حق اور نزولِ رحمت پر اذعان ونظر رکھنا چاہئے، تاکہ ثمرات ذکر جلد سے جلد تر ظاہر ہوں، اپنی بابت فرمایا کہ مجھے تو ذکرِ جلالی میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے ذکرِ جمالی پر بیشتر عمل کرتا ہوں اور اسی میں سہولت ولذت محسوس کرتا ہوں، آپ کو اختیار ہے کہ جس طریقہ کو چاہیں اختیار کریں۔

نپولین اعظم جب کسی سپاہی کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا، تو اس کا نام لے کر پکارتا تھا، جس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ وہ اس پر جان دینے کو تیار ہو جاتا تھا، اسی طرح اسمائے الٰہی کی یاد اور تکرار اُن کی توجہ خاص کو اپنی طرف مبذول کرانا ہے، اس ارحم الراحمین کا نام پاک ورد کیا جائے گا، تو اس کی رحمتیں ذاکر کی طرف متوجہ کیوں نہ ہوں گی۔ (اسم میں خود محبوبیت

نہیں، اس میں محبوبیت محبوب کی ذات پر دال ہونے کے سبب سے ہوتی ہے، کسی اسم کی محبوبیت ذاتِ پاک کی محبوبیت کا نتیجہ اور ظل ہے) ماسویٰ سے بے نیازی کے لئے اثبات ونفی کا ذکر اس کے معنیٰ کے استحضار کے ساتھ کافی ووافی ہے۔

پاسِ انفاس:

پاس انفاس کا مقصد بھی یہ ہے کہ کوئی سانس ذکر الٰہی سے خالی نہ جائے۔ اس کی صورت یہ ہے جو آسانی سے ہوسکتی ہے کہ ہر سانس کے ساتھ اللہ اللہ جاری رہے، بغیر تلفظ لسانی محض ذکر جلی کے ساتھ، اُس کا فائدہ ذکر دوام ہے، جو حسب استطاعت مامور ہے۔

مراقبۂ اللہ معی:

اللہ معی کا مراقبہ شروع کر دینا چاہئے۔ اللہ معی کا تصور کہ ہر وقت وہ ہمارے ساتھ اور ہمارے قریب اور ہمارے ہر فعل وخیال کا ناظر وحاضر ہے۔ اس کے مضمون پر غور کیا جائے، اوراس کے مناسب آیات کا استحضار رہے، و اِذا سئالك عبادی عنی فانی قریب هو معکم اَینما کنتم۔ و نحن اَقرب اِلیه من حبل الورید۔ نحن اَقرب اِلیه منکم و لکن لا تبصرون۔ و هو علیم بذات الصدور۔ و لا تخفی علیه خائنة الاَعین و ما تخفی الصدور۔ اَولا یعلم من خلق، اَلم یعلم باَنّ اللّٰه یریٰ اسی کیفیت کا رسوخ اصل روح ہے، جس کا طریقہ ذکر وشغل ہے۔

قلب کا ذاکر ہونا:

قلب کا ذاکر ہونا یہ فن کی کوئی اصطلاح نہیں ہے۔ کثرتِ ذکر سے قلب میں ذکر کا لفظ اللہ اللہ ہو یا لا الٰہ الاّ اللہ یا کوئی اور مرکوز ہو کر حدیث نفس کے طور پر جاری ہو جاتا ہے، جو ارادہ کے بغیر بھی قائم رہتا ہے، بلکہ اس کا استحضار بھی نہیں رہتا ہے کہ ذکر جاری ہے، بہر حال اس کا طریقہ صرف کثرت ذکر یا توجہ تام ہے اور یہ کوئی مشکل نہیں ہے۔

مجاہدہ وریاضت سے فضل ورحمت اور توفیقاتِ الٰہیہ کی صلاحیت واستعداد پیدا ہوتی ہے۔ ہر نبی وولی کو مجاہدہ وریاضت کے عقبات سے گذرنا ضرور ہے۔ رسالت مآب ﷺ کا غار حرا میں معتکف ہونا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوہِ طور پر قیام کرنا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جنگلوں میں مقیم ہونا اور اولیاء وفقراء کی نفس کشی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، لیکن باہمہ کسب وریاضت ضرور نہیں کہ رحمت کا ورود اور برکات روحانی کا نزول فی البدیہہ ہو یہ سب فضلِ رحمانی ہے، وہ ذاتِ پاک بے نیاز ہے، مگر سالک کو پُر امید ہی رہنا چاہئے۔ "جزاءً من ربّك عطاءً"، گویا مزہ نہیں بخشش ہے اور یہ بخشش بے حساب وکتاب ہوتی ہے۔ اوامر ونواہی کی بجا آوری جس گرم جوشی اور خلوص سے ہوگی، اسی قدر انوارِ رحمت وبرکات کا نزول ہوگا۔ بعض لوگ احکام اعمال بجالاتے ہیں، ذکر وشغل بھی کرتے ہیں، مگر ثمرات واثرات مرتب نہیں ہوتے ہیں، وجہ اس کی یہی ہے کہ خلوص ومحبت جو بمنزلۂ روح کے ہے، وہ ان میں مفقود ہے، کوئی شخص کونین کھائے اور کونین کے اثرات مرتب نہ ہوں، تو ظاہر ہے کہ اس کے ناقص ہونے کا حکم لگایا جائے گا۔ اسی طرح نماز، روزہ اور دیگر احکام واعمال بجالاتے ہیں، اوران کے اثرات وثمرات ظاہر نہیں ہوتے ہیں، تو سمجھ لو کہ ان اعمال کی بجا آوری میں نقص ہے اور پیش گاہِ الٰہی میں تو قدر کمال کی ہے۔

کیفیات:

سالک کو بڑا دھوکہ ذوق وشوق اور لذت کا ہوتا ہے۔ سو اس کو پوری طرح سمجھ لیجئے کہ یہ چیزیں آثار محمودہ ضرور ہیں، مگر مقصود نہیں، ان کا منشاء اسی قدر ہے کہ کام میں جی لگتا ہے اور آسانی ہوتی ہے، مگر اس کو قرب ورضا اور حصول ثواب میں کوئی دخل نہیں، کیونکہ یہ امور غیر اختیاریہ میں ہیں، اور غیر اختیاریہ نہ مطلوب ہیں، اور نہ مقصود، دوا کا اصل مقصود صحت بخشی ہے، خوش ذائقگی اور لذت نہیں، جب انسان کے بدن میں صحت آتی ہے، تو طاقت اور کھانے کی لذت تو خود بخود آجائے گی، اس کے لئے کوئی الگ دوا کی ضرورت نہیں، ابتدائی

جوش وشوق میں کمی فطری ہے، یہ مرحلہ زندگی میں بھی پیش آتا ہے، یہ کوئی افسوس کی چیز نہیں، جوش وشوق ہو یا نہ ہو، عمل میں کوتاہی نہ ہونے پائے، جس طرح آغاز شباب میں عروس نو کے ساتھ جوشورش وجوش طبع کا مظاہرہ ہوتا ہے، وہ رفتہ رفتہ تمکین سے بدل جاتا ہے اور بجائے بوالہوسی کے دیرینہ محبت……اس کی جگہ لے لیتی ہے، میرا ایک شعر ہے

دیکھئے ملتی ہے کب دولت سکون عشق کی
ہائے ہوئے جوش تو ہنگامۂ آغاز ہے

صبر وشکر:

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا ملفوظ ہے کہ [بندہ] دو حال سے خالی نہیں یا تو بندہ کو نعمت ملتی ہے، تو اس پر شکر واجب ہے، یا ابتلا پیش آتا ہے، تو اس پر صبر مامور ہے، اور یہ دونوں حالتیں موجب ازدیاد ترقی ہیں اور یہی صبر وشکر کی دوہری منزل پوری زندگی کے سفر میں ملتی رہتی ہے، شکر ورضا بڑی چیز ہے، توفیقاتِ الٰہی پر بھی شکر کیجئے، آپ کو گونہ طمانیت جو حاصل ہوئی ہے، آپ اس طمانیت کو ذکر ولجاجت میں صرف کیجئے کہ اس کا شکر یہی ہے، شادی وغم دونوں توأم ہیں

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

خواب اوراس کی حیثیت:

رؤیا اور خواب بشارات ہیں، اس کے سوا ان کی اور کوئی حیثیت نہیں، نہ یہ ذریعۂ قرب ہیں اور نہ اتکال مفید طریق، البتہ خوش ہونا چاہئے کہ خواب سے مطلع کیا جاسکتا ہے، مگر اس سے اپنی بزرگی کا زعم نہ ہو کہ ایسے خواب فاسق بھی دیکھ سکتے ہیں، ہاں اس بات کا شکر کیجئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی تربیت اس طرح فرماتے ہیں، بہر حال اس کے پیچھے نہ پڑیئے، یہ گو بشارات ہیں، مگر مقصود نہیں

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم

بیداری کے معاملات کے طرف توجہ فرمایئے، اسی کا سوال اور اسی کا مواخذہ ہے، باقی رؤیا اور خواب بشارات سے زیادہ نہیں، دھن کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہئے، خواب کی حیثیت شرع میں صرف بشارات کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس اظہار بشارات سے کبھی ان شکلوں کو منتخب فرماتے ہیں، جن سے خواب دیکھنے والوں کو موافقت ہوتی ہے۔ اس میں خواب میں نظر آنے والے بزرگوں کو کوئی دخل نہیں ہوتا، بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے اس اظہار بشارت میں اپنا آلہ اپنے فضل سے بنالیا۔

مکرر مکتوب ہے کہ خواب کی حیثیت صرف بشارات کی ہے اور اس ہیچمدان کو دیکھنا اس بات کی علامت ہے کہ آپ مجھ سے محبت رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ساری توفیقات ہیں، وہ جب چاہتے ہیں تو کسی بندہ کو خواب میں یا بیداری میں تنبیہ یا توفیق ارزانی فرماتے ہیں، اور اس کے لئے کبھی کبھی واقع فی النفس ہونے کے لئے اس کی شکل وصورت کو بمنزلہ……وجہ وآلہ بناتے ہیں، جس سے صاحب معاملہ کو مناسبت اور محبت اورعقیدت ہوتی ہے۔ ﴿ذٰلك فضل اللّٰه يؤتيه من يشاء﴾۔

احترام نبوی اور حبّ رسول ﷺ:

رسول اکرم ﷺ کے نام نامی اور ذکر گرامی کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم لکھا کیجئے۔ عزت واحترام ظاہری وباطنی دونوں چاہئے۔ عملاً اتباع سنت ہر کام میں اور قولاً درود کی کثرت حبّ رسول ﷺ کا ذریعہ ہیں، درود خصوصاً جمعہ کے دن کہ وہ اس دن پیش گاہ نبوی ﷺ میں پیش ہوتے ہیں۔ ہمارے حضرت رحمہ اللہ کو یہ درود پسند تھا۔ "اللّٰهم صلّ علىٰ سيّدنا و مولانا محمد و علىٰ آلِ سيّدنا و مولانا محمّد و بارك و سلّم" جمعہ کی رات بالخصوص تکثیر درود چاہئے۔

ایک خواب کے سلسلہ میں سوال ہے کہ کیا واقعاتِ عالم اور حوادثِ روزگار کا وقوع وحدوث پیشگاہِ نبوی سے ہوا کرتا ہے؟

جواب :- استغفر اللہ! واقعاتِ عالم اور معاملاتِ تکوین صرف اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں۔حضور انور ﷺ باعثِ رحمت ہیں۔آپ پر اللہ تعالیٰ کی جو بظاہر رحمت ہوئی وہ مثالی بشارت رحمۃ للعالمین کے توسط سے دکھائی گئی، مکرر حکم ہے، صلوٰۃ وسلام بطور ذکر کے نہیں بلکہ بطور درود کے پڑھ سکتے ہیں خصوصاً جمعہ کے روز اگر بجائے ذکر درود پڑھا جائے تو اچھا ہے، وحشت دور کرنے کے لئے کسی مختصر درود کی کثرت کیجئے۔

اے نامِ تو دافعِ بلاہا   بیماری قلبِ را شفاہا

بحمد للہ آپ کے لئے حرمین میں دعا کی گئی۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں۔آپ کا خواب مبارک ہے۔اور اس سلسلہ میں آپ کی مقبولیت کی دلیل ہے۔اللّٰھم زد فزد۔ مناجات مقبول میں جو کچھ ہے، وہی ہمارے ہاں معمول ہے، اس کی اجازت ہے۔"بارك الله تعالیٰ"۔

تصور شیخ اور صالحین:

تصور شیخ بلا قصد وارادہ ہو تو حرج نہیں، اور ہمارے حضرت کے خلفاء میں سے جناب خواجہ عزیز الحسن رحمہ اللہ تعالیٰ کا ۱۷ر شعبان کو انتقال ہو گیا۔ افسوس، دعائے مغفرت کیجئے، اور ایصالِ ثواب بتلاوۃ القرآن کیا کیجئے۔صالحین کی محبت کلید کامیابی ہے۔

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود:

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا مفہوم صحیح مختصر یہ جان لیجئے کہ صرف اسی کی ذاتِ پاک موجود ہے۔ ماسویٰ ذاتِ باریٔ تعالیٰ سب کالعدم ہیں، مگر اس کا ہرگز یہ مفہوم نہیں کہ ہر چیز خدا ہی خدا ہے، یہ تو وحدت نہیں، کثرت کا مفہوم ہے، نعوذ باللہ من ذٰلک، وہ وحدہٗ لا شریک ہے۔

اور وحدۃ الشہود کا مفہوم یہ ہے کہ ہر چیز میں اس کے وجود اور اس کی قدرت کا ظہور ہے اور بس۔

تصوف علمی اور تصوف عملی:

تصوف کی دو قسمیں ہیں۔ ایک علمی، دوسری عملی، تصوف کی کتابوں سے جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ تو تصوف علمی ہے اور مجاہدہ اور عمل سے جو صوفیانہ شان پیدا ہوتی ہے، وہ تصوف عملی ہے۔آپ تصوف عملی میں اپنا وقت صرف کیا کیجئے اور اس پر وقت صرف کرنا زیادہ مفید اور موجب خیر و برکت ہے۔

ملفوظاتِ قرآن وہ گنجینہ ہے کہ ہر نظریہ والا اپنے نظریہ کے مطابق اس میں نکات و رموز پاتا ہے، ایک متصوف کو تصوف ہی تصوف نظر آتا ہے، ایک سیاسی کو سیاست ہی سیاست اس میں نظر آتی ہے، مگر مجھے تو قرآن پاک میں تصوف ہی تصوف نظر آتا ہے۔

ہمارے شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ کا نظریۂ تصوف وہی ہے، جو مجدّد طریقت شیخ الکل حضرت مولانا تھانویؒ کا ہے۔کمال دین واسلام کا نام تصوف ہے، احکام شرعیہ کی بجا آوری احسان واخلاص کے ساتھ عین طریقت وحقیقت ہے۔تصوف اسلام کا خلاصۂ اہتمام طاعت اور اجتناب معصیت اور دوام ذکر ہے اور بس۔

افکار دنیا لا حاصل ہیں:

قلب کو طمانیت اور دماغ کو سکون کیوں نہیں ہے؟ اس کے عدم حصول کا باعث کوئی دینی دنیاوی فکر ہوگی، اگر دینی فکر ہے تو مبارک اور دنیاوی فکر ہے، تو اس فکر کا حاصل ہی کیا ہے۔﴿اللہ ولی المؤمنین و نعم الوکیل﴾ پیش نظر رہے

کار ساز ما بفکر کار ما   فکر ما در کار ما آزارِ ما

مجدد طریقت شیخ الکل کی تصانیف کا مطالعہ:

بمرات وکرات مکتوب ہے کہ ہمارے حضرت کی تصانیف یعنی جس قدر ملفوظات اور مواعظ ہیں، انہیں مطالعہ کیا کیجئے، مواعظ ورسائل کا مطالعہ اکسیر ہدایت ہے۔اس سے

استقامت اور بصیرت میں مدد ملے گی۔

آپ التکشف فی التصوف اور بادۂ عرفان شرح دیوان حافظ پڑھا کیجئے۔ حضرت والا کے مواعظ وملفوظات کے مطالعہ سے ان شاء اللہ تعالیٰ کشف حجابات ہوں گے اور سلوک کی سیدھی راہ معلوم ہوگی۔

امام اور امامت کے فرائض:

ناچیز کے ذمّہ خطابت وامامت کی خدمت بھی سپرد ہے۔ اس لئے اس باب خاص میں بھی زبانی اور تحریری ہدایات فرمائیں اور حاضری کے مواقع پر خطابت وامامت کے لئے آگے بڑھا کر عملاً ہدایات حاصل کرنے کا موقع دیا۔

امام نماز کا انتخاب تو جماعت کے ہاتھ میں ہے، تو پھر انتخاب واجازت کے بعد امامت کے لئے آپ کو بڑھنا چاہئے تھا، اور تقاضائے ادب تو یہی تھا کہ بعد اذن بلا پس وپیش آگے بڑھ جایئے، ہاں بلا اذن جماعت امامت کرنا غلط تھا۔ بصورت امامت امام میں جو ریائی کیفیات پیدا ہوئی تھیں، ان کو ظاہر فرما کر ان سے اجتناب واحتراز کی تاکید فرمائی۔

تحسین صورت اور بتکلف حسن وخوبی کے ساتھ قرأت ادا کرنے کی کوشش جو امام کرتا ہے، اس کا مقصد مقتدیوں سے دادِ تحسین کے حصول کے سوا اور کیا ہے؟ اور یہ چیز خلوص کے بالکل منافی ہے۔ نماز میں تمام تر توجہ خلوص نیت کے ساتھ احکم الحاکمین، خالقِ کائنات اور ربّ العالمین کی طرف ہونی چاہئے، نماز اور دیگر عبادات میں انہی کی رضا پر نظر رکھنا چاہئے اور ان ہی کی مرضی کی سعی چاہئے۔ روایات وآثار اور امثال سے امام وامامت وخطابت سے متعلق آداب ورعایات امام وماموم بیان فرمائے۔

کیفیات واحوال اور توحش کے بعد بھی ضبط وسکون کے ساتھ مخلصانہ طور پر اس خدمت کو انجام دینا چاہئے، کسی وقت نماز میں بندۂ ہیچمدان سے سہو ہوگیا، جب سجدۂ سہو ادا کر کے نماز سے فارغ ہوا، تو اعادۂ نماز کے لئے بنظرِ تحسین صلوٰۃ حکم فرمایا۔

حضرت مولانا کا تفقہ:

حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے تعلقات سے پیشتر گاہے گاہے اور تعلقات کے بعد تو اکثر عاجز استفتاء اور استفسارات کیا کرتا تھا، گاہے فرماتے کہ کسی مفتی سے فتویٰ طلب کیجئے، گاہے جواب عنایت فرماتے، چنانچہ چند فتاویٰ راقم کے پاس محفوظ ہیں۔ ان میں سے صرف ایک فتویٰ بابت رویتِ ہلال صوم وافطار جو علماء کے درمیان میں ''معرکۃ الآرا'' ہے، درج کیا جاتا ہے، جس سے مولانا کے تفقہ فی الدین کی حیثیت ناظرین پر واضح ہوجائے گی۔

استفتاء: علمائے دین متین مسائل مندرجۂ ذیل میں کیا فرماتے ہیں:

مسئلہ (۱)

کسی مسلم ریاست کی جماعت یا کسی غیر مسلم ریاست کی مسلم جماعت نے رؤیت ہلال صوم، یا رؤیت ہلال فطر کی تحقیق وتفتیش اور شرعی شہادت لینے کے بعد کسی مسلم عادل مجاز شخص یا کسی غیر مسلم صادق ومجاز شخص کی زبانی، ریڈیو، ٹیلیفون یا تار کے ذریعہ رؤیت ہلال صوم، رؤیت ہلال فطر کی خبروں کو دیگر بلاد وشہور میں نشر کرایا، اور بیک وقت مختلف مقامات سے نشر کرایا، تو انہی متحقق ومصدق اور متواتر خبروں پر مسلمانوں کو صوم یا افطار شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟ اگر ناجائز ہے تو اس کی دلیلیں از روئے شرع عقلی ونقلی کیا ہیں؟

مسئلہ (۲)

کسی مسلم یا غیر مسلم ریاست کے کسی شہر کے عالم دین یا امام مسجد جامع جن کی عدالت وصداقت مسلم ہو، خود بعد اخذ شہادت شرعی کسی ریڈیو اسٹیشن سے رؤیت ہلال صوم یا رؤیت ہلال فطر کی خبروں کو نشر کرتے ہیں یا بجواب تار ٹیلیفون کے ذریعہ خبر ارسال کرتے ہیں، تو ایسی صورت میں صوم یا افطار شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟ اگر ناجائز ہے تو کیوں؟ اس کی عقلی ونقلی دلیلیں از روئے شرع شریف کیا ہوسکتی ہیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب

۱۔ کوئی قاضی ریاست اسلامیہ یا غیر اسلامی ریاست میں کوئی مسلمانوں کا مقرر کردہ قاضی یا امام شرعی شہادت لینے کے بعد رویت ہلال صوم یا فطر کا اعلان بذریعہ ریڈیو یا تار ٹیلیفون کرے تو اس کے قضا کے مطابق عمل کرنا درست ہے، کیونکہ یہ شہادت نہیں بلکہ نتیجۂ شہادت ہے۔ قضائے قاضی کا اعلان ہے، مگر ضرورت ہے کہ ان آلات نشر کی پوری نگرانی کی جائے اور اس کا سارا کام مسلمانوں کے ہاتھوں انجام پائے۔

۲۔ تنہا عالم دین یا امام جامع مسجد ہونا کافی نہیں، اس کا مسلمانوں کی جماعت کا مقرر کردہ عملاً مسلم ہونا ضروری ہے، اگر ایسا شخص ہلال فطر اور ہلال صوم کی شہادت شرعی لے کر کسی آلہ نشر سے شائع کرے، یا تار ٹیلیفون سے ارسال کرے، تو ان کے مطابق عمل کرنا درست ہے، جب کہ آج بھی توپ یا گولہ یا نقارہ یا گھنٹہ سے ہلال یا چاند کے طلوع وغروب کا اعلان حکومت یا کسی مسلمہ جماعت کی طرف سے کیا جاتا ہے اور اس پر عمل کیا جاتا ہے۔

سید سلیمان تاریخ ۲۱ راگست ۴۸ء

از ریاست بھوپال

اس فتویٰ میں یہ فقہی نکتہ کہ یہ شہادت نہیں بلکہ نتیجۂ شہادت ہے، قضائے قاضی کا فیصلہ اور اعلان ہے علامہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقیہانہ نکتہ سنجی کی دلیل روشن ہے۔ دوسرے علماء نے اس شہادت کے غیر معتبر ہونے کی وجہ یہ بیان کی کہ یہ آلات جدید شہادت کے قائم مقام نہیں ہیں، یا یہ آلات ذرائع شہادت کے قائم مقام نہیں ہو سکتے ہیں اور اسی پر بار بار زور دیتے ہیں، شہادت کے فرق کی جانب کسی کی نظر نہیں گئی۔

حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کا عارفانہ کلام اور تصوف میں ان کا مقام

جناب سید حسین صاحب (۱)

حضرت قبلہ سید صاحبؒ کے ذکر کو انہی کے شیخ کے اس مصرعہ سے شروع کرتا ہوں

از سلیمان گیر خلاص عمل

یہ ایک شعر کا مصرعۂ اولیٰ ہے اور مصرع ثانی محفوظ نہیں، اس کو خود حضرت قبلہ کی زبان مبارک سے سنا تھا۔

غالباً ماہ اکتوبر ۱۹۴۲ء کی آخری تاریخوں میں سے کوئی تاریخ اور شوال ۱۳۶۱ھ کا آخری عشرہ تھا، میں اس زمانہ میں بلیا سے رخصت پر دارالمصنفین اعظم گڑھ گیا ہوا تھا، حضرت قبلہ کے قیام کا کمرہ تھا، عصر ومغرب کے درمیان کا وقت تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حضرت قبلہ کو تھانہ بھون سے گہرا ربط اور حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے خط وکتابت کا اصلاحی سلسلہ شروع ہو چکا تھا، حضرت قبلہ اس وقت کن مقامات سے گذر چکے تھے، اور کن حالات سے عبور کر رہے تھے، اس کا جاننے والا بجز رب العزت کے اور کوئی نہیں، شیخ کامل واجل وطالب صادق و بے بدل دونوں اس دار فانی سے دار البقاء میں پہنچ چکے ہیں، انہوں نے اصول طریق کے مطابق اس چیز کو راز میں رکھا، مگر عادۃ اللہ ہے کہ جن حالات سے مخلوق کو آشنا کرنا چاہتے ہیں، اس کے لئے غیب سے سامان مہیا کر دیتے ہیں، ورنہ

بزرگانِ پیشین کے حالات ہم تک نہ پہنچتے، چنانچہ اس دن حضرت قبلہ کے خط کا جواب حضرت تھانویؒ کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا موصول ہوا، چونکہ حضرت قبلہ کے علم میں یہ تھا کہ اس ناچیز کو بھی حضرت حکیم الامت سے عقیدت ہے، اس لئے فرمایا کہ حضرت مولانا کا والا نامہ آیا، اور خود حضرت کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس زمانہ میں حضرت مولاناؒ بوجہ ضعف خطوط کے جواب عموماً خود نہیں تحریر فرماتے تھے، بلکہ دوسروں سے لکھوا دیتے تھے، لیکن حضرت قبلہؒ سے اس درجہ خصوصیت تھی کہ خود ہی جواب تحریر فرمایا تھا، یہ سن کر میں متوجہ ہوگیا کہ اگر کوئی خاص بات ہوگی تو خود ہی بتلائیں گے، میری توجہ کو دیکھ کر فرمایا، حضرت مولانا کبھی کبھی شعار میں جواب تحریر فرماتے ہیں، میں نے دیکھا کہ چار پانچ شعر حضرت مولانا تھانوی کے تحریر کردہ اس مکتوب پر تھے، مگر مجھے زیادہ قریب سے دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی، میرا اشتیاق دیکھ کر اس کا ایک شعر پڑھ کر سنایا، جس کا مصرعۂ اولیٰ اوپر تحریر کیا گیا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ نے اس کی تصدیق فرمادی کہ حضرت قبلہ اخلاصِ عمل کی منزل کو طے کر چکے تھے، اس پر رسوخ ہو چکا تھا، اور دوسروں کے لئے ان کا اخلاصِ عمل نمونہ بن چکا تھا، حضرت تھانویؒ کو جن لوگوں نے دیکھا ہے، اور ان کے معیار و مسلک کو سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت کا یہ فرمانا کہ فلاں شخص سے اخلاصِ عمل کا سبق لو معمولی بات نہ تھی، یہ خط اب بھی یقیناً ان کے کاغذات میں ہوگا۔

میرا قیام اعظم گڑھ ہی میں تھا کہ حضرت قبلہؒ نے الہ آباد کا سفر کیا، اور اثنائے راہ میں یہ غزل وارد ہوئی، جو کسی حد تک ان کے اس وقت کے جذبات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

"براہ الہ آباد ۲۴؍اکتوبر ۴۲ء"

ابھی تو مشقِ فغاں کنج میں ہزار کر ہے   اثر کے واسطے کچھ اور انتظار کرے
جو آج لذتِ دردِ انساں کا جویا ہے   وہ پہلے سوز سے دل کو تو داغدار کرے
اسی کے دینے سے ملتا جو جس کو ملتا ہے   وہی نہ چاہیں تو کوشش کوئی ہزار کرے

ادب سے دیکھ لیں عشاق دور سے ان کو   محال ہے جو انہیں کوئی ہمکنار کرے
سنا تو دے اسے افسانۂ غمِ ہجر ان   وہ اعتبار کرے یا نہ اعتبار کرے
وہ اپنے کان سے سنتے ہیں میرے نالوں کو   وہ طرزِ نالہ ہو جو ان کو بے قرار کرے
پلادے ساغرِ سرشار مجھ کو وہ ساقی   خزاں کو ایک اشارہ میں جو بہار کرے
تری نظر میں ہے تاثیرِ مستی صہبا   تری نگاہ جسے چاہے بادہ خوار کرے

تری نگاہ میں دونوں خواص رکھے ہیں
وہ چاہے مست کرے چاہے ہوشیار کرے

اس غزل سے ثابت ہوتا ہے کہ باوجود شیخ کے اس ارشاد

از سلیمان گیر اخلاص عمل

وہ اپنی حالت پر مطمئن نہیں ہیں، اور آثار جذب و عشق سے پوری غزل اس کیفیت سے لبریز ہے، دوسرے ہی دن حضرت سید صاحب قبلہؒ نے الٰہ آباد سے لکھنؤ کا سفر فرمایا اور اس سفر میں غزل ارقام فرمائی، جو لکھنؤ کے تعزیتی جلسہ منعقدہ ۲۶؍و۲۷؍دسمبر ۵۳ھ کو مولوی حمید صاحب زائر حرم نے پڑھ کر سنائی تھی، جس سے حاضرین جلسہ پر وہ حالت طاری ہوئی جو دیکھنے والے ہی جانتے ہیں اور اس کا بیان کرنا کم از کم میرے لئے مشکل ہے، وہ غزل یہ ہے:

براہ لکھنؤ ۱۵؍اکتوبر ۱۹۴۲ء

صدقِ احساس کی دولت مرے مولا دیدے   غمِ امروز بھلادے غمِ فردا دیدے
دھن کچھ ایسی ہو، فراموش ہو اپنی ہستی   دلِ دیوانہ و سودائی وشیدا دیدے
اپنے میخانہ سے اور دستِ کرم سے اپنے   دونوں ہاتھوں میں مرے ساغر و مینا دیدے
کھول دے میرے لئے علمِ حقیقت کے در   دلِ دانا دلِ بینا دلِ شنوا دیدے
قول میں رنگِ عمل بھر کے بنادے رنگین   لبِ خاموش بنا کر دلِ گویا دیدے
دلِ بیتاب ملے دیدۂ پُر آب ملے   تپِ آتش مجھے دیدے نمِ دریا دیدے

درد دل سینہ میں رہ رہ کے ٹھہر جاتا ہے
جو نہ ٹھہرے مجھے وہ درد خدایا دیدے

یہ غزل اپنی کیفیات کے اعتبار سے سیدؒ صاحب قبلہ کی بہترین غزلوں میں، اور ان کی کیفیات کے عروج وکمال کی آئینہ دار ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ اشعار میں جو عرض درگاہ قاضی الحاجات میں کی گئی تھی، وہ مقبول ہوگئی، اس کو پڑھ کر بے ساختہ حضرت خواجہ حافظ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ غزل یاد آتی ہے، اس کا بھی شان درود کچھ اسی قسم کا ہے

دوش وقت سحر از غصہ نجا تم دادند — وندران ظلمت شب آب حیا تم دادند
بے خود از شیشۂ پرتو ذا تم کردند — بادہ از جام تجلی بہ صفا تم دادند
من اگر کامروا گشتم وخوش دل چہ عجب — مستحق بودم واین ہا بز کا تم دادند
کیمیا ئیست عجب بندگی پیرمغاں
خاک او گشتم وچندین درجا تم دادند

ایک مرتبہ لکھنؤ سے قبلہ کا سفر تھانہ بھون کا ہوا، اور شیخ کی بارگاہ میں تشنگی کو سیرابی عطا ہوئی، اس کی مرقع ایک غزل اور ایک نعت ہے، نعت یہ ہے۔

تھانہ بھون ۲۰ر شوال ۱۳۶۱ھ - مطابق ۴ر نومبر ۱۹۴۲ء

نام محمد صلِّ علی نور محمد صلِّ علی — خد مورد صلِّ علی قد منور صلِّ علی
رحمت عالم صلِّ علی، فخر آدم صلِّ علیٰ — مرسل اکرم صلِّ علیٰ، اسمک احمد صلِّ علیٰ
چہرۂ انور شمس ضحیٰ زلف مبشر لیل سجیٰ — قلب مطہر عین ہدی ذکر محمد صلِّ علیٰ
شاہد عالم شاہ امم ہادی اعظم شمع حرم — صاحب لطف وجود وکرم حق سے موید صلِّ علیٰ

راقم کا گمان غالب ہے کہ اس قیام تھانہ بھون میں قبلہ علیہ الرحمۃ فانی فی الرسول ہوگئے، اور سیرت نگار نبوی ﷺ کے لئے فنا فی الشیخ ہونے کے بعد فنا فی الرسول ہونے میں کیا دیر لگ سکتی ہے، جس شخص نے حضور انور ﷺ کی مقدس زندگی کے ہر ہر پہلو پر سالہا سال کے غور وفکر کے بعد قلم اٹھایا ہو، اور اس کو مدلل ومبسوط طریقہ سے ضبط کر کے دنیا کے

سامنے پیش کیا ہو، کیا یہ ممکن ہے کہ اس نے اپنے حالات واخلاق کو اسی سانچہ میں ڈھالنے کی سعی نہ کی ہوگی، جن لوگوں کو حضرت علیہ الرحمہ اور ان کی نشست وبرخاست ان کے رہن سہن، ان کے خندہ وتبسم، ان کے خورد ونوش، ان کی رفتار وگفتار، ان کے حالات وکردار، ان کے معاملات.....ان کا صبر وتحمل، ان کی جود وعطا وغیرہ کو دیکھنے کا موقع ملا ہے، وہ اس کا اندازہ کرسکتے ہیں کہ ان کے جملہ حالات میں اسوۂ رسول کی کتنی جھلک تھی، اس کے علاوہ حضرت نجیب الطرفین سید تھے اور ان کے اسلاف میں سلسلہ بسلسلہ دولت ولایت ودیعت ہوتی چلی آئی تھی، خود ان کے ذاتی حالات اظہر من الشمس ہیں، ان کو قریب سے دیکھنے والوں کا جن میں ہر طبقہ، ہر جماعت اور ہر خیال کے لوگ شامل ہیں، اس پر اتفاق ہے کہ سیرت نگار نبوی ﷺ کے ظاہری وباطنی اخلاق واعمال پر خلق نبوی کا کتنا گہرا اثر تھا، خود حضرت مولانا تھانوی نے پہلی ہی ملاقات میں اپنے خاص متعلقین سے فرمایا تھا کہ:

''بھائی ان کے اندر کس بات کی کمی ہے، ان کی مثال تو بارود کی سی ہے، محض دیا سلائی لگانے کی دیر ہے''۔

تھانہ بھون میں اس بارہ روز کے قیام کے بعد جب لکھنؤ واپسی ہوئی تو مجھے بھی ان کے پروگرام کی اطلاع ہوئی، رخصت پر تو تھا ہی اپنے نجی کام سے لکھنؤ گیا، اور بعد فجر ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ پر پہنچا، وہاں قبلہ کو موجود پایا، آپ کے حالات وکیفیات کو یہ ناچیز کیا سمجھ سکتا، لیکن اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ حضرت بے حد مسرور وشاداں ہیں، دار العلوم کے اساتذہ، طلبہ اور دیگر حضرات مہمان خانہ میں حضرت کے گرد جمع تھے، اور آپ اپنے مخصوص انداز میں گفتگو فرمارہے تھے، چائے آئی، میں بھی شریک ہوا، چائے کے بعد مخصوص حضرات وہاں رہ گئے تھے، جن میں زیادہ دار العلوم ہی کے اساتذہ اور طالب علم تھے، اس مجلس میں قبلہ نے اپنی غزل مورخہ ۲ر نومبر جو اوپر درج ہوچکی ہے لوگوں کو سنائی، یہ مجلس تقریباً دس گیارہ بجے ختم ہوئی، کھانا کھایا گیا، قدرے قیلولہ کے بعد نماز ظہر مسجد دار العلوم میں جماعت کے ساتھ ہوئی، اس کے بعد پھر مہمان خانہ میں مجلس ہوئی، اس مجلس

میں بھی کچھ غزلیں سنائیں، حاضرین میں سے چند حضرات کو میں نے علیحدہ کہتے ہوئے سنا کہ سید صاحب قبلہ میں غیر معمولی تغیر ہے، یہ باتیں ان میں نہ کبھی دیکھی تھیں اور نہ سنی تھیں، اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ ان کو کبھی اس طرح شعر پڑھتے نہیں سنا تھا، اس لئے بہت متعجب تھے، دو تین دن دارالعلوم میں قیام رہا، اس درمیان میں برابر اس قسم کی مجلس ہوتی رہی، پھر لکھنؤ سے قبلہ کے ساتھ میں بھی ہم سفر ہوا، ریل میں یہ غزل ارقام فرمائی۔

براہ شاہ گنج ۱۶/نومبر ۴۲ء

ہر بات میں جس کی ہے کیفیت مستانہ   آباد رہے یارب تاحشر وہ میخانہ
چھائی ہے یہاں مستی ہر ایک نمازی پر   حیرت ہے یہ گھر اے دل مسجد ہے کہ میخانہ
زاہد نے کہاں پائی زاہد نے کہاں پی لی   گفتار ہے رندانہ رفتار ہے مستانہ
دستار فضیلت ہو یا دلق مرقع ہو   ہونا ہے اسے اک دن نذر مے و میخانہ
وہ چشم محبت تو جویائے محبت ہے   دیکھئے تو ذرا کر کے اس سے کوئی یارانہ
معشوق یگانہ ہے عاشق بھی یگانہ ہو   یعنی کہ جو ان کا ہو وہ سب سے ہو بیگانہ

حاصل رہے کیفیت ہر وقت حضوری کی
آ دل میں مرے چھپ جاے صورت جانانہ

جو شعر لکھتے تھے اس کو کمترین کو سناتے تھے، کچھ اشعار ظہر کی نماز سے پہلے لکھے، کچھ اس کے بعد اور عصر سے پہلے غزل مکمل ہوگئی اور شاہ گنج ہوتے ہوئے ہم لوگ ۸/بجے شب کو اعظم گڑھ کو پہنچے، آخری شعر کے علاوہ پوری غزل میں یا تو شیخ کے فیوض و برکات کا ذکر ہے یا خود اپنی ذاتی کیفیت و حالت کا بیان ہے، آخری شعر خاص طور پر کئی حیثیتوں سے قابل غور ہے، اس میں فنائی اللہ کی دلالت پائی جاتی ہے۔

حضور دوام کی تمنا کے ساتھ محبوب حقیقی سے دل میں سما جانے کی التجا عروج کا انتہائی مقام ہے جس کے بعد سیر فی اللہ شروع ہوتی ہے، جس کی انتہا نہیں، اسی مقام کو کسی عارف نے اس شعر میں ظاہر کیا ہے

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی
تاکس نگوید بعد از یں من دیگرم تو دیگری

اس کے بعد ۲۸/نومبر ۴۲ء کو اعظم گڑھ ہی میں یہ غزل ہوئی

کیا بھری تاثیر میں مطرب تری آواز ہے   جو تری محفل میں بیٹھا وہ سراپا ساز ہے
باغ میں صحرا نظر آتا ہے اور صحرا میں باغ   اب مرے جوش جنون کا اور ہی انداز ہے
پاؤں تو حد ادب سے عشق میں باہر نہ رکھ   وہ ہمہ خوبی و محبوبی سراپا ناز ہے
نام ان کا ہر نفس میں لب پہ یوں آیا کیا   تن سے جیسے روح بسمل مائل پرواز ہے
دیکھئے ملتی ہے کب دولت سکون عشق کی   ہائے ہوئے جوش تو سرمایۂ آغاز ہے
گاہ دیکھا تھا مری چشم تصور نے تمہیں   اب وہی تصویر میری ہمدم و دمساز ہے

جو نہیں معلوم ہے اس کو کوئی جانے گا کیا
جب کہ جو معلوم ہے وہ بھی سراسر راز ہے

اس غزل کا بھی قریب وہی انداز ہے، جو اس سے پہلے کی غزل کا ہے، اب سید علیہ الرحمہ فانی فی اللہ ہو چکے تھے، ان کا کلام اسی نہج پر قائم ہوگیا۔

دسمبر ۴۲ء کی پہلی یا دوسری تاریخ کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا والا نامہ آیا، عصر کی نماز کے بعد حسب معمول کمرہ میں چائے آئی، سب اعزہ جمع ہوئے، چائے پی کر سب لوگ چلے گئے، مگر میں وہیں بیٹھا رہا، قدرے سکوت کے بعد ارشاد فرمایا کہ حضرت مولانا کا والا نامہ آیا ہے، تحریر فرمایا ہے کہ من جانب الٰہی وارد ہوا ہے کہ آپ کو طریق قادریہ نقشبندیہ سہروردیہ و چشتیہ میں اجازت بیعت کی دوں، چنانچہ اس وارد غیبی کے تحت آپ کو اس کا اہل پاتے ہوئے اجازت بیعت کی دیتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ برکت و صبر عطا کریں، اور آپ کے فیوض کو عرصۂ دراز تک جاری رکھیں، آپ اس کی اطلاع اپنے ملنے والوں اور دوستوں کو بھی دیں، تاکہ لوگوں کو علم ہو جائے، اور ان کو افادہ ہو۔

یہ خبر سنانے کے بعد اپنے مخصوص انداز میں فرمایا، کہ بھائی میں تو بالکل خام ہوں،

لیکن حضرت کے ارشاد کی تعمیل میں تم کو اس کی خبر کرتا ہوں، تم اپنے عزیز بھی ہو، اور حضرت سے تم کو عقیدت بھی ہے، میں سن کر باغ باغ ہوگیا، اس کے بعد بھی میرا قیام تقریباً ۳ رہفتہ اعظم گڑھ میں رہا، اور برابر قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میسر رہی، اور بہت قریب سے ان کے حالات مشاہدہ میں آئے، جن کا پوری طرح تحریر میں لانا میرے لئے مشکل ہے اور اس کی اس مختصر مضمون میں گنجائش بھی نہیں ہے، اس لئے صرف نمونہ مشتے از خروارے پیش کرتا ہوں کہ ان سے محبت کرنے والوں کے اشتیاق کو کچھ سیری ہوسکے۔

سب سے بڑی بات جو میں نے دیکھی وہ یہ تھی کہ اس کے بعد بڑی تیزی سے ماسواء سے قلب کا رہا سہا علاقہ بھی منقطع فرما لیا، پہلے دارالمصنفین کے کاموں سے خالی اوقات کا کافی حصہ اہل وعیال کے ساتھ دینی مذاکرہ میں صرف فرماتے، یا چھوٹے بچوں سے بذلہ سنجی میں، اب ان اوقات کا بڑا حصہ خلوت میں گذرتا، خواہ مسجد میں ہو یا اپنے مسکونہ کمرے میں، پہلے عصر کے بعد چائے رفقائے دارالمصنفین کے ساتھ نوش فرماتے، اور مغرب تک ان سے مختلف مسائل پر گفتگو فرماتے، یہ مجلس بھی تقریباً ختم ہوگئی، کبھی اعزہ واہلیۂ محترمہ سے اشتیاق ظاہر کرتے کہ قبلہ سے کچھ باتیں سنوا دیجئے، عرصہ ہوا ان کی صحبت جی بھر کر نہیں میسر آئی، تو وہ جا کر گوشۂ خلوت سے لے آتیں، اور کچھ دیر کے لئے آپ تشریف لے آتے، اہل وعیال واحبّاء کی درخواست بہت کم مسترد فرماتے تھے، اس لئے ان کی دلجوئی واستمالت کے لئے برآمدہ یا آنگن میں تشریف رکھتے، مگر دل کہیں اور ہی ہوتا، سب کی خیر وعافیت دریافت فرماتے، اور جلد ہی اٹھ کر جانا چاہتے، اگر کوئی اصرار کرتا، تو تھوڑی دیر کے لئے رک بھی جاتے، لیکن سب کو یہ محسوس ہوتا:

چسکا لگا ہے جام کا شغل ہے صبح وشام کا
اب میں تمہارے کام کا ہم نفسو نہیں رہا

یہ صورت دیکھ کر لوگوں نے اصرار کرنا ترک دیا، اور حضرت قبلہ کا اہل وعیال سے ملنا جلنا بھی دس پانچ منٹ کا رہ گیا، باہر کے سفر بھی ترک فرما دیئے، ایم اے وغیرہ کے

امتحانات کی ممتحنی وغیرہ سب چھوڑ دی، دارالمصنفین کے کام کے اوقات کے علاوہ خلوت کو زیادہ عزیز رکھنے لگے۔

خورد ونوش اور لباس وغیرہ میں تبدیلی ہوگئی، پہلے کے لباس فاخرہ سب بکسوں ہی میں بند رہ گئے، نادر شاہ کی عطا کردہ خلعت کو کیڑوں نے چاٹ لیا، اکثر اہلیۂ محترمہ یاد کر کے ہر دوسرے دن کپڑے نکال دیتیں، اور اگر کاموں کی مشغولیت سے انہیں خیال نہ رہتا، تو خلاف معمول تین تین دن تک ایک ہی کپڑا پہنے رہتے، بعض لوگ جن کو مزاج عالی میں درخور تھا، کبھی عرض کرتے کہ حضرت تصوف کے یہ معنی تو نہیں کہ انسان کو کپڑا بدلنے کی بھی خبر نہ رہے، مسکرا کر فرماتے کہ اب بوڑھا ہوگیا ہوں، یاد نہیں رہتا، آپ یاد دلا دیا کریں۔

چودھری اکبر حسین صاحب جج نے جن کو حضرت سے عقیدت تھی، تحریر فرمایا کہ حضرت آپ تو خود علوم ومعارف کا سمندر ہیں، آپ کو مولانا تھانویؒ کے پاس جانے کی کیا ضرورت پیش آئی، دریا سمندر میں گرتا ہے نہ سمندر دریا میں، اور بھی بعض لوگوں کے اسی قسم کے خطوط آئے، ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ دیکھئے ان حضرات کو کہ ایک طرف مجھ سے اظہار عقیدت بھی فرما رہے ہیں، اور دوسری طرف اپنی تجویز بھی پیش کر رہے ہیں، اور میرے فیصلہ پر تنقید بھی ہے، عقیدت کے تو یہ معنی ہیں کہ ان کو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ میرے متعلق جو کچھ کہتے ہیں، اگر وہ سب صحیح ہوں تب بھی ان کو غور کرنا چاہیے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ سوچ سمجھ کر اور درست جان کر کیا ہوگا، یہ تو ایک اصولی بات ہے کہ اگر ایک فن میں مجھے مہارت نہیں، اور کوئی اس فن کا مجھ سے زیادہ واقف کار ہے، تو اس سے اس بات کے دریافت کرنے میں کونسی بات خلاف عقل ہے، یہ کیا ضروری ہے کہ ایک انسان میں سارے علوم موجود ہوں، تمام کمالات تو اللہ پاک ہی کے لئے ہیں، اور یہ تو نص سے بھی ثابت ہے، کہ فضّل اللّٰہ بعضھم علی بعض، اس لئے ان کا یہ اعتراض میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا، مگر یہ بیچارے معذور ہیں، ان کی نیت بری نہیں ہے، کبھی کسی پر تعریض نہیں فرماتے، بات کو منقح کرنے کے بعد فیصلہ سامع پر چھوڑ دیتے، خود قطعی حکم نہ لگاتے، عجب

محتاط اور صاحب خلق و مروّت انسان تھے، اکثر فرماتے کہ بھائی کیا میرے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ میں اپنے کپڑے بھی خود سی لیا کروں، یہ تو فن کی بات ہے، حضرت مولانا تھانویؒ کو اللہ پاک نے فن تصوّف میں اس دور میں بڑی مہارت عطا فرمائی ہے، اس لئے ان کی مہارت سے اگر فائدہ اٹھایا جائے، تو اس میں کون سی عیب کی بات ہے۔

انہی ایام میں اکثر دیکھا کہ حضرت قبلہ فرش زمین پر بیٹھے ہیں کہ لوگ آ گئے، آپ وہیں بیٹھے بیٹھے گفتگو فرمانے لگے، کبھی بعد نماز مغرب دارالمصنفین کی مسجد کی شمالی چار دیواری پر ایک کونہ میں ذکر حق میں مشغول ہوتے، کبھی مکان مسکونہ کے باہر برآمدہ میں تخت پر بغیر کسی فرش کے کبھی مکان کے کسی اور گوشہ میں متوجہ الی الحق پائے جاتے، کھانے کا وقت آتا یا کسی اور ضرورت سے لوگ تلاش کرتے ہوئے پہنچتے تو اس حالت میں دیکھ کر عرض کرتے کہ اس طرح کیوں تشریف رکھتے ہیں، فرما دیئے ہوتے تو فرش بچھا دیا جاتا، یا قالین کی جانماز بچھا دی جاتی، سردی کا موسم ہے، ٹھنڈک نہ لگ جائے، فرماتے کہ ان ظاہری باتوں میں کیا رکھا ہے، خود قبلہ کا شعر اس موقع پر یاد آیا،

جون پور ۲۷؍اکتوبر ۴۳ء

ہم ایسے رہے یاں کہ ویسے رہے — وہاں دیکھنا ہے کہ کیسے رہے
خیال دو روزہ کا کیا عیش وغم — سفر کا بھی کیا جیسے تیسے رہے

یہ اس شخص کا حال ہے جو اس دور میں نفاست مزاج میں مرزا جان جاناں شہید کی مثال اور ظاہری و باطنی حسن اخلاق کا مجسمہ تھا، جس کا رہن سہن اور لباس شاہانہ رہ چکا تھا، جس کی سیرت نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند بھی مقبول ہو چکی تھی، وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا درخشندہ ستارا جس کی علمی شہرت ساری دنیائے اسلام میں تھی، وہ صاحب علم جس کے قلم کا لوہا یورپ کے مستشرقین تک مانتے تھے، جس کے زور قلم نے الہلال کو بدر کامل بنا کر چمکایا، جس کی معارف نوازی نے علم وفن کے دریا بہا دیئے، جس نے استاد مرحوم کی وصیت کو اس درجہ نباہا کہ اعظم گڑھ جیسے ویرانے کے ایک گوشہ میں ساری عمر گزار دی، اس

چھوٹے سے مقام کو علم وفن کا مرکز بنا دیا، اور دارالمصنفین کی علمی شہرت ساری دنیا میں پھیلا دی، جس کی زیارت کے لئے دور دور کے اہل کمال آتے تھے۔

وہ جامع العلوم جس کو نادر شادہ نے کابل یونیورسٹی کا نصاب بنانے کے لئے منتخب کیا، جس نے اپنی عربی دانی کا سکہ عربوں تک پر بٹھا دیا، جس نے پیرس اور روم ولندن وغیرہ کے علمی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کیا، وہ مورّخ اعظم جو اپنے دور میں مدتوں معیار تاریخ سمجھا گیا، وہ قدیم وجدید کا سنگم جس کی ذات میں دونوں کی حدیں ملتی تھیں، وہ پرتو صفات نبوی (ﷺ)، وہ نمونۂ اخلاق اسلامی، وہ جامع کمالات انسانی، وہ جسے دنیا کی ہر قسم کی جاہ وشہرت بے طلب حاصل تھی، دفعۃً جب مقام فنا سے گذرتا ہے تو اپنے آپ کو ایسا مٹاتا ہے کہ "موتوا قبل أن تموتوا" کا مصداق بن جاتا ہے، حضرت قبلہ کی ایک غزل ان حالات کی بہترین ترجمان ہے:

پا کر تجھے اپنے کو میں کیا بھول گیا ہوں — ہر سود و زیانِ دوسرا بھول گیا ہوں
جس دن سے مرے دل میں تری یاد بسی ہے — ہر ایک کو میں تیرے سوا بھول گیا ہوں
آتا ہے خدا بھی ترے صدقہ میں مجھے یاد — گویا کہ بظاہر میں خدا بھول گیا ہوں
عالم کے تماشے نہیں اب جاذب دل ہیں — ہر لذتِ ہستی کا مزا بھول گیا ہوں
ہر سمت نظر آتے ہیں ہر وقت وہ مجھ کو — دوریٔ مسافت کا گلہ بھول گیا ہوں
اب مسئلۂ کثرت و وحدت کو میں سمجھا — پا کر تجھے سب تیرے سوا بھول گیا ہوں
سجدہ طرف کعبہ ہے، دل تیری طرف ہے — اب قبلہ بھی اے قبلہ نما بھول گیا ہوں
حل جب سے ہوا فلسفۂ حسن حقیقت — ہر مسئلہ اے ذہنِ رسا بھول گیا ہوں
ہے آہ سحر گاہ میں وہ ذوق لب وگوش — چنگ ونئے وبربط کی صدا بھول گیا ہوں
منظور تری چشم رضا جب سے ہوئی ہے — امید جزا، خوف سزا بھول گیا ہوں
اے رہبر توفیق مجھے راہ بتا دے — نقش قدم راہ نما بھول گیا ہوں
اے خضر مرا قافلہ کس سمت گیا ہے — تمیز صدا ہائے درا بھول گیا ہوں

اُلٹا ہے ورق آج سے افسانۂ نو کا — افسانۂ پارینہ ولا بھول گیا ہوں

یہ غزل حضرت مولانا تھانویؒ سے بیعت ہونے کے ہفتہ عشرہ کے اندر ہی کہی تھی، اس زمانہ میں جو کیفیات ان پر طاری ہوئیں، ان کی ترجمانی اس سے بہتر اور کسی غزل میں نہیں پائی جاتی۔

تصوف میں حضرت کا جو مقام تھا، اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے، مگر اس فن میں حضرت کو جو دستگاہ حاصل تھی، اس کا کسی قدر اندازہ حضرت کے اقوال سے کیا جاسکتا ہے، ایک بار میں نے استفسار کیا کہ حال و مقام کیا ہے اور مراتب سلوک کسے کہتے ہیں، اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

حال: سالک کے قلب پر جو عارضی کیفیت، اس کے اختیار کے بغیر طاری ہوجائے۔

مقام: وہ مرتبۂ سلوک جس پر سالک رسوخ قدم کے ساتھ قائم ہوجائے۔

مراتب سلوک: یعنی مقامات جیسے صبر و شکر، توکل، استقامت علی الحق، زہد، رجاء وغیرہ۔

ایسے جامع کمالات کا تذکرہ جس کے قلم نے صدہا انسانوں کو زندۂ جاوید کردیا، مجھ جیسے ہیچ میرز انسان کے بساط سے باہر ہے، لیکن ان کی جو شفقت اس ناچیز پر تادم آخر رہی، اس کو کسی طرح بھولا نہیں جاسکتا، اور یہ کمترین فرد خانوادۂ سلیمانی اس وقت بھی ان کے فیوض کو اپنے اوپر اسی طرح پاتا ہے، جس طرح ان کی حیات میں پاتا تھا، اور انہی کی روحانی برکت سے یہ چند سطور اس ناچیز کے قلم سے تحریر میں آگئیں۔

اب میں اس ذکر کو حضرت قبلہ کے خواجہ تاش حضرت مولانا عبدالصمد صاحب مدظلہ و دامت برکاتہ کی اس تحریر پر ختم کرتا ہوں، جو انہوں نے حضرت قبلہ کی وفات کے وقت مجھ کو لکھی تھی:

> ''ایک خبر جانکاہ ریڈیو سے ۲۲/نومبر کی شب میں پاکستان سے نشر ہوئی تھی کہ ہمہ صفت علوم درسیہ و ادبیہ و تاریخ و تصوف کے آن موصوف کے ارتحال کی تھی، اسکا صدمہ بہت ہے، ''اِنا للہ واِنا الیہ راجعون'' اللہ تعالیٰ ان کو بہتر ٹھکانا جنت الفردوس میں عطا فرمائیں، اور ان کے درجات عالیہ ہر روز وہاں بلند فرماتے رہیں، موت تو اس عالمِ آب و گل کے ہر بساطِ ہستی کے لئے لازم ہوچکی ہے، مگر موصوف ہمہ صفت پر کیا ماتم کا حق ادا ہوسکے، سوا اس بات کے کہ ہند کی سرزمین کا ایسا فرد جو علمی و ادبی عالم میں مایۂ نازِ ہستی تھا، جس کی تلافی اس عالم میں ماحول کا اندازہ لگاتے ہوئے دشوار ہی نہیں بلکہ محال ہے، اللہ تعالیٰ ان صوفیوں کو اعلیٰ علیین میں بلند مقام پر فائز فرمائیں اور ہم پس ماندگان کے لئے ان کی ذات اقدس کو نمونہ بنا کر درس عمل کی توفیق بخشیں، آپ کی بہت سی خصوصیات، اکتسابی نوادرات میں سے تھیں جو قابل مطالعہ و سبق ہیں، اللہ تعالیٰ صبر جمیل عطا فرمائیں،
>
> حضرت قبلہ مرحوم میرے بڑے بھائی تھے، جس کا صدمہ مجھے بہت زیادہ ہے، اس کی تلافی تو بس اللہ تعالیٰ کی ذات پاک بن سکتی ہے''۔

حاشیہ

(۱) حضرت سید صاحب کے منجھلے داماد ڈپٹی کمشنر

علامہ سید سلیمان ندوی کے ساتھ گذرے ہوئے چند دن

سید ابوعاصم دسنوی (ایڈوکیٹ)

میں بھی تمہیں بتاؤں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکش غم پنہاں سے گر ملے

میں مریض دل ہوں، حال دل کیا کہوں، اور وہ بھی جب بات اہل دل اور صاحب دل کی ہو، مہینوں صاحب فراش رہا۔ زبان بندی کا حکم نافذ، ملاقات پر قدغن، قلم پر روک ٹوک اور یوں بھی علامہ ندوی پر قلم اٹھاتے ہوئے میں ڈرتا ہوں، اس لئے کہ میری نظر کے سامنے وہ تنبیہی نگاہیں ہمیشہ آجاتی ہیں جس نے مجھے زندگی میں کبھی بھٹکنے نہیں دیا۔

ہوا یوں کہ ۱۹۴۰ء میں ڈان دہلی سے نکلتا تھا۔ اس میں ایک مضمون میں نے علامہ ندوی پر لکھا جس میں دوسری بڑی سرخی ''عربی کے عالم اور عبرانی کے ماہر'' لگادی۔ وہ مضمون ڈاکٹر ذاکر حسین شیخ الجامعہ ملیہ کی نظر سے گذرا۔ علامہ ان دنوں کسی جلسہ کے سلسلے میں دہلی گئے ہوئے تھے اور حسب معمول ڈاکٹر ذاکر حسین کے یہاں قیام تھا۔ یہ وہ ڈاکٹر ذاکر حسین ہیں جو بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور بہار کے گورنر ہوئے اور علامہ ندوی کے مولد دیسنہ تشریف لے گئے اور ان کے در اور گھر کی ویرانی کو دیکھ کر بہت متأثر ہوئے، آخر میں ڈاکٹر صاحب بھارت کے صدر جمہوریہ ہوئے جس وقت میرا مضمون ڈان میں شائع ہوا ڈاکٹر صاحب سے میری ذاتی ملاقات نہیں تھی، اس لئے وہ مجھ سے واقف نہیں تھے، ڈاکٹر صاحب نے ڈان کا وہ اخبار علامہ کو دیا اور کہا کہ اس مضمون سے مجھے آپ کے متعلق

بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں اور خصوصیت سے عبرانی زبان میں مہارت کا واقعہ، مجھے معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب کو انہوں نے کیا جواب دیا لیکن جب وہ اعظم گڑھ واپس تشریف لائے تو مجھ کو دیکھتے ہی سوال کیا: ''آپ نے مجھ پر کوئی مضمون لکھا ہے''۔ انداز ایسا تھا کہ میں ڈر گیا، اس لئے میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا ''جی'' فرمانے لگے کہ آپ سے کس نے کہا کہ میں عبرانی زبان کا ماہر ہوں؟ میرے پاس اس کا کیا جواب تھا، میں صرف ارض القرآن کہہ سکا۔ فرمانے لگے کہ اگر آپ یہ لکھتے کہ میں اس زبان سے واقف ہوں یا کچھ جانتا ہوں تو بات صحیح ہوتی، بات صرف اتنی ہے کہ ارض القرآن کی تیاری کے سلسلے میں پونا میں پروفیسر عبدالقادر کی وساطت سے وہاں کے مقامی یہودی عالموں سے عبرانی زبان میں نے سیکھی تھی۔ لیکن ماہر ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ تھوڑی دیر ٹھہرے، پھر ناصحانہ انداز میں فرمانے لگے: ''کسی موضوع پر قلم اٹھاتے وقت سب سے زیادہ خیال واقعات کی صحت پر رکھنی چاہئے''۔

دوسرا واقعہ کچھ ہی دنوں بعد وہیں دارالمصنفین اعظم گڑھ میں ہوا۔ بات یہ ہوئی کہ برصغیر کے ایک چوٹی کے کمیونسٹ لیڈران سے ملنے آئے۔ شاید مسٹر مساتی یا پی۔ ان جوشی تھے۔ اِس وقت میرے ذہن میں نام محفوظ نہیں۔

معمول تھا کہ جب کوئی آدمی ان سے ملنے آتا اور قیام زیادہ ہوتا تو مہمان خانہ میں ٹھہرایا جاتا اور کھانے کے وقت ملاقات ہوتی لیکن اگر کوئی شخص تھوڑی دیر کے لئے آتا اور خالص علمی گفتگو اور تحقیق کے لئے آتا تو ان کو اطلاع کی جاتی اور وہ اس کو اپنے کمرۂ خاص میں بلا لیتے اور وہیں گفتگو ہوتی، ان کا کمرہ کتب خانہ کے سرے پر تھا جس میں چاروں طرف کتابیں تھیں اور کمرے کے تین طرف رفقاء کے الگ الگ کمرے تھے بیچ میں وسیع دارالمطالعہ تھا۔ اچھا خاصا بڑا کتب خانہ تھا۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ کے محل وقوع اور پس منظر کو سمجھنے کے لئے تھوڑی سی تمہید کی ضرورت ہے۔

اعظم گڑھ مشرقی یوپی میں واقع ہے، یوپی انگریزی لفظ یونائیٹڈ پراونس

(United Pravice) کامخفف ہے جسے اردو میں صوبۂ متحدہ کہا جاتا تھا، اصل میں آگرہ اور اودھ دوصوبے تھے دونوں کوملا کرانگریزوں نے یونائیٹڈ پراونس یعنی یوپی بنایا، اوراودھ بہار سے ملا ہوا علاقہ ہے اور بہت کچھ زبان تہذیب وتمدن میں یکسانیت ہے، اسی لئے شادی بیاہ بھی بہت عام ہے، علامہ ندوی کے استاد علامہ شبلی ضلع اعظم گڑھ میں ایک گاؤں بندول کے رہنے والے تھے اوران کے والد اعظم گڑھ میں وکالت کرتے تھے۔ یہیں ان کی پھوس کی بنگلیا اور وسیع باغ تھا، ۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی کا جب انتقال ہوا تو اپنی وصیت کی تکمیل کے لئے دارالمصنفین کا خاکہ اسی مقام پر بنایا، اعظم گڑھ چھوٹا، صاف ستھرا، سادہ، پرسکون شہر ہے اور اسی کے گوشہ میں دارالمصنفین ہے جہاں داخلہ کے لئے ایک بہت بڑا پھاٹک ہے جو عہد مغلیہ کی یاد دلاتا ہے اور پھاٹک کے دونوں طرف رفقا کے رہائشی کمرے ہیں، اور کمرے کے آگے وسیع اور طویل برآمدہ ہے اور برآمدہ کے سامنے چھوٹا سا قطعۂ میدان ہے جہاں بیڈمنٹن کھیلا جاتا تھا، اس کے علاوہ بیچ میں کتب خانہ ہے، کتب خانہ کے بائیں طرف ایک پریس ہے جہاں مولوی مسعود علی صاحب مہتمم کا دفتر تھا۔ اور پریس کے پیچھے وسیع برآمدہ، کتب خانہ کے چاروں طرف سبزہ ہے اور سبزہ کے چاروں طرف قسم قسم کے پھولوں اور گلاب کی باڑھ تھی جہاں سے معطر معطر بھینی بھینی خوشبو رفقاء کے مشام جاں کو عطرآگیں کرتی رہتی تھی۔

پھاٹک سے سڑک نکل کر کتب خانہ سے ہوتی ہوئی علامہ ندوی اور مولوی مسعود علی صاحب مہتمم کی رہائش گاہ تک جاتی ہے، میدان کے بیچ میں وسیع مہمان خانہ اور مہمان خانہ کے سامنے پختہ کھلا ہوا برآمدہ ہے، علامہ ندوی کی قیام گاہ سے قریب سڑک سے ملحق بہت ہی چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے جو اپنی سادگی اور پرکاری کی آپ اپنی مثال ہے، علامہ کی قیام گاہ اور مسجد کے بیچ میں علامہ شبلیؒ اور میرے سب سے بڑے بھائی سید ابوسالم کی قبریں ہیں، درختوں کے زیرسایہ پھولوں کی ڈالیوں سے ڈھکی ہوئی، اب معلوم نہیں کس حال میں ہیں۔ میں نے یہ تفصیل اس لئے بتائی کہ علامہ ندویؒ کی زندگی کے معمولات اور

انہماک کار کے پس منظر کا اندازہ ہوسکے۔

ہاں تو ان کمیونسٹ صاحب سے علامہ کی گفتگو کا ذکر کر رہا تھا۔ علامہ جب اپنے کمرۂ خاص میں ہوتے تھے تو کسی کو اندر داخل ہونے کی ہمت نہیں ہوتی تھی حتی کہ ان کا ملازم سلیم کھانے کے وقت ان کو اطلاع کرنے آتا تو تولیہ کندھے پر رکھ کر سامنے کھڑا ہو جاتا۔ میز سے ان کی نگاہ اٹھتی تو وہ میز سے اٹھ جاتے ورنہ اپنے کام میں ایسے ڈوبے ہوتے تھے کہ گردوپیش کی ان کو خبر نہیں ہوتی تھی۔ اسی لئے کوئی ان کے کام میں سوائے بیحد ضروری بات کے مخل نہیں ہوتا تھا۔

ایسا سکون، ایسی خاموشی، ایسی پُراسراریت معلوم ہوتی تھی جیسے وہ کوئی اور ملکوتی دنیا ہے۔ سادگی اور پُرکاری، خوش ذوقی اور نفاست پسندی کی عجیب بہار تھی، اس پس منظر میں کمیونسٹ رہنما سے گفتگو ہو رہی تھی وہ علامہ ندویؒ سے خدا کے تصور پر اپنے شکوک وشبہات کے جوابات چاہتے تھے، ساری تفصیل اتنی دلچسپ علمی اور پُراز معلومات تھی کہ مستقل عنوان کی محتاج ہے، اس لئے اس کو چھوڑ کے اپنی بات سناتا ہوں، تمام رفقاء اپنے کمرے میں ہونے کے بجائے دروازوں سے لگے کھڑے گفتگو سن رہے تھے، میں بھی ان کے قریب ایک دروازے سے ٹکا ہوا تھا کہ انہوں نے دوران گفتگو فرمایا کہ آپ نے اس مہینے کے معارف میں عاصم کا مضمون علم الانسان پڑھا ہے اور مضمون کی تعریف کی، مجھے حیرت اور خوشی ہوئی، ان کی فرمائش پر وہ پرچہ منگوایا گیا۔ اس پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی، میری خوشی کی انتہا نہیں تھی اس لئے کہ مجھے میرا معراج مل گیا، یعنی میرا مضمون آج ان کو پسند آگیا جس کی انہوں نے تعریف کی، لیکن جیسے ہی وہ حضرت تشریف لے گئے میری طلبی ہوئی، خوشی میں جھومتا ہوا پہنچا، سمجھا کہ شاباشی ملے گی۔ لیکن خلاف توقع میری ایک غلطی کی نشان دہی کی گئی۔ میں نے غلطی کاتب کے سر ڈال دی، اصل طلب کیا گیا، میری بات درست ہونے کے باوجود میری تنبیہ کی گئی کہ غلطی میری تھی کہ کتابت کی اصلاح اور تصحیح کے وقت گرفت کیوں نہیں کی۔

میرے مضامین سب سے پہلے مولانا عبدالسلام ندویؒ پھر شاہ معین الدین ندوی

کے پاس جاتے تھے، میں ان دونوں سے بہت الجھتا اور بحث کرتا تھا، سب سے آخر میں میرے مضامین ان کی میز پر جاتے تھے اور میں کانپ جاتا تھا، معلوم نہیں کس غلطی پر بلایا جاؤں گا، ایک دن اچانک میری میز پر تشریف لے آئے، شاید کسی نے مخبری کردی تھی میری میز پر رکھے ہوئے مضمون کو پڑھنے لگے جو میں نے ''معارف'' کے لئے نہیں بلکہ کسی اور رسالے کے لئے لکھا تھا اور وہ جواب تھا کسی مضمون کا جس میں علامہ ندوی پر بہت ہی ناشائستہ الفاظ میں حملے کئے گئے تھے۔ میری طرف سے بہت ہی تلخ جواب تھا۔ لیکن رفقائے دارالمصنفین کی طرف سے اس مضمون کے جواب کی سختی سے ممانعت کردی گئی تھی، میں نے خاموشی سے سوچا تھا کہ بھرپور جواب دوں گا، انہوں نے پورا مضمون کھڑے کھڑے پڑھا پھر ارشاد ہوا عاصم میاں! میرے قلم میں بھی اتنی تلخی ہے کہ سات سمندر میں دھوڈالو تب بھی کڑواہٹ نہیں جائے گی لیکن باوجود قدرت کے میں نے وہ انداز اختیار نہیں کیا۔ اس لئے تلخ جواب دینا کمال نہیں ہے بلکہ باوجود قدرت کے اس کو پی جانا کمال ہے، میں نے بڑی محنت سے وہ مضمون لکھا تھا لیکن اس کو ان کے سامنے ہی پھاڑ دیا، میرا تاثر بھانپتے رہے، مسکرائے اور چلے گئے۔ لیکن میں رو دیا، لیکن اس کے معنی یہ نہیں سمجھیں کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اسی دن مجھے بے انتہا اداس دیکھ کر کہنے لگے: ''جان پدر میں اس کو ٹوکتا ہوں جس کو عزیز رکھتا ہوں اور حقیقت ہے کہ وہ تمام تر مہر و محبت اور سراپا تبسم تھے، اصل بات یہ ہے کہ وہ صرف بڑے آدمی ہی نہیں بلکہ آدمی گر بھی تھے جو بڑے آدمی سے بھی بڑا ہوتا ہے۔

یہی احوال تھے جس کی وجہ سے میں علامہ پر کچھ لکھتے ہوئے گھبراتا رہا، لیکن ان کی وفات کے بعد جب مولانا رئیس احمد جعفری ندوی نے اپنے رسالہ ''ریاض'' کا سلیمان نمبر ۱۹۵۴ء میں نکالنا چاہا تو انہوں نے محبی و مشفقی مولانا حسن مثنیٰ ندوی کو مجھ پر تعینات کردیا اور میں ان دونوں کے اصرار کو ٹال نہیں سکا اور اس میں میرا مضمون علالت سے وفات تک شائع ہوا جس کو بعد میں معارف کے سلیمان نمبر میں شاہ معین الدین ندوی نے اپنے

تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع کیا اس کے بعد میں نے ہر ایک سے معذرت کرلی، لیکن اس عرصے میں ایک ایسی ہستی درمیان میں آگئی جس کے حکم سے سرتابی کی مجھ میں مجال نہیں ہے وہ ہیں ڈاکٹر سید شمیم صاحب صدر دیسنہ ایسوسی ایشن کراچی، شمیم بھائی سے میں صرف محبت ہی نہیں ان کی عزت بھی کرتا ہوں اس لئے کہ وہ جتنے سچے ڈاکٹر ہیں اتنے ہی اچھے آدمی بھی ہیں، جس کی دوسری مثال میرے عزیز ملک کے مشہور سرجن انصاری کی ذات ہے، اللہ کرے ان کے وصف اور زیادہ ہوں۔ شمیم بھائی کی ساری زندگی بڑی صاف وشفاف اور آب وتاب سے گذری ہے، حسین وخوبصورت ہونے کے باوجود میڈیکل کالج میں ان کی نوجوانی بھی مثالی تھی۔ اور ''نہ چھوٹی ان سے لندن میں بھی آداب سحر گاہی''۔ دو ہجرتوں کے بعد وہ کراچی تشریف لائے ہیں۔ اور اپنے ہم وطنوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان کا حکم ہوا کہ علامہ ندوی کی صد سالہ یوم ولادت کے موقع پر دیسنہ والوں کی طرف سے مجلّہ سلیمانی کی بزم میں میں بھی شریک ہوجاؤں، تعمیل حکم میں حاضر ہوں، بڑے بھائی کا حکم کیوں کر ٹالا جاسکتا ہے۔

علامہ ندویؒ کی شخصیت کتنی ہمہ گیر ہے کہ جس پہلو پر بھی نظر ڈالئے وہ روشن اور تابناک ہونے کے ساتھ ہی ساتھ اتنی وسیع اور گوناگوں ہے کہ ایک مختصر سے مضمون میں اس کا اظہار مشکل ہی نہیں ناممکن ہے، اس لئے میں اپنی یادداشت سے کچھ جھلکیاں پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن وہ یقیناً تشنہ اور نامکمل ہوں گی۔

ایک شبیہ، ایک سراپا جو بچپن سے ذہن و دماغ میں رچ بس گیا تھا، اور کسی پل آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا تھا، جاگتے، سوتے، آنکھوں میں سمایا ہوتا، حتیٰ کہ خواب میں بھی، اور وہ تھا ایک سفید صاف وشفاف عمامہ، جو تہہ در تہہ ایسی خوبصورتی سے جما ہوتا جس پر تاج شاہی کا گمان ہو۔ لیکن سر کے اوپر اسی صافہ کا آخری سرا کلغی کی طرح ہوا میں یوں لہراتا جیسے علم وعرفان کا رہنما ہو۔ اس کے نیچے بلند بالا پیشانی پر گہری لکیریں فکر ونظر کی غمازی کررہی ہوتیں۔ چہرہ سڈول گول بھرا ہوا، تاباں وفرحاں، اس پر سجی ہوئی داڑھی

متوازن متناسب، اس جیسی خوبصورت داڑھی میں نے زندگی میں کہیں نہیں دیکھی، مونچھیں ترشی ہوئی لب اور داڑھی سے ملی ہوئی، آنکھیں چھوٹی لیکن قیامت خیز اور چمکدار جو دل کے پاتال میں اتر جائے۔ ان ذہین اور چمکتی ہوئی آنکھوں نے بہت سے صاحب ذہن ودماغ کو متأثر کیا ہے۔ ان میں ترکی کی مشہور ادیبہ خالدہ ادیب خانم بھی ہیں۔ جنہوں نے خاص طور سے ان آنکھوں کا ذکر کیا ہے۔ رنگ صاف وسفید، ناک متوازن، لب چھوٹے پتلے نرم ونازک، ابرو جڑے ہوئے ایک دوسرے سے پیوستہ ہوکر محیط اور مربوط، ذہن ودماغ کے غماز، چہرہ کا مجموعی تاثر اقبال اور وقار کا آئینہ دار۔ آواز نرم، پست، دھیمی اور تاثیر میں ڈوبی ہوئی جیسے دل سے نکلی ہوئی برقی رو براہ راست دل میں اتر رہی ہے، چھوٹے چھوٹے فقرے تبسم اور تموج کے عکاس، قد متوسط، میانہ روی، اعتدال پسندی اور مزاج کی ہم آہنگی کی تصویر، قدم نپا تلا، ہلکا، بغیر آواز وقار، سنجیدگی، علم، آگہی شعور وجدان کا مکمل نقش۔ کھادی کی سفید شیروانی، کھادی کا سفید کرتا علی گڑھ کٹ کا سفید پتلون نما پائجامہ جس کا پائنچہ پتلون کی طرح الٹ دیا گیا تھا اور پتلون ہی کی طرح کریز دار جس پر کوئی شکن نہیں، نفاست، صفائی اور اعلیٰ ذوقی کا مکمل نمونہ۔ یہ تھے علامہ سید سلیمان ندوی، ایک عالمی ہمہ گیر شخصیت، ایک قد آور مرد مومن، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے روحانی سلسلہ کی ایک کڑی، اپنے والد حکیم سید ابوالحسن صاحب اور بڑے بھائی سید ابوحبیب صاحب کے تربیت یافتہ جو ایک جید عالم، طبیب حاذق کے علاوہ مکتوبات مجددی کے حافظ اور اس سلسلہ کے شیخ طریقت خانقاہ بھوپال کے خلیفہ اور صاحب نسبت بزرگ تھے۔ حضرت اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے تاحال سیاسی دینی مجاہدانہ تحریک کے رکن، جنگ آزادی کے جرنیل جس کا انکشاف انگریزوں کی خفیہ رپورٹوں کی حالیہ اشاعت سے ہوا۔ عالمی اسلامی تحریکوں سے وابستہ، باخبر اور مشیر، عالمی اقتصادی سیاسی اور تاریخی افکار وخیالات اور ذہنی کشمکش کے پیدا کردہ عالم اسلام کے مفادات سے متصادم مسائل پر گہری نظر، اور ان کے حل کے راز داں۔

میں نے جب سے ہوش کی آنکھیں کھولیں ان کو دیکھا، ان کو سنا اور ان سے بہت

کچھ سیکھا جو الحمدللہ میرے ذہن میں آج تک محفوظ ہے، لیکن اس مختصر سے مضمون میں چند خاکے پیش کر رہا ہوں، کچھ ادھر سے کچھ ادھر سے، علامہ کا معمول تھا کہ وہ اپنے وطن دیسنہ میں گرمیوں کی چھٹیاں گذارتے تھے۔ دیسنہ مگدھ دیش کا علاقہ ہے اور یہ علاقہ قدیم غیر آریائی بودھی تہذیب وتمدن کا مرکز رہا ہے۔

نیز شہرت یافتہ جامعہ نالندہ راجگیر میں واقع ہے اور اس راجگیر میں حضرت مولانا شرف الدین یحیٰی منیریؒ اور دوسرے بڑے بڑے بزرگوں کے مزار ہیں جن کی وجہ سے یہ بہار شریف کے نام سے مشہور ہے، دراصل میں اس کا نام ویہار ہے، جس کے معنی بودھی خانقاہ کے ہیں اور چونکہ خانقاہ درس وتدریس اور علم ودانش کا بھی مرکز ہوتی تھی۔ اس لئے وہ علم وعرفان کا سرچشمہ بھی کہلانے لگی، اور وہاں سے بڑے بڑے صاحب فضل کمال پیدا ہوئے۔

اس راجگیر کے پندرہ میل مشرق پر واقع جرائن ندی کے کنارے اپنے وطن دیسنہ میں علامہ نے بڑے شوق سے ایک باغ لگایا تھا جہاں انہوں نے ملیح آباد اور دوسری جگہوں سے آم کے درخت منگوائے اور لگائے تھے مئی کی پندرہ تاریخ کو سب سے پہلے زردہ پک جاتا تھا۔ زردہ آم کی ایک قسم ہے جو پکنے کے بعد گہرا زرد ہوجاتا ہے اور غالب کی زبان میں میٹھا ہوتا ہے اور چونکہ باغ لب سڑک تھا۔ اس لئے ہر راہگیر کی اس پر نظر پڑتی تھی اور اس کی رال ٹپک جاتی تھی۔ اتفاق سے ایک دن ایک شامت زدہ پنڈت راہگیر ادھر سے گذرا، مشک بوزرد زرد آم پر نظر پڑی اس کی نیت ڈول گئی۔ اس نے چند آم توڑ لئے، مالی نے پکڑ لیا اور کسی کو تھانہ دوڑا دیا۔ وہاں سے پولیس آ گئی اور پنڈت جی کو علامہ کے بنگلہ پر پکڑ کر لے گئی۔ علامہ کو خبر ہوئی باہر تشریف لائے اور یہ تماشہ دیکھا اور مسکرائے، علامہ کی طبیعت میں مزاح وظرافت تھی لیکن علمی وادبی چاشنی کی وجہ سے ایسی لطیف کہ صاحب ذوق ہی اس کا لطف اٹھا سکتا تھا۔ چنانچہ تھانیدار صاحب سے کہنے لگے، بھئی! ایک مولوی کا مال تھا پنڈت نے کھالیا۔ آپ کو کیا شکایت ہوئی، تھانیدار بھی غیر مسلم تھا۔ علامہ ان سے کہنے لگے کہ آپ کے یہاں تو پنڈت کو کھلانا بڑا اپُن ہے ان کو جانے دیجئے،

داروغہ جی بے اختیار بول اٹھے آپ منش نہیں مہا آتما ہیں۔

غالباً ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے، میں علامہ کے ساتھ لکھنؤ گیا ملک کے مشہور طبیب حکیم عبدالحمید صاحب یا عبدالمجید صاحب جھوائی ٹولہ لکھنؤ میں مطب کرتے تھے۔ ان سے علاج کے لئے، علامہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ دریائے گومتی کے کنارے لکھنؤ میں ندوہ کی بلند عمارت ہے، اور اسی احاطہ کے اندر ایک خوبصورت مسجد سے ملحق مہمان خانہ ہے، اسی مہمان خانہ میں علامہ کا قیام تھا، اسی زمانہ میں نیاز فتح پوری نے اسلام کے خلاف جرجی زیدان کے مضامین کے انداز پر حملے شروع کر دیئے تھے۔ سارے ملک میں یک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ معارف، ماجد میاں کے صدق اور دوسرے اخبار ورسائل میں سخت مضامین نکل رہے تھے۔ نیاز فتح پوری کی حالت قابل دید تھی، نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ ان کو خبر ہوگئی کہ علامہ لکھنؤ تشریف لائے ہیں، وہ بے دھڑک ندوہ کے مہمان خانے میں آ گئے، کمرے میں جھانکتے ہوئے کہنے لگے کہ میں نیاز ہوں اندر آ جاؤں یا آپ باہر تشریف لائیں گے، علامہ نے کہا دونوں باتیں ہوسکتی ہیں جیسی آپ کی مرضی، وہ اندر تشریف لے آئے اور کچھ عرض ومعروض کرنے لگے، علامہ نے فرمایا آپ کا مقصد تو حل ہوگیا۔ (یعنی آپ کو شہرت تو حاصل ہوگئی) اب برأت حاصل کر لیجئے۔ مسلمان قوم تو بہت بھولی اور سادہ ہے اس نے کیسے کیسے ظالموں کو معاف کر دیا ہے وہ آپ سے بھی خوش ہو جائے گی۔ پھر سب کو مخاطب کر کے یہ مصرعہ پڑھا:

محبت میں تیرے سر کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے

میں نے وہیں سب سے پہلے نیاز فتح پوری کو دیکھا تھا۔

درختوں کے جھنڈ، پھولوں کے جھرمٹ، پودوں، کیاریوں اور سبز وشاداب تختوں سے گھرا ہوا دارالمصنفین مجھے بڑا شاعرانہ اثر انگیز اور پیارا لگتا تھا۔ اس میں علامہ کے نظام الاوقات ایسے منظّم، مرتب اور مربوط تھے کہ آپ ان کو دیکھ کر گھڑی ملا سکتے تھے۔ فجر کے بعد چہل قدمی، صبح سات بجے ناشتہ، ناشتہ کے بعد کتب خانہ، ٹھیک بارہ بجے کھانا، کھانے

کے بعد ایک گھنٹہ قیلولہ۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ ایسا غیر معمولی پرسکون منظّم مرتب دماغ پایا تھا کہ وہ اسی وقت فوراً بے خبر ہو جاتے تھے اور سونے سے پہلے تاکید کرتے تھے کہ اذان سے پہلے انہیں اٹھا دیا جائے، لیکن وہ ٹھیک وقت پر خود سے اٹھ جاتے تھے۔ نپولین کے متعلق انہوں نے پڑھا تھا کہ وہ عین میدان جنگ میں توپ تفنگ کی گھن گرج میں سو جاتا تھا اور وہ بھی بے خبر، لیکن جتنی دیر کے لئے سوتا اسی وقت خود سے اٹھ جاتا تھا لیکن علامہ کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، ڈیڑھ بجے نماز ظہر پھر ۲ بجے سے ۴ بجے تک کتب خانہ، ساڑھے چار بجے نماز عصر اور نماز عصر کے بعد شام کی چائے۔ چائے کے بعد تھوڑی دیر بیڈمنٹن، یا چہل قدمی، اس کے بعد نماز مغرب، مغرب کے بعد رات کا کھانا۔ اس کے بعد نماز عشاء، یہ ان کا معمول تھا۔ ناشتہ، کھانا، رفقاء کے ساتھ شاہی کھانے کے کمرہ میں کھاتے تھے، رفقاء کے باورچی خانہ کو شاہی باورچی خانہ اور مشترکہ کھانے کے کمرے کو شاہی کھانے کا کمرہ کہا جاتا تھا۔ جب کوئی مہمان تشریف فرما ہوتا تو سب لوگ مہمان خانے میں ہوتے تھے۔ رفقاء کا کھانا شاہی باورچی خانہ میں پکتا تھا۔ علامہ اور مولوی مسعود علی صاحب کا کھانا ان کے گھروں سے پک کر آتا تھا۔ اور سب لوگ ساتھ کھاتے، عصر کی چائے کے وقت کوٹھی معززین شہر اور باہر کی شخصیات سے بھر جاتی تھی، بڑی پرلطف علمی گفتگو اور بلند اعلیٰ نشستیں ہوتی تھیں، اکثر برصغیر کی کوئی نہ کوئی عظیم شخصیت آتی رہتی تھی، ڈاکٹر ذاکر حسین، نواب حبیب الرحمٰن شیروانی، ماجد میاں دریا آبادی، مولانا عبدالباری ندوی۔

پنڈت جواہر لعل نہرو، گاندھی جی، ڈاکٹر محمود، مولانا ابوالکلام آزاد ہمیشہ تاریخ مقرر کرتے لیکن میری یاد میں کبھی نہیں آئے۔ مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ، ڈاکٹر سر ضیاء الدین، سر شاہ سلیمان جج فیڈرل کورٹ جسٹس اقبال چیف جسٹس الہ باد ہائی کورٹ اور کون نہیں آتا۔

ایک دن ایک بہت بڑے عالم تشریف لائے، ادب کی وجہ سے ان کا نام نہیں لے رہا ہوں، حسب معمول فجر کے بعد علامہ کے ساتھ اس خوبصورت روش پر چہل قدمی کر

رہے تھے کہ دارالمصنفین سے ملحق شبلی کالج کے وسیع میدان میں کوئی گدھا ٹہلتا ہوا آ گیا، مولانا نے فرمایا سید صاحب! (علامہ کو عام طور سے لوگ سید صاحب کہتے تھے) دارالمصنفین میں گدھے بھی رہتے ہیں۔ علامہ نے سنجیدگی سے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا، جی نہیں باہر سے آجاتے ہیں۔ مولانا بہت محظوظ ہوئے اور بولے ''بہت خوب''۔

۴۲-۱۹۴۱ء کی بات ہے ۱۹۴۰ء کی لاہور تجویز منظور ہوگئی تھی، سارے برصغیر میں مسلم لیگ کا زور تھا۔ تقسیم ملک کا مطالبہ مسلمانوں کی طرف سے شدت اختیار کر رہا تھا، اودھ کے چودھری خلیق الزماں کی شخصیت ایک مسلم رہنما کی حیثیت سے مسلم تھی، چودھری صاحب اپنے پرانے رفیقوں کو مسلم لیگ میں شریک کرنے کے لئے اودھ کا دورا کر رہے تھے، اور اسی سلسلہ میں اعظم گڑھ آئے۔ وہ اعظم گڑھ آتے اور دارالمصنفین نہ آتے یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ چنانچہ وہ دارالمصنفین تشریف لائے، اتفاق سے ان ہی دنوں میں مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ العلمائے ہند بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ اور وہیں مقیم تھے۔ مولانا احمد سعید صاحب مجھ پر بہت ہی مہربان تھے۔ میں کٹر لیگی اور وہ کانگریس کے حامی۔ میں ان سے کہتا تھا، آپ لوگ مسلم لیگ میں داخل ہوجائیں وہ جواب دیتے کیوں مجھ کو مسٹر جناح سے شٹ اَپ اور سٹ ڈاؤن سنوانا چاہتے ہو۔ مولانا عجیب خوبیوں کے اور بڑے باغ و بہار آدمی تھے۔ یہی سمجھ لیجئے وہ جتنے علامہ سے بے تکلف تھے وہ اتنے ہی مجھ سے کھلے ہوئے تھے۔ اور میں ان سے کھل کر بات کرتا تھا۔ ایسے حاضر جواب، محبت اور شفقت والے دیکھنے میں نہیں آئے۔ جب اعظم گڑھ تشریف لاتے تو میرے لئے خاص طور سے بڑی بوتل میں خالص بادام کا تیل ضرور لاتے، کہتے تم طالب علم ہو اسے ضرور استعمال کیا کرو۔ اب ایسے محبت کرنے والے کہاں ملیں گے۔ وہ دسترخوان پر بیٹھتے تو لطیفے، چٹکلے سے دسترخوان کو زعفران زار بنا دیتے،

بڑی ہے داستان ان کی

جب میری شادی ہوئی تو انہوں نے دہلی سے مبارکباد دی کہ شبلی منزل میں

تمہاری وہی حیثیت ہے جو مدینہ میں حضرت علیؓ کی تھی، میں کبھی کبھی ان کے قیام کے دوران ان کا بیان انگریزی میں تیار کر دیتا تھا۔ اس زمانے میں چودھری صاحب سے ہماری بازی چل رہی تھی، چودھری صاحب جب آئے تو چپکے سے میرے کان میں کہنے لگے، کہو تو کہہ دوں کہ وہ بیان میں نے نہیں عاصم لیگی نے دیا تھا، میرے پاس تمہاری تحریر محفوظ ہے، میں فوراً جواب دیتا، مولانا میرے پاس بھی آپ کی تحریر موجود ہے جس میں آپ نے بیان لکھا ہے۔ غرض خوب لطف رہتا، وہ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے، چودھری صاحب سے سیاسی اختلافات کے باوجود وہ چودھری صاحب کی سیاسی بصیرت کے قائل تھے۔ کہتے تھے کہ جواہر لعل کی مشتعل مزاجی اور یوپی کے وزیر اعلیٰ گووند ولبھ کے احساس کمتری نے یوپی میں کانگریس لیگ اتحاد نہیں ہونے دیا، پنتھ چودھری صاحب سے حد درجہ مرعوب اور خائف تھے اور ان کو کسی صورت سے وزیر بنانے کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر چودھری یوپی کے وزیر ہوگئے تو یوپی کی حکومت ان کے ہاتھوں میں ہوگی اور پنتھ وزیر اعلیٰ ہونے کے باوجود کچھ نہیں ہوگا۔

چودھری صاحب علامہ ندوی کو مسلم لیگ میں شریک کرنا چاہتے تھے، علامہ بہت سے سوالات کرتے رہے، مسائل اٹھاتے رہے۔ جس کا تسلی بخش جواب چاہتے تھے۔ چودھری صاحب تنگ آگئے، کہنے لگے میں نے اپنی ساری جوانی قوم وملت کے لئے برباد کردی، یہ آپ لوگوں کا کام تھا کہ آپ ہماری رہبری کرتے۔ علامہ نے فوراً کہا چودھری صاحب یہ بات تو آپ نے غلط کہہ دی کہ آپ نے جوانی برباد کی، باقی باتیں صحیح ہیں۔ چودھری صاحب دل سے کھلکھلا کر ہنس پڑے اور بولے مولانا آپ سے بات کرنا مشکل ہے۔ حالانکہ محبی مولانا اویس صاحب ندوی نگرامی کی زبان میں چودھری صاحب اودھ کے خوش گپ تھے۔ خوب باتیں کرتے تھے، کہنے لگے کہ مولانا آپ کے لئے مجھے کسی خاص آدمی کو مقرر کرنا پڑے گا۔ علامہ نے فرمایا وہ کام بھی آپ کر چکے ہیں، چودھری صاحب چونکے، اور پوچھا کون سا، علامہ نے میرا تعارف کرایا اور فرمایا، یہ ہر وقت صرف

مجھے اور جمعیۃ العلماء ہند کے جو رہنما اعظم گڑھ آتے ہیں ان کو لیگ میں شرکت کی ترغیب دیتے ہیں، چودھری صاحب بہت خوش ہوئے اور تازندگی مجھے عزیز رکھا، میں ان کو چچا کہتا تھا۔ کراچی میں وہ نواب صاحب بھوپال کے مختار عام اور میں نواب صاحب کا وکیل ہوا تو میرے وکالت نامے پر چودھری صاحب ہی کے دستخط ہوئے۔

۱۹۴۶ء میں علامہ بھوپال تشریف لے آئے، نواب صاحب بھوپال انہیں بہ اصرار کھینچ لائے، مولانا محمد علی کے داماد شعیب قریشی صاحب نواب صاحب کے وزیر خارجہ تھے۔ علامہ سے ان کے مولانا محمد علی اور ذاتی روابط کی وجہ سے گوناگوں تعلقات تھے، بالکل گھریلو قسم کی راہ و رسم تھی، پاکستان یقینی ہو چکا تھا، ایک مرتبہ ڈاکٹر ذاکر حسین بمبئی سے دہلی جاتے ہوئے بھوپال اتر گئے اور بغیر اطلاع علامہ کی رہائش گاہ شیش محل تشریف لے آئے۔ میں باہر بیٹھا پروفیسر جوڈ کی ''تاریخ افکار عالم'' پڑھ رہا تھا، پروفیسر جوڈ نے اپنی تازہ ترین کتاب تبصرہ کے لئے علامہ کے پاس بھیجی تھی، علامہ نے اس پر سرسری نظر ڈالی اور مجھے دے دی اور کہا کہ اس کو پڑھو اور انگریزی میں تبصرہ لکھ کر پروفیسر جوڈ کو بھیج دو۔ اب ڈاکٹر صاحب سے میری ذاتی ملاقات ہو چکی تھی اور وہ مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے ہاتھ سے کتاب لے لی اور کہنے لگے۔ واہ مجھے راستہ کے لئے زادراہ مل گیا، بھوپال سے دہلی تک کے لئے میرے پاس کوئی کتاب نہیں تھی۔ میں نے کہا، ڈاکٹر صاحب مجھے اس پر تبصرہ لکھنا ہے، کہنے لگے میں تمہیں کتاب پڑھ کر تبصرہ بھی لکھ دوں گا۔ اور کتاب بھی واپس کر دوں گا، لیکن انہیں نہ تبصرہ لکھنے کا موقع ملا اور نہ ہی کتاب واپس کرنے کا۔ علامہ کو خبر کی گئی، بہت دیر تک ملکی اور اسلامی سیاست پر دونوں کی گفتگو ہوتی رہی اور ان لوگوں کی باتیں سن سن کر میں حیران اور پریشان ہوتا تھا۔

جب تقسیم ملک کا اعلان ہو گیا تو دو اہم شخصیتیں ان سے ملنے آئیں، ایک تو پنڈت سندر لعل تھے جو گاندھی جی کے چیلے تھے، اس انداز سے رہتے تھے کہ سارے جسم پر ایک چادر ہوتی تھی، وہ ان دنوں مسلم اور غیر مسلم اتحاد کے لئے کوشاں تھے اور غیر مسلم

نوجوانوں کے بگڑتے ہوئے تیور کی ملامت کر رہے تھے۔ میں بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا، مجھ سے رہا نہیں گیا، میں بول پڑا کہ اس ذہنیت نے نوبت یہاں تک پہونچا دی، وہ بھڑک گئے، اور مجھ پر برس پڑے، کہنے لگے مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ مسلم یونیورسٹی کے سلوک کو بھول گئے۔ میں نے جواب دیا کہ پنڈت جی معاف کیجئے گا وہ بھی اسی ذہنیت کا کرشمہ تھا، آپ کے زہرناک پریس نے مولانا کے ایک معصومانہ سوال کو افسانہ بنا دیا۔ علامہ نے دیکھا کہ صورت حال بگڑنے والی ہے تو فوراً مداخلت کی اور کہنے لگے پنڈت جی اصل سوال یہ ہے کہ برصغیر میں بار بار غلامی کی کیا وجہ ہے۔ سندر لعل بولے آپ تاریخ کے آدمی ہیں آپ ہی بتا سکتے ہیں۔ علامہ نے فرمایا کہ اس کا صرف ایک سبب ہے اور وہ ہے تنگ نظری، جس کی وجہ سے ماضی میں بھی یہ ملک غلام ہوا اور مستقبل میں بھی غلام ہو سکتا ہے، تنگ نظری اور آزادی ساتھ نہیں چل سکتی، دوسری شخصیت نواب اسماعیل کی تھی، نواب صاحب سے علامہ نے سوال کیا، نواب صاحب بتائیے کہ پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہوگا۔ نواب صاحب بڑے سنجیدہ، مخلص اور صاحب نظر تھے، وہ سوچ میں ڈوب گئے، سر اٹھایا اور پوچھنے لگے مولانا آپ ہی بتائیے۔ علامہ نے فرمایا ''آدمی''، پاکستان کو چلانے کے لئے آپ آدمی کہاں سے لائیں گے؟ بڑی کھلی بات کہہ دی، غالبًا ان کا مطلب یہ تھا جو وہ سمجھاتے تھے کہ ایک نظریاتی مملکت کے قیام اور بقاء کے لئے ان نظریات کے حامل افراد کی جماعت پہلے سے بنائی جاتی ہے۔ جو اس کو چلائے گی اور وہ اسی وقت تک قائم رہتی ہے جب تک وہ افراد باقی رہتے ہیں۔ اور اس کی بقاء کے لئے ایسے ادارہ کی ضرورت ہوتی ہے جہاں سے ایسے افراد مسلسل ڈھل ڈھل کر نکلتے رہیں جو اس کو چلا سکیں۔ علامہ تاریخ اور سیاست کی روشنی میں اسلامی تحریک کو مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے تھے لیکن اس وقت وہ باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں، میری الجھن کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ہماری جنگ آزادی میں علمائے کرام کے بلند روشن اور تابناک کردار کا میں قائل اور معترف تھا۔ اس لئے کہ وہی عام مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن انگریز سے ہمیشہ برسرپیکار رہے لیکن برصغیر کے

غیر مسلم دشمنوں کی مسلم دشمنی سے ناواقف رہے، دوسری طرف انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ وہی غیر مسلموں کی ریشہ دوانیوں سے واقف تھا اس لئے کہ اس کو روز ان سے واسطہ پڑتا تھا، تعلیم میں، ملازمت میں، تجارت میں، لیکن وہ اپنے مشفق انگریز استاد، مہربان انگریز افسر اور بین الاقوامی شہرت یافتہ انسانی ہمدرد انگریز سے بے حد متاثر تھا، اس صورت میں دونوں اپنے بڑے دشمنوں سے ناواقف تھے، اس لئے میری خواہش تھی کہ علمائے کرام مسلم لیگ کی قیادت سنبھال لیں، اور جب علامہ شبیر احمد عثمانی نے مسلم لیگ کے ساتھ دست تعاون بڑھایا تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میری سمجھ میں یہی بات نہیں آتی تھی کہ علماء کرام اسلامی ریاست کے مخالف ہیں، مسلم لیگ کی مخالفت کو اسلامی ریاست کی مخالفت سمجھتا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ انسان کے جہل کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے کو صاحب علم سمجھ لے اور علم کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی ہنرمندی پر شرمسار ہو جائے۔ علامہ کا ایک شعر ہے:

جب سے عیبوں پر نظر اپنی پڑی
اپنے دعویٰ میر سے شرم سی آنے لگی

علامہ ندویؒ جن الفاظ میں مجھے سمجھاتے تھے میں انہیں الفاظ میں دہرانا چاہتا تھا لیکن ڈرتا تھا کہ کہیں ان کے فکر ونظر کی صحیح ترجمانی ہو سکے گی یا نہیں کہ اتفاق سے ان کی ایک تحریر اپریل ۱۹۴۳ء کی مل گئی وہی پیش کر رہا ہوں، جس سے زیادہ واضح اور واشگاف جواب ممکن نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت اسلامی ملکوں میں کوئی اسلامی تحریک جاری نہیں ہے، جو ہے وہ اسلامی تحریک نہیں بلکہ مسلمانوں کی تحریک ہے یعنی مسلمان نام قوم کو دوبارہ سیاست اور سلطنت کی دنیا میں کیوں کر برتری حاصل ہو اور اس کی صورت یہ ہو رہی ہے کہ جن کو مفکرین اسلام کہا جاتا ہے وہ دنیا کی موجودہ برسرعروج قوموں کے ایک ایک خصوصیات کو لے کر دیکھتے ہیں کہ شاید ان کی یہی خصوصیات ان کے اس اقبال کی حقیقی علت تو نہیں؟ اور پھر ان ہی چیزوں کی تحریک مسلمانوں میں کرتے ہیں، قومیت، وطنیت،

اقتصادیت، عسکریت، مذہبیت لادینیت، بے پردگی، بے حیائی اخلاقی اور مذہبی آزادی وغیرہ یورپین قوموں کے خصائص کو لے کر ان کے عروج کا راز دریافت کرتے ہیں، اور اسی راز سے مسلمانوں کو آشنا کر کے اس پر اسلامی تحریک کی بنیاد ڈال رہے ہیں۔ حالانکہ مایۂ طینت آدم زخمیر گر است۔

اصل اسلامی تحریک وہ ہے جو صرف اسلام کے صحیفۂ زبانی اور ارشادات نبوی پر مبنی ہو جس میں وہ اصول یک جا کئے گئے ہوں جن پر ۱۳رسو برس پہلے مسلمانوں کی تعمیر کی گئی تھی۔ ۱۳رسو برس پہلے بھی جب رسول اسلام علیہ الصلاۃ والسلام نے عرب میں اسلام کی دعوت پیش کی، ایران وروم کی بڑی بڑی قومیں موجود تھیں، جن میں وطنیت بھی تھی، قومیت بھی تھی، دولت بھی تعلیم بھی تھی، عسکریت بھی تھی، سلطنت بھی تھی، اوران کے نام کا دبدبہ بھی عربوں پر چھایا ہوا تھا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ان ترقی یافتہ دولت مند حکمرانوں کی خصوصیات کی نقل اتارنے کی دعوت نہیں دی، نہ ان کو کسریٰ کے اصولوں کی تعلیم دی، اور نہ قیصر کے اصولوں سے باخبر کیا، بلکہ دنیا کی قوموں سے بے نیاز ہو کر اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے اور بتائے ہوئے اصول زندگی کو سب کے سامنے پیش کیا جن کے بدلہ قبول اور عمل سے وہ سب کچھ ملا جو دین ودنیا کی بہتری تھی، ان کو آسمان کی بادشاہت کی دعوت دی گئی تو زمین کی بادشاہت بھی ان کو مل گئی، اب بھی آسمان کی بادشاہی کی طلب سے زمین کی بادشاہی مل سکتی ہے۔ اور آسمان کی بادشاہت کا دروازہ ہم پر کیوں کر کھل سکتا ہے صرف اس کی دو کنجیوں سے ایمان کامل اور عمل صالح، فرمایا، ترجمہ: خدا نے ان سے جو تم میں ایمان لائے اور نیک کام کئے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو زمین میں حکومت بخشے گا جیسے ان سے پہلوں کو حکومت بخشی تھی۔

سید صاحبؒ کی شخصیت کا ایک پہلو

مولانا فضل اللہ فاروقی ندویؒ

حضرت الاستاذ محترم سید سلیمان ندویؒ کے متعلق اور ان کی ہمہ گیر شخصیت کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ ان کی علمی خدمات اور ان کی سیرت کا شاید ہی کوئی گوشہ پردۂ خفا میں رہ گیا ہو۔

ان کی علمی خدمات، ان کی سیرت نگاری، انکے علمی و تاریخی مقالات اور ان کے تاثرات قلبی جو انہوں نے اپنے دوستوں عزیزوں اور علمی شخصیات کی وفات پر معارف کے صفحات پر غم واندوہ اور عقیدت و محبت سے لبریز (ہو کر لکھے) ان کے قلم نے ان جذبات دلی کو صفحۂ قرطاس پر ثبت کر دیا جن سے ان کا دل متاثر تھا۔

سید صاحبؒ کی زندگی کا ایک پہلو علمی تحقیقات اور تصانیف سے ہٹ کر ان کی موہنی شخصیت، ان کا دھیمے لہجے میں مخاطب کرنا، اور مسکرا مسکرا کر گفتگو کرنا تھا۔ سامع کے دل میں ان کی باتیں اور نصیحتیں شیر وشکر بن کر قلب و روح میں عجیب تاثر پیدا کرتی تھیں۔

سید صاحب سے اس ناچیز کے خاندان کا بہت قدیم علمی تعلق تھا۔ مولانا سخاوت علی جونپوری اپنے وقت کے مشاہیر علماء میں تھے، یکے از خلفاء سید احمد شہیدؒ تھے، جونپور میں اپنے گھر ہی میں تشنگان علم کو تعلیم دیتے تھے، جنگ آزادی ہند ۱۸۵۷ء سے قبل ہجرت کر کے مکہ مکرمہ میں مقیم ہو گئے تھے۔ اور وہیں ۱۲۷۴ھ - ۱۸۵۸ء میں انتقال ہوا، سید صاحبؒ کے عزیز مولانا محمد یعقوب دسنوی مولانا سخاوت علیؒ کے حلقۂ درس میں شریک

ہوئے اور تعلیم حاصل کی۔ اسی تعلق کی بناء پر سید صاحب اور مولانا ابوبکر محمد فاروقی جو مولانا سخاوت علی کے پوتے تھے کے درمیان میں اور بھی مستحکم اور گہرا رابطہ ہو گیا تھا۔ مولانا کے انتقال سے چند روز قبل سید صاحبؒ آخری ملاقات کے لئے جون پور تشریف لائے تھے۔ اور اپنے دوست کے مرض الموت اور آخری ملاقات کی کیفیت معارف کے ''وفیات'' میں لکھ کر اپنے گہرے رنج والم کا اظہار کیا۔

میں ۱۹۳۱ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوا۔ چونکہ سید صاحب ندوہ کے انتظامی امور کی کمیٹی کے ایک رکن تھے۔ اس لئے آپ ندوہ میں اکثر تشریف لاتے، قدیم روابط کی بناء پر میری تعلیم، اور ہوسٹل میں رہائش کے سلسلے میں دریافت فرماتے اور ساتھ ہی تبرکاً دو ایک سبق بھی پڑھا دیتے تھے۔

اب میں سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مختلف مواقع پر ان کی باتوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن سے اندازہ ہوگا کہ ان کی باتوں میں کتنی مٹھاس، کتنا تاثر اور کیسا کیف ہوتا تھا۔

میں ایک بار بمبئی سے وطن آ رہا تھا، بنارس سے ٹرین بدل کر بنارس لکھنؤ پسنجر پر سوار ہوا، رات کے آخری حصہ میں بنارس سے ٹرین چلتی تھی اور صبح سویرے جون پور پہونچتی تھی، میں ڈبہ میں بستر لگا کر سو گیا تھا۔ جون پور پہنچا تو کسی نے جگایا۔ دیکھا تو سفید عمامہ اور سفید شیروانی میں ایک بزرگ کھڑے ہوئے ہیں۔ ارے یہ تو سید صاحب کھڑے مسکرا رہے ہیں، پھر فرمایا ''اٹھئے جناب! منزل آ گئی، ایسی بے خبری، اور میں اس ڈبے میں نہ آتا تو''؟

سید صاحبؒ اپنی صاحبزادی سے ملنے اعظم گڑھ سے جون پور آجایا کرتے تھے۔ ان کے داماد سید حسین صاحب اس وقت جون پور میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔

سید صاحبؒ افغانستان کے سرکاری دورہ سے واپس تشریف لائے تو ندوۃ العلماء کو کیسے بھول سکتے تھے۔ اس وقت ندوہ کی جامع مسجد زیر تعمیر تھی، سامنے میدان میں دو تین خیمے لگے ہوئے تھے مسعود علی ندوی صاحب وغیرہ کے زیر اہتمام مسجد کی تعمیر ہو رہی تھی۔ سید صاحبؒ تشریف لائے تو اسی خیمہ میں قیام کیا، ہم چند طلباء حاضر خدمت ہوئے۔

مسکرا مسکرا کر افغانستان کے سفر کے واقعات اور راستے کے لطائف سنا رہے تھے۔ پھر آپ نے کسی سے کہا کہ بچوں کو انار کھلاؤ، قندھاری انار کافی بڑے بڑے تھے۔ کسی صاحب نے انار توڑے تو ان کا لال لال رس ہاتھوں کو رنگین کر گیا، مسعود علی صاحب مرحوم نے اپنی مزاح کی عادت کے مطابق فرمایا کہ ''یہ تو کسی افغانی کا خون معلوم ہوتا ہے'' سب ہنسنے لگے، عجیب اتفاق کہ دوسرے ہی دن اخبارات میں نادر شاہ کے قتل کی خبر آ گئی۔

سید صاحبؒ ایک بار بمبئی تشریف لائے۔ میں اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں لائبریرین تھا۔ اور نجیب اشرف ندوی صاحب مرحوم ہمارے ڈائرکٹر تھے۔ نجیب اشرف صاحب سید صاحبؒ کے بھانجے تھے، ان سے ملنے کے لئے انسٹی ٹیوٹ میں تشریف لائے۔ مجھے معلوم ہوا کہ سید صاحب اوپر تشریف لا رہے ہیں تو میں اپنے کمرے سے جلدی سے باہر آیا آپ اوپر تشریف لا چکے تھے۔ میں نے سلام کیا، دیکھا، مسکرائے اور فرمایا ''جناب یہ آپ نے خاندانی روایت کو یہاں آ کر ختم کر دیا، ٹوپی کدھر گئی!'' میں بہت سٹپٹایا اور کہا جلدی میں میں بھول گیا، اور کیا کہتا اس وقت۔

قدیم خاندانوں میں بزرگوں کے سامنے ننگے سر آنا معیارِ تہذیب کے خلاف تھا۔ سید صاحب نے کس خوبصورتی سے نصیحت بھی کر دی اور ساتھ ہی خاندان کی قدیم روایت کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔ سبھی کو تو نہیں ٹوکتے پھرتے تھے۔

خوابوں کی دنیا بھی کیسی عجیب دنیا ہوتی ہے، انسان کو کہاں کہاں کی سیر کراتی ہے، وہ کیسے کیسے مناظر سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے اور دہشت زدہ ہو کر چیخ بھی پڑتا ہے۔

میں اپنا ایک خواب بیان کرتا ہوں، برسوں گذر جانے کے بعد بھی سارے مناظر اپنی تمام ملکوتی رعنائیوں کے ساتھ نگاہوں کے سامنے ہیں۔

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے ندوی حضرات میں سے شاید ہی دو ایک مشہور شخصیتوں نے مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی ہو۔ جب سید صاحبؒ مولانا کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اور بیعت کی تو ہم ایسے اکثر ندویوں کو حیرت اور

تعجب ہوا۔ مجھے اکثر خیال آتا کہ اب اگر سید صاحب سے ملاقات ہوئی تو جرأت سوال کروں گا۔ آخر ان سے ملاقات ہونے سے قبل ہی ایک رات عالم خواب میں میرے سوال کا جواب مل گیا۔

دیکھا کہ فضائے آسمانی میں ایک نہایت وسیع آراستہ و پیراستہ شامیانہ لگا ہوا ہے۔ فضا کا منظر ایسا کہ کچھ سحر کا وقت ہے کچھ شام کا ہے۔ حدِ نظر تک سرخ قالین، صدر میں ایک بڑا سا سرخ گاؤ تکیہ، درمیان میں گاؤ تکیئے سے ٹیک لگائے ہوئے حضرت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ آرام فرما ہیں۔ اسی تکیہ کے بائیں جانب ٹیک لگائے مولانا ابوبکر محمد رحمۃ اللہ علیہ تشریف فرما ہیں، میں دور سے یہ منظر دیکھ رہا تھا شمال سے جنوب کی طرف اڑتے ہوئے نہایت حسین وجمیل فرشتے اپنے چھوٹے چھوٹے پروں سے اڑتے ہوئے گذر رہے ہیں، پروں کی سنسناہٹ صاف سنائی دے رہی ہے۔ ان میں سے ایک میرے قریب سے گذرا، میں نے رک کر دریافت کیا کہ یہ کیسی تقریب ہے۔ اور کیسا جلسہ ہے جواب کیا ملا؟ آپ بھی سنیں ''تمہیں معلوم نہیں سید سلیمان ندویؒ کی مولانا اشرف علی صاحبؒ سے بیعت کی خوشی میں یہ تقریب منائی جا رہی ہے، درمیان میں مولانا اشرف علیؒ اور بائیں جانب مولانا ابوبکرؒ ہیں''۔

اللہ اللہ کیا منظر تھا اور کیسی روح پرور روشنی تھی۔ ذہن میں مہینوں سے جو سوال کھٹک رہا تھا اس کا جواب کس خوبصورت انداز میں اس گناہگار کو مل گیا۔

سید صاحب یونیورسٹی کی کسی میٹنگ میں علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ حسب معمول محترم رشید احمد صدیقی صاحب (خدا انہیں تا دیر تندرست وسلامت رکھے) کے دولت کدے پر قیام فرما تھے مجھے خواب میں بشارت کو کافی دن گذر گئے تھے۔ چونکہ میں بعض خواب اپنی خوابوں کی ڈائری میں لکھ لیا کرتا تھا اسے بھی لکھ لیا تھا۔ سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ خواب بیان کیا، کوئی اور ہوتا تو معلوم نہیں اس خواب کو سن کر اپنے متعلق کیا کیا خیالات قائم کرتا، انہوں نے سنا، مسکرائے اور فرمایا۔

’’آپ بھی کسی نہ کسی دن آئیں گے آپ کے سینہ میں بھی چراغ روشن ہوگا‘‘۔

اور بس۔

سید صاحبؒ کی گفتگو میں ایسا رچاؤ، ایسا بنھاؤ، ایسی نرمی اور شگفتگی ہوتی تھی خاص طور سے چھوٹوں کے لئے کہ کبھی یہ احساس بھی نہ ہوتا کہ دنیائے اسلام کی ایک ایسی عظیم ہستی مخاطب ہے جس کا ثانی اس دور میں ملنا مشکل ہے۔

سید صاحبؒ عالم ارواح میں اسی شامیانے میں مسند کے دوسرے گوشے میں جو جگہ خالی تھی اپنے پیر اور اپنے دوست کے ساتھ بیٹھے ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنی گوناگوں رحمتوں کی بارش کرے اور ہمارا خاتمہ بالخیر کرے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ

مولانا سید احمد اللہ ندویؒ

سید صاحبؒ علمی حیثیت سے بیک وقت عربی اور اردو کے ادیب، فن رجال کے ناقد، علم حدیث کے مبصر، اسلامی تاریخ کے امام اور کلام الٰہی کے واقف اسرار تھے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے فیض صحبت سے مشرف ہونے کے بعد اسلامی تصوف کے رنگ میں بھی رنگ گئے تھے۔

عملی حیثیت سے وہ ناظم تعلیم ندوہ، ناظم دارالمصنفین، رکن دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن اسی طرح اور مختلف اداروں کے رکن اور مشیر تھے، پاکستان تشریف لانے کے بعد بورڈ تعلیمات اسلامیہ اور جمعیۃ علمائے اسلام کی صدارت کی خدمات انجام دیں۔

حیدرآباد دکن آپ اکثر تشریف لے جاتے تھے، جب آپ وہاں تشریف فرما ہوتے تو جامعہ عثمانیہ کے طلبہ اور اساتذہ کا مجمع آپ کے حلقۂ صحبت میں بھرا رہتا تھا۔

ایک دفعہ جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ کی استدعاء پر آپ نے ’’اسلامی تاریخ‘‘ کے عنوان پر کالج میں ایک مبسوط تقریر فرمائی، میں بھی اس جلسہ میں موجود تھا، آپ کی پوری تقریر قیمتی معلومات سے لبریز تھی، تاریخی مواد کی فراوانی کا یہ حال تھا کہ طلبہ کے علاوہ جامعہ کے پروفیسر بھی آپ کی تقریر کے نوٹ لکھتے جاتے تھے، اس محاضرہ میں آپ نے فرمایا کہ انگریزی لفظ ’’ہسٹری‘‘، جس کے معنی تاریخ کے ہیں ممکن ہے کہ عربی لفظ ’’اُسطُورۃ‘‘ سے لیا گیا ہو، عربی میں بھی اُسطورہ کے معنی تاریخ کے ہیں۔

اس کی جمع "أساطیر" ہے، قرآن پاک میں "اَساطیر الاَوّلین" آیا ہے جس کا مطلب ہے اگلے لوگوں کی تاریخ، اسلامی تاریخ میں جتنی امہات الکتب ہیں آپ نے ان کے اوران کے مصنفین کے نام، اوران تاریخی کتابوں کی خصوصیات کو وضاحت سے بیان فرمایا، اس تقریر کو سن کر سارا مجمع جو اہل علم کا تھا عَش عَش کرنے لگا، تعجب کی بات یہ تھی کہ پوری تقریر جس میں بکثرت سن وسال کا تذکرہ تھا، بغیر کسی تحریری یادداشت کے جاری رکھی۔

ایک دفعہ حیدرآباد دکن میں کنگ کوٹھی (قصر شاہی کا نام) کے نواح میں محفل میلاد بہت بڑے پیمانہ پر منعقد کی گئی۔

وقت نامہ میں منجملہ مقررین کے جناب علامہ شبیر احمد عثمانی مرحوم اور جناب علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے اسمائے گرامی بھی درج تھے، اس زمانہ میں اتفاقاً دونوں جلیل القدر ہستیاں حیدرآباد میں موجود تھیں، ان دونوں بزرگوں نے جلسہ میں شرکت فرما کر محفل کی رونق کو دوبالا کر دیا، نظام دکن شاہ عثمان بھی مدعو تھے وہ بھی تشریف لائے، اذن عام تھا، خلقت کا خاصہ ہجوم تھا، مقررین میں علامہ سید سلیمان کا نام نامی اول تھا، آپ استادہ ہوئے اور ''بعثت نبوی کی ضرورت'' پر تقریر فرمائی جو پُر مغز تھی مگر بہت مختصر چند منٹ تک خطاب کرنے کے بعد آپ اپنی تقریر ختم کرنے لگے، فوراً شاہ شان نے جو ذرا دور بیٹھے تھے اپنی مشہور بلند آواز کے لہجہ میں کہا مولوی صاحب تقریر بہت اچھی ہے سلسلہ جاری رکھئے، اس شاہی حکم پر مزید چند منٹ تک اور آپ نے تقریر فرمائی اور جلد تقریر ختم کر دی، اس کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کی باری آئی، آپ نے اپنے خاص انداز خطابت میں ''سیرۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم'' کے عنوان پر تقریر فرمائی جو مطول تھی اور جسے حاضرین نے بہت پسند فرمایا، اختتام جلسہ کے بعد حاضرین میں راہ چلتے ہوئے چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں، ایک فریق کہنے لگا کہ علامہ ندوی پر رُعب شاہانہ غالب آگیا جس کی وجہ سے وہ زیادہ دیر تک تقریر نہ کر سکے، دوسرا فریق کچھ اور توجیہ کرتا تھا، کوئی کچھ کہتا اور کوئی کچھ، لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ علامہ ندوی کی طبیعت اس روز کچھ بے لطف تھی، صرف اپنی ذاتی مروت

اور بانی محفل کے اصرار سے شرکت محفل میلاد اور خطابت پر رضامند ہوئے تھے، دوسرے یہ کہ آپ بادشاہوں کی نفسیات سے واقف تھے کہ وہ لمبی تقریروں کو پسند نہیں کرتے ہیں جیسا کہ عثمان علی پاشا کی عادت ہے کہ وہ نماز جمعہ میں بھی امام کو قُل جیسی سورتوں اور آیتوں کے پڑھنے کی ہدایت کرتے ہیں، ان وجوہ کی بنا پر اس روز آپ کی تقریر مختصر مگر جامع اور مانع تھی اور خیر الکلام ما قلّ و دلّ کے اصول میں تھی۔

علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کو حیدرآباد دکن کے علمی وعربی محکمہ دائرۃ المعارف سے (جہاں عربی کے نوادر مخطوطات طبع ہوتے ہیں) والہانہ محبت تھی جب محکمہ سے کوئی کتاب طبع ہو کے شائع ہوتی تو فوراً اس پر سیر حاصل تبصرہ لکھ کے اپنے رسالہ ''معارف'' میں شائع فرماتے، اور جب کبھی حیدرآباد دکن تشریف لے جاتے تو بہ نفس نفیس اس محکمہ میں زحمت گوارا فرما کر قدم رنجہ فرماتے اور کارکنان دائرہ کی دلجوئی فرماتے، لسان المیزان، تذکرۃ الحفاظ، تاریخ کبیر وغیرہ رجال کی کتابوں نے آپ کو فن رجال کا ناقد بنایا، حاکم کی المستدرک، اور امام بیہقی کی السنن کے مطالعہ نے آپ کو فن حدیث کا عبقری بنایا، جب آپ کسی عنوان پر قلم اٹھاتے تو اس کے مواد حاصل کرنے کے لئے جس قدر اور جہاں بھی کتابیں ملتی تھیں ان کا مطالعہ فرماتے اور اپنے عنوان کے لئے چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی نوٹ کر لیتے تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ کی تمام تالیفات اور تصنیفات میں مواد کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہے اور لفاظی سے مبرّا، آپ جس ملک اور شہر میں جاتے وہاں کا کتب خانہ ضرور دیکھتے اور اس کتب خانہ کی مشرقی نادر کتابوں کی ایک فہرست ضروری معلومات کے ساتھ بروقت قلمبند فرماتے اور پھر بعد کو ان کتابوں پر تفصیلی تبصرہ لکھ کے ایک خاص مقالہ تیار کرتے اور اپنے رسالہ معارف میں شائع فرمادیتے، ساتھ ہی ساتھ عمارتوں کے کتبوں کی عبارتیں نقل فرماتے اور وقت ضرورت اس سے کام لیتے۔

ایک دفعہ میں نے شہر متھرا کے تذکرہ کے سلسلے میں آپ سے کہا کہ جامع مسجد کے کتبے میں یہ اشعار میں نے لکھے ہوئے دیکھے ہیں آپ نے فرمایا ہاں میری یادداشت میں وہ اشعار لکھے ہوئے ہیں۔

آپ ملت اسلامیہ کے کسی مسئلہ کو طبقاتی یا وطنی نظریہ سے دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے، بلکہ وہی نظریہ پسند فرماتے تھے جس میں مجموعی حیثیت سے پوری ملت کو فائدہ پہونچتا ہو، چنانچہ جناب معالی وزیر عبدالوہاب عزام پاشا سفیر مصر برائے پاکستان کے اعزاز میں جمعیۃ علمائے اسلام کی طرف سے نگار ہوٹل میں جلسۂ عصرانہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت علامہ مرحوم نے کی اس وقت آپ نے عربی زبان میں تقریر کی، اثنائے تقریر میں ارشاد فرمایا کہ لندن جاتے ہوئے جب میں فرانس پہونچا اور پیرس کے ایک ہوٹل میں ٹھرا، اتفاق سے اسی ہوٹل میں مصر کے زعیم وقت (غالبًا مولانا نے سعد زغلول پاشا کا نام لیا) بھی تشریف فرما تھے، عندالملاقات میں نے ان سے کہا کہ اس دور میں پوری ملت اسلامیہ یکساں مشکلات میں مبتلا ہے، متحدہ قوت سے ملت کو ان مشکلات کا مقابلہ کرنا چاہئے، اور اسے صرف ایک ملک کے مسلمانوں کا مسئلہ نہ سمجھنا چاہئے، موجودہ مشکلات سے گلوخلاصی کی ضرورت جس طرح مصر کو ہے اسی طرح ہندوستان، ایران، انڈونیشیا، ٹرکی تمام عرب ممالک اور شمالی افریقہ کو بھی ہے، مصر کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ صرف وطنی نعرہ بلند کرکے وہ استقلال نہیں حاصل کرسکتا ہے، اسے بھی پورے عالم اسلام سے تعاون حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک دفعہ علامہ مرحوم نے مولانا شاہ سلیمان پھلواری کی وفات کے تذکرہ کے سلسلے میں فرمایا کہ ضلع عظیم آباد پٹنہ کے تین سلیمان دین کی خدمت انجام دے رہے تھے، مولانا سلیمان اشرف علی گڑھ کالج میں دینیات کے پروفیسر اور محلّہ میرداد بہار شریف کے رہنے والے تھے، مولانا قاری شاہ سلیمان ندوہ کے پرانے رکن اور پھلواری شریف کے باشندہ تھے، یہ دونوں بزرگ دنیا سے رخصت ہوچکے، اب اس سلیمان (اپنی طرف اشارہ کرکے) کی باری ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس تذکرہ کے بعد بھی کافی عرصہ تک دینی خدمت کے انجام دینے کا موقع عطا فرمایا۔

علامہ مرحوم کو اپنی نرینہ اولاد کے تسمیہ میں حرف س سے خاص دل چسپی تھی چنانچہ محل اولیٰ کے صاحبزادے کا نام سہیل اور محل ثانیہ کے صاحبزادے کے نام سلمان رکھا، اللہ

تعالیٰ ان دونوں صاحبزادوں کی عمریں دراز کرے اور دینی خدمت کا اہل بنائے۔

دینی مسائل کے سمجھنے میں جب مجھے الجھنیں ہوئیں تو دو ایک دفعہ علامہ مرحوم کی طرف بھی رجوع کیا، ایک دفعہ قرآن کی روایتوں میں تطبیق دینے میں مجھے اشکال پیدا ہوا، ایک آیت میں انسان کی تخلیق مٹی سے بتائی گئی ہے اور دوسری آیت میں ہر جاندار کی تخلیق پانی سے ظاہر کی گئی ہے انسان میں بھی جان ہے اس لئے وہ بھی پانی سے پیدا کیا گیا ہوگا، اس اشکال کو دور کرنے کے لئے میں نے علامہ کی طرف رجوع کیا آپ نے ارشاد فرمایا پانی سے مراد نطفہ ہے اس جواب سے مجھے اطمینان ہوگیا۔

یوں تو ہم مدرسہ ہونے کی وجہ سے علامہ مرحوم سے میرے تعلقات تھے ہی اور جب سے آپ کے بھانجے مولوی فخرالملک ندوی ام اے کی شادی میری بھتیجی سے ہوئی یہ تعلقات اور شگفتہ تر ہوگئے تھے اسی رشتہ کی وجہ سے کبھی کبھی مجھ سے آپ ظرافت کے لہجے میں باتیں کرتے تھے۔

موجودہ دور میں علامہ مرحوم دینی علوم کے جبل تھے، افسوس ہے کہ یہ کوہ ذخار سرزمین پاکستان کے دارالحکومت کراچی میں اپنے رفیق علم حدیث مولانا شبیر احمد عثمانی کے پہلو بہ پہلو زیر نشین ہمیشہ کے لئے متمکن ہوگیا، ایک رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی کتاب مسلم شریف کے شارح تھے اور دوسری رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سیرۃ نبوی کے شارح تھے۔

جنازہ کی متابعت میں مسلمانان کراچی کے کثیر مجمع کے علاوہ معالی سفیر مصر عبدالوہاب عزام پاشا، معالی سفیر سعودی عرب خطیب عبدالحمید اور ملحق ثقافی مولانا ابوالخیر العرقسوسی بھی شریک تھے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان دونوں محدثوں کو فردوس بریں میں جگہ عطا فرمائے اور ان دونوں کے ضریح مبارک کو اپنی رحمت کے انوار سے منور فرمائے۔ آمین۔

آہ سید العلماء!

حکیم نصیر الدین ندوی

حضرت مولانا سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر درحقیقت ہمارے قدیم علوم ختم ہوگئے، گزشتہ صدی کے مختلف مکاتب خیال کے فقید المثال علماء کے علمی کمالات، صحت واعتدال کے ساتھ قدرت نے سید العلماء کی ذات گرامی میں جلوہ گر کردئے تھے۔

ولیس علی اللّٰہ بمستنکر
أن یجمع العالم في واحد

مولانا سید سلیمان ندوی کے علمی کمالات اور ان کی بلند پایہ ادبی وتاریخی تصنیفات پر مستقل، مفصل اور جامع مقالہ لکھنے کے لئے جمعیت خاطر کے علاوہ مکروہات روزگار سے بھی نجات کی ضرورت ہے، اور بدقسمتی سے میں جمعیت خاطر سے بھی محروم ہوں اور مکروہات روزگار میں بھی گرفتار ہوں، مولانائے مرحوم کی جناب اقدس میں مجھے گوناگوں خصوصیات حاصل رہی ہیں، اور ان کا اختصار یہ ہے کہ بطور ادائے حقوق بزرگانہ میں ان کے متعلق اول کھول کر بہت کچھ لکھوں، مگر افسوس کہ فقدان ذہنیت اور دل کی عدم جمعیت کی بنا پر اپنے اس فریضہ کی ادائیگی سے محروم ہوں، اور سردست حضرت مولانا مرحوم کے باطنی کمالات اور ملکوتی صفات اور اپنے ذاتی مشاہدات عرض کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

آج اکناف عالم میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں کے ارباب فضل وکمال نے مولانا مرحوم کی محققانہ علمی تصنیفات سے استفادہ نہ کیا ہو، اور کسی نہ کسی اعتبار سے ان کو

مولانا کی بارگاہ قدس میں شرف تلمذ نہ ہو، مگر میرے نزدیک مولانا کی شخصیت کو جو مزیت اور شرف حاصل ہے وہ ان کے باطنی کمالات اور خلق محمدی کا مظہر اتم ہونے کے اعتبار سے ہے، اور یہ ایسا شرف ہے جو پوری اسلامی تاریخ میں چند نفوش قدسیہ کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہوا، یہی وجہ ہے کہ قلم قدرت نے موصوف کے مبارک ہاتھوں سے سلسلۂ کائنات اور فخر موجودات کی ایسی گراں مایہ ''سیرت'' لکھوادی جس کی نظیر آج تاریخ عالم میں موجود نہیں، سیرۃ النبی کے عالم وجود میں آجانے سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح ثابت ہوگئی ہے کہ سیرت نگاری کا حق اس وقت تک ادا ہو ہی نہیں سکتا جب تک تائید ایزدی کے ساتھ ساتھ سیرت نگار تعلق محمدی کا مظہر اتم نہ ہو، زور بازو، اور وفور علم اس کے لئے کافی نہیں، یہ سعادت علمی اور نحویت کبریٰ صرف عطیۂ الٰہی ہے

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

میری زندگی کے جو چند دن وسال ان کے سایۂ عاطفت میں بسر ہوئے ہیں انہیں میں اپنی زندگی کا حاصل سمجھتا ہوں، اور ان کی وفات کے بعد جو لمحات حیات باقی ہیں وہ میرے نزدیک بالکل رائیگاں اور عبث ہیں

ایام ہماں بود، کہ با شیخ بسر رفت
باقی ہمہ بے حاصل وبے خردی بود!

وہ جب میرے کاشانۂ ویران میں جلوۂ افروز ہوتے تھے، تو میں اپنے ویران کدے کو رشک گلستاں سمجھنے لگتا تھا، متبسم، اور پُر نور چہرے کے ساتھ تشریف لاتے تھے، مسند مطب پر متمکن ہوجاتے تھے، اور ایک طبیب اجسام کے روحانی اسقام کا ازالہ اپنے کلمات طیبات سے گھنٹوں فرماتے رہتے تھے، کبھی الماری سے اپنے ذوق کی کتاب نکال کر مطالعہ فرمانے لگتے، کبھی میری میز پر رکھے ہوئے جرائد، صدق ومعارف کے مطالعہ میں مصروف ہوجاتے، اور اگر کبھی اتفاقاً انہیں لمحات فرصت میں کھانے کا وقت آجاتا تو

میری عرض والتجا پر برادر محترم حاکم میاں اور برادر عزیز سلمان میاں کے اصرار مراجعت کے باوجود کرمًا توقف فرماتے اور ماحضر تناول فرما کر مجھے ''کلاہِ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید'' کا مصداق بنادیتے۔

وہ طبیب ارواح اور معالج نفوس تھے، مجھے ان کی ذات اقدس کے ساتھ جتنی بھی نیازمندانہ نسبتیں حاصل تھیں ان میں سب سے اہم نسبت یہی تھی، اور وہ ہمیشہ در پردہ میرے باطنی احوال کی نگرانی فرماتے رہے، گزشتہ پیوستہ سال جب اجمیر سے میرے والد ماجد قبلہ مدظلہ العالی کی شدید علالت کی پیہم خبریں مختلف ذرائع سے آنے لگیں تو میں پریشان ہوکر ان کی خدمت گرامی میں حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ خود والد ماجد قبلہ اپنے مکاتیب گرامی میں علالت کی شدت کا اظہار نہیں فرماتے ہیں، اور مجھے آنے سے روکتے ہیں، مگر اجمیر کے دوسرے مخلص بزرگ ان کی صحت کو انتہائی نازک مرحلہ میں بتاتے ہیں، ایسے حالات میں میں کیا کروں .....ارشاد فرمایا کہ ان شاء اللہ انہیں اس بیماری سے صحت حاصل ہوگی، مگر تمہارے اجمیر نہ جانے میں خطرہ ہے، اپنے مرشد کے اس ارشاد سے جہاں مجھے اپنے والد ماجد قبلہ کی صحت کی طرف سے طمانیت ہوئی، وہاں سفر کے لئے بھی میرا اضطراب بڑھ گیا، اور اسی دن میں سفر کا اہتمام کرکے اور ویزا حاصل کرکے عازم اجمیر ہوگیا، جب میں اجمیر پہنچا، اور والد ماجد قبلہ کو دیکھا تو شدت علالت کی وجہ سے ان میں آثار زندگی تقریبًا معدوم تھے، مگر باوجود فقدان آثار صحت، میرے دل پر ان کی صحت کی جانب سے جذبۂ یاس طاری نہ ہوا، اجمیر کے چندروزہ قیام میں مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ اگر میں وقت پر اجمیر نہ پہنچتا تو خطرہ ظہور پذیر ہوکے رہتا، اس لئے کہ میرے والد ماجد قبلہ کے ایک رفیق خاص باوجود ادعائے دوستی کے، اپنی دانست میں، والد ماجد کے سفر آخرت کا مکمل اہتمام کرچکے تھے، ان کی متروکہ متاع دنیوی پر متصرف ہونے کے لئے، جو کچھ حضرت کی نگاہ باطن نے کراچی میں دیکھا تھا اس کا مجھے اجمیر میں مادی آنکھوں سے مشاہدہ کرادیا، اس واقعہ کو جس کا دل چاہے جیسی روشنی میں دیکھے، مگر میرا اعتقاد اپنی جگہ سے تزلزل نہیں کرسکتا۔

وہ اپنے خدام کے مربی و سرپرست تھے، اور بلا ان کی خواہش کے ان کے درد کا درماں بن جاتے تھے، ایک بار میرا مالک مکان میرے درپئے آزار ہوگیا، اور محض مادی منفعت کی خاطر مجھ سے تخلیۂ مکان کا مطالبہ کردیا، اس کے پاس دولت بھی تھی اور زور وقوت بھی، حضرت کو جب میری پریشانی کا حال معلوم ہوا تو مضطر ہوگئے، بہ نفس نفیس تشریف لائے، اور ارشاد فرمایا کہ اس سلسلے میں میں جدوجہد کروں، میں نے عرض کیا کہ حضور صرف دعا فرمائیں، حضور کی ذات گرامی ایسے چھوٹے کاموں سے کہیں ارفع واعلیٰ ہے، ارشاد فرمایا کہ نہیں میں دعا کے ساتھ دوا بھی کرنا چاہتا ہوں، دوسرے روز جب تحقیق احوال کے لئے میں نے اپنے محترم خان بہادر سید رضا حسین صاحب کو کلکٹر کے آفس میں بھیجا تو انہوں نے واپس آکر ارشاد فرمایا کہ اب اس سلسلے میں نہ کسی جدوجہد کی ضرورت ہے نہ سفارش کی، اس لئے کہ جب میں کلکٹر کے آفس میں گیا تو وہاں ایک ہنگامہ برپا تھا، اور افسروں سے لے کر کلکٹروں تک کی زبان پر یہی تھا کہ حکیم صاحب کے معاملہ میں خود مولانا سید سلیمان صاحب ندوی سفارش کے لئے تشریف لائے تھے، اور یہ کام بہت جلد ہوجانا چاہئے، مجھے چند ہی دن میں مکان کا الاٹمنٹ مل گیا، اور میرا مالک مکان آج تک خائب وخامر ہے، اور لطف یہ کہ مکان بھی اس کے تصرف سے باہر ہے، اللہ اللہ اپنے خدام کی یہ عزت افزائیاں اور چارہ سازیاں، ایسے آقا کسے نصیب ہوتے ہیں۔

گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ
گر ره آفتاب تا بانیم

میرے عزیز دوست مولانا محمد ناظم صاحب ندوی اپنی معیار ملازمت ختم کرنے کے بعد جب سعودی سفارت خانے سے بے تعلق ہوئے، تو بے روزگاری کی وجہ سے ان کے اوقات پریشاں ہوگئے، تعلق خاطر کی وجہ سے ان کے احوال پریشاں سے میری طبیعت بھی اثر پذیر ہوئی، اتفاقًا انہیں ایام میں جامعہ عباسیہ بہاولپور میں شیخ الجامعہ کی جگہ خالی ہوئی، اور شیخ الجامعہ کا انتخاب جو کمیٹی کرنے والی تھی، اس میں سب سے اہم شخصیت حضرت

مولانا سید سلیمان ندوی ہی کی تھی، ایک دن حسب عادت جب حضرت اقدس میرے ظلمت کدے پر جلوہ بار ہوئے تو میں نے بکمال ادب، مولانا محمد ناظم صاحب ندوی کی پریشاں روزگاری کا ذکر کرتے ہوئے ان سے درخواست کی، کہ جب شیخ الجامعہ کے انتخاب کا موقع آئے تو قرعۂ فال مولانا محمد ناظم ندوی ہی کے نام پر نکلے، جب میں گفتگو حضور اقدس سے کر رہا تھا، تو میرے پہلو میں عزیز محترم سلمان میاں کھڑے ہوئے تھے، انہوں نے اپنے معصومانہ انداز میں بکمال بے تکلفی حضرت سے عرض کیا، کہ ابا آپ کو تو معلوم ہے کہ جب آپ نے ندوہ کا اہتمام مولانا محمد ناظم ندوی کے سپرد کیا تھا تو وہ فرائض اہتمام کی انجام دہی میں کسی صلاحیت کا ثبوت نہ دے سکے تھے، سلمان میاں کا یہ جملہ سن کر حضور متبسم ہوئے، اور سکوت اختیار فرمایا، میں بھی اپنی جگہ سہم کر خاموش ہو گیا، اور بات آئی گئی ہو گی، مگر اللہ رے بندہ پروری کو جب جامعہ میں شیخ الجامعہ کے انتخاب کا وقت آیا تو اپنے فرزند دلبند کی رائے سے متاثر ہوئے بغیر اپنے ایک ادنیٰ خادم کی درخواست کو شرف قبول بخشتے ہوئے مولانا محمد ناظم ندوی کو شیخ الجامعہ کے عہدۂ جلیلہ پر فائز کر دیا، اور اپنے کرم بے نہایت سے اپنے ایک بندۂ بے دام کو حضیض ارض سے اوج ثریا تک پہنچا دیا۔

وہ محبوب چشم اولیاء تھے، اور اس کے ہم عصر و سابق عہد اولیاء ان کی فکر تسخیر سے خالی نہ رہے، اس موقعہ پر میں ایک خاص واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں:

ایک دن اپنی عادت شریفہ کے مطابق حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ مسند مطب پر جلوہ فرما تھے، اُنہیں ایام میں برادر محترم حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب مجددی بھی میرے غریب خانہ پر اقامت گزیں تھے، مکان کے اندرونی حصہ سے جب برادر موصوف مطب میں تشریف فرما ہوئے تو حضور اقدس کو جلوہ افروز دیکھا، حضور اقدس بھی برادر موصوف کو دیکھتے ہی سروقد کھڑے ہو گئے، اور بلا کسی سابق مشاہدہ کے ارشاد فرمایا کہ یہ صورت تو جانی پہچانی معلوم ہوتی ہے، کیا آپ مولانا محمد ہاشم مجددی ہیں، برادر موصوف نے اثبات میں جواب دیا، اور اسی مجلس میں برادر موصوف نے اپنے علم ویقین کی مجھ سے تصدیق کی، یعنی

حضور کی ذات گرامی کے متعلق ارشاد فرمایا کہ کیا حضرت مولانا سید سلیمان ندوی ہیں یا دنیائے باطن کے یہ دونوں شہسوار جب بغلگیر ہو کر بیٹھے تو حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب مجددی کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ مجھے تو ابتداء ہی سے آپ کے خانوادے سے عقیدت ہے، اور میرے برادر معظم کو حضرت شاہ ابو احمد صاحب مجددی سے شرف بیعت حاصل تھا، مرید بھی تھے، اور ان کے خلیفۂ مجاز بھی تھے، اسی ضمن میں حضرت اقدس نے مولانائے موصوف کو اپنا ایک خاص واقعہ سنایا، جو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار اقدس پر پیش آیا تھا، حضور نے فرمایا کہ میں اپنے چند رفقاء کی معیت میں پنجاب سے دہلی کی سمت آرہا تھا، میرے رفقاء نے حضرت مجدد الف ثانی کے مزار پر حاضری کا عزم ظاہر کیا، اور سرہند شریف کے اسٹیشن پر اتر گئے، اور میں بھی اپنے رفقاء کے ساتھ حضرت مجدد الف ثانی کے روضۂ اقدس کی طرف روانہ ہوا، میرے رفقاء تو حضرت مجدد الف ثانی کے مزار مبارک تک گئے مگر میں نے مزار سے باہر توقف کیا، اور ایک جگہ بیٹھ گیا، میں اپنے عالم خیال میں غرق تھا کہ دفعۃً بیہوش ہو کر گر گیا، عالم بیہوشی میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نورانی شکل وصورت کے بزرگ میرے پاس تشریف لائے، اور ارشاد فرمایا کہ مکتوبات ما را خواندۂ؟ میں جواباً عرض کیا کہ بلے خواندہ ام مگر اکثرے نفہمیدہ ام، اسی سوال کے اعادہ وجواب میں میرے رفقاء مزار اطہر سے واپس آئے تو مجھے بیہوش پایا، جب میں اپنے رفقاء کی پیہم جدوجہد سے عالم ہوش میں آیا تو میرے رفقاء نے مجھ سے اسباب بیہوشی دریافت کئے، مگر میں نے سکوت اختیار کیا اور کسی سے کچھ نہ کہا، اثنائے سفر میں صرف اپنے ایک رفیق خاص سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔

اس سلسلے میں حضرت اقدس نے مولانائے موصوف سے ارشاد فرمایا کہ میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی خدمت اقدس میں صرف ملاقات وحصول نیاز کی عرض سے گیا تھا، مگر انہوں نے مجھے از راہ کرم مرید بھی کر لیا اور خلیفہ بھی بنا دیا۔

یہ دونوں واقعے اس امر کا ثبوت کامل ہیں کہ حضرت اقدس بزم اولیاء میں ایک

مقام خاص کے مالک تھے اور حقیقۃً سرمۂ چشم اولیاء، جس شہباز معرفت پر قطب ملک معرفت حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ انتخاب پڑ چکی ہو اسے حضرت مرشد تھانوی اپنے دام محبت میں کیوں کر اسیر نہ کرتے۔

نہ من براں گل عارض غزل سرایم و بس
کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزارا نند

حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کی خدمت میں (۱)

مولانا مجیب اللہ ندویؒ

ندوہ میں اس وقت فضیلت کی سند درجہ نہم پاس کرنے کے بعد ملتی تھی۔ ہم لوگ درجہ ہشتم میں تھے کہ مختلف درجات کے ساتھیوں نے طے کیا کہ گرمیوں کی چھٹی کے ۱۵/دن دارالمصنفین حضرت سید صاحب کی خدمت میں گزارے جائیں، چنانچہ مولوی عبدالغفار ندوی امیر جماعت اسلامی لکھنؤ، ڈاکٹر اقبال احمد انصاری شعبۂ اسلامیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور غالباً مولوی معین اللہ ندوی نائب ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء اور راقم الحروف حضرت سید صاحب کی خدمت میں اعظم گڑھ پہنچے۔ سید صاحب نے دریافت فرمایا کہ تم لوگ کس غرض سے اور کتنے دن کے لئے آئے ہو؟ ہم لوگوں نے جواب میں عرض کیا کہ ہم لوگ پندرہ دن رہ کر حجۃ اللہ البالغہ اور الفوز الکبیر کا کچھ حصہ آپ سے تبرکاً پڑھنا چاہتے ہیں، بقیہ اوقات میں دارالمصنفین کے کتب خانہ میں مطالعہ کریں گے۔ حضرت سید صاحب، جو طلبہ کے تعلیمی شوق سے بے حد خوش ہوتے تھے، باغ باغ ہو گئے اور دوسرے دن درس شروع ہو گیا۔ پہلے دن کی ملاقات میں حضرت سید صاحب نے فرمایا کہ آپ لوگ اس شعر کا مطلب بتایئے اور یہ کس کا شعر ہے؟ وہ بھی بتایئے:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

سب ساتھیوں نے کچھ نہ کچھ بتایا، مگر میں نے جلد ہی طباطبائی کی شرح دیوانِ

غالب پڑھی تھی، اس لئے ذرا تفصیل سے اس کا مفہوم بیان کیا۔ سید صاحب نے کچھ فرمایا نہیں، مگر ان کے چہرہ سے محسوس ہوا کہ انھوں نے پسند فرمایا۔ میرے تین ساتھی ۷ر دن بعد گھر واپس چلے گئے اور میں پانچ چھ دن اور ٹھہر گیا اور درس جاری رکھا، اس کے بعد گھر چلا گیا۔ اس قیام میں سید صاحب کے سامنے عبارت عموماً عبدالغفار صاحب ندویؒ اور کبھی کبھی میں پڑھتا تھا اور سوالات بھی ہم ہی لوگ زیادہ کرتے تھے۔ ہم لوگ چھٹی بعد ندوہ واپس آئے اور پھر ڈیڑھ سال یا ایک سال سید صاحب سے کوئی خاص ربط نہ رہا، سوائے اس کے کہ جب وہ ندوہ تشریف لاتے تو ہم لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوجاتے تھے۔

میں ندوہ کے آخری سال یعنی درجہ نہم کا امتحان دے رہا تھا اور ابھی ایک پرچہ باقی تھا کہ مجھے شدید قسم کی درد گردہ کی شکایت ہوگئی۔ آخری پرچہ میں ابھی تین دن کا وقفہ تھا۔ اس اثناء میں ڈاکٹر عبدالعلی رحمۃ اللہ علیہ ناظم ندوۃ العلماء نے میرا خصوصی علاج کیا، جس سے دو دن میں قدرے افاقہ ہوگیا۔ مگر ابھی کمزوری باقی تھی۔ میرے ساتھی پرچہ چھوڑ دینے کا مشورہ دے رہے تھے، لیکن میں امتحان چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوا۔ کمزوری کی وجہ سے ٹیک لگا کر کاپی لکھنے کی اجازت طلب کی۔ مفتی سعید صاحب مرحوم نے (جو امتحان کے نگراں تھے) صرف ٹیک لگانے کی اجازت ہی نہیں دی، بلکہ ایک تکیہ بھی منگا دیا۔

ایک سال پہلے ندوہ میں ایک بڑی اسٹرائک ہوگئی تھی، اس اسٹرائک کی وجہ سے ہر درجہ میں طلبہ کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی۔ درجہ نہم میں ہم لوگ صرف تین ساتھی تھے؛ راقم الحروف، وحیدالرحمان بچھرایونی اور عبداللہ عباس۔ فراغت کے بعد وحیدالرحمان صاحب کچھ دن کے لئے دارالمصنین آئے، مگر جلدی واپس چلے گئے۔ وہ گھر کے بڑے زمین دار تھے، اس کے کام میں لگ گئے۔ عبداللہ عباس کچھ برسوں بعد سعودی عربیہ چلے گئے اور وہاں کے شہری ہوگئے۔ وہی اس وقت ندوہ کے معتمد تعلیم ہیں۔

سالانہ امتحان میں راقم الحروف کے ایک دو پرچے باقی تھے کہ استاذ الاساتذہ حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا گرامی نامہ ملا، جس میں تحریر تھا:

''امتحان کے بعد تم سیدھے دارالمصنفین آجاؤ۔ تم ہمیں قرآن سناؤ اور میں تمہیں قرآن پڑھاؤں۔''

قرآن سنانے کا مطلب تراویح میں قرآن سنانا تھا۔ رمضان المبارک میں سید صاحب قرآن کا درس دیا کرتے تھے۔ قرآن پڑھانے سے اسی طرف اشارہ فرمایا تھا۔

خط ملنے کے بعد دوسرے ہی دن میرے اوپر درد گردہ کا حملہ ہوا۔ اگلے پرچے میں کچھ وقفہ تھا۔ ڈاکٹر عبدالعلی مرحوم ناظم ندوۃ العلماء نے علاج کیا، جس سے دو دن بعد میں پرچہ لکھنے کے قابل ہوگیا۔ اس وجہ میں میں نے حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ میں درد گردہ کی وجہ سے بہت کمزور ہوگیا ہوں، اس لئے سیدھے گھر جارہا ہوں، کمزوری دور ہونے پر حاضر خدمت ہوجاؤں گا۔ چھٹی بعد گھر چلا گیا۔ ہفتہ عشرہ میں جب ضعف دور ہوگیا تو میں نے شروع رمضان میں خط لکھا کہ اب میں ٹھیک ہوگیا ہوں، اگر اجازت ہو تو حاضر خدمت ہوجاؤں۔ ایک ہفتہ کے بعد جواب آیا کہ ''مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ تم میرے مشوروں پر عمل کرنا نہیں چاہتے، اس صورت میں میں تمہیں کیا مشورہ دوں۔''

یہ خط میرے لئے ایک عظیم سانحہ تھا، جس سے دل و دماغ بالکل ہل گیا یہ سوچ کر کہ بغیر کسی طلب کے ایک سنہرا موقع ملا تھا، جسے میں نے ضائع کردیا۔ بہر حال چوبیس گھنٹے بعد میں نے حضرت سید صاحب کو ایک لمبا خط لکھا، جس میں یہ جملہ بھی تھا کہ ''میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ معتبر ذریعہ کون سا ہے جس سے میری نافرمانی آپ کے علم میں آئی؟''۔ اتفاق کی بات ہے کہ دو دن پہلے مولانا علی میاں صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا گرامی نامہ آیا تھا کہ اگر تم پسند کرو تو فلاں مدرسہ کی صدر مدرسی مل سکتی ہے، سو روپئے تنخواہ (۱۹۴۴ء کا سو روپیہ) ملے گی۔ میں نے مولانا کو لکھ دیا کہ حضرت سید صاحب کو میں نے خط لکھا ہے، ان کا جواب آنے کے بعد میں آپ کے گرامی نامہ کا مفصل جواب دوں گا۔ حضرت سید صاحبؒ کے خط میں میں نے مولانا علی میاں کا خط اور اپنا جواب بھی رکھ دیا۔

جب سید صاحب کو خط ملا تو وہ خوش ہو گئے اور ان کی ساری غلط فہمی دور ہو گئی۔ انھوں نے لکھا کہ تم دارالمصنفین چلے آؤ، بحیثیت رفیق دارالمصنفین میں تمہارا تقرر ۳۵/ ماہوار وظیفہ پر کر دیا گیا ہے۔ حضرت سید صاحبؒ نے اپنے خط کے آخر میں لکھا کہ ”تم سے ہم کو یہی توقع تھی، مگر وفاداری بشرف استواری عین ایمان ہے۔“ پھر اپنے خط کے ساتھ میرے خط کے اس جملہ پر کہ وہ معتبر ذریعہ مجھے معلوم ہونا چاہئے۔ خطِ نشان لگا دیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ بڑوں سے تخاطب میں یہ انداز اختیار نہ کرنا چاہئے۔

جس معتبر ذریعہ کا ذکر حضرت سید صاحب نے اپنے خط میں فرمایا تھا وہ یہ تھا کہ رمضان میں ہمارے مہتمم مولانا عمران خاں اعظم گڑھ آئے تھے۔ ان سے حضرت نے میرا ذکر فرمایا تو انھوں نے کہہ دیا کہ وہ بہت اونچے خیال کے ہیں، اس لئے آپ کے مشورہ پر شاید عمل کریں، ہم لوگوں سے وہ کچھ کبیدہ خاطر تھے۔

سید صاحب کا خط آنے کے بعد میں نے والد صاحب سے مشورہ کیا کہ ۳۵/ روپے ٹھیک ہے یا سو روپے۔ انھوں نے کہا کہ ۳۵/ روپے کا وظیفہ زیادہ ٹھیک ہے، چنانچہ ۱۴/ نومبر ۱۹۴۴ء کو دارالمصنفین آ گیا۔ والد صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے کہ ان کے مومنانہ مشورے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے تھوڑا بہت دین، علم دین اور ملت کا کام لے لیا۔ ۱۴/ نومبر ۱۹۴۴ء کو راقم الحروف کا دارالمصنفین میں بہ حیثیت رفیق تقرر ہوا۔

دارالمصنفین میں مجھے وہ کمرہ ملا جس میں اس وقت ڈاکخانہ ہے۔ یہ دارالمصنفین کی علمی زندگی کے عہد شباب کا آخری زمانہ تھا۔ ایک طرف علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ بہ نفس نفیس موجود تھے، جو ملک میں علم و تحقیق کی آبرو اور وقار بنے ہوئے تھے۔ علامہ اقبال نے صحیح لکھا تھا کہ ”ہندوستان میں علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد آپ کے سوا کون ہے؟“ دوسری طرف ان کے معاصر مولانا عبدالسلام صاحب ندوی مرحوم تھے، جو علم وادب کا ماخذ سمجھے جاتے تھے، تیسری طرف مولانا مسعود علی ندوی مرحوم تھے، جن کی ذات سے وہاں کا مثالی نظم وانتظام باقی تھا۔ چوتھی طرف لائق رفقاء مولانا شاہ معین الدین ندوی

مرحوم، مولانا ریاست علی ندوی مرحوم، سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم، مولانا ابوالجلال ندوی مرحوم علم وتاریخ کے موتی بکھیر رہے تھے۔ دفتر اور پریس میں بھی بڑے باصلاحیت افراد موجود تھے۔ یحییٰ اعظمی صاحب دفتر میں کام کرتے تھے، مگر ادب وشاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ ابوعلی عبدالباری مصحح تھے، مگر ہم چھوٹوں ہی کی نہیں، بلکہ بڑوں کی تحریروں کی بھی اصلاح کر دیا کرتے تھے۔ غرض یہ کہ یہاں ہر طرف علمی رونق بکھری ہوئی نظر آتی تھی۔ علمی کاموں کے لئے جس سکون کی ضرورت تھی وہ یہاں کی پوری فضا میں موجود تھا، مگر یہ سکون زندگی کا سکون تھا، موت کا نہیں۔

دو دن کے بعد حضرت سید صاحب نے فرمایا کہ حضرت آمنہ پر ایک مضمون لکھ کر دکھاؤ۔ ایک ہفتہ محنت کر کے طبقات ابن سعد، ابن ہشام اور سہیلی وغیرہ میں جو مواد تھا اس کی روشنی میں مضمون لکھ کر حضرت سید صاحب کی خدمت میں لے گیا۔ ایک تو میرا خط اچھا نہیں تھا، ساتھ ہی کئی جگہ کٹا کٹا تھا۔ سب سے پہلے حضرت سید صاحب نے کاٹ کوٹ دیکھ کر مسکراتے ہوئے فرمایا کہ مصنف بننے کی صلاحیت ہے۔ میں نے حضرت عبداللہ کے ذکر میں لکھا تھا کہ شادی کے وقت ان کی عمر ۲۳/ برس تھی۔ اس جملہ پر حضرت سید صاحب کی نظر پڑی تو فرمایا: اس کا حوالہ نہیں دیا، کہاں سے لیا ہے؟ میں نے جواب میں کہا کہ طبقات ابن سعد میں ہے۔ فرمایا کہ لاؤ۔ میں نے طبقات ابن سعد کو الٹا پلٹا تو نہیں ملا۔ اس دن میں ٹال گیا، حضرت سید صاحبؒ کے سامنے نہیں گیا۔ دوسرے دن سید صاحب نے پوچھا کہ حوالہ ملا؟ میں خاموش رہا۔ فرمایا کہ ”آپ تاریخ نویسی کرتے ہیں یا تاریخ سازی۔“ اگر قیاس سے کسی بات کو لکھنا ہو تو حتمی بات نہ لکھنی چاہئے، بلکہ یوں لکھنا چاہئے کہ فلاں فلاں واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عمر اتنی رہی ہوگی۔ ایک دن سید صاحب نے بلا کر آہستہ سے فرمایا کہ مولانا مسعود علی صاحب سے ملے کہ نہیں؟ میں نے کہا: نہیں۔ فرمایا کہ کبھی کبھی ملتے رہا کرو۔

طالب علمی کے آخری زمانہ میں دل میں ایک خلش پیدا ہوئی تھی کہ قرآن پاک

میں جہاں جہاں اہل کتاب کے اچھے لوگوں کا ذکر آیا ہے، وہاں مفسرین ہر جگہ صرف حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام ذکر کرتے ہیں۔ یہ تو اسلام کی ناکامی ہے کہ اس نے یہود میں کوئی مقبولیت حاصل نہیں کی۔ اس خلش کا تفصیلی ذکر میں نے اپنی کتاب 'اہل کتاب صحابہ وتابعین' میں کر دیا ہے۔ اس خلش کو دور کرنے کے لئے میں نے سب سے پہلے اس موضوع پر مطالعہ کرنا شروع کیا۔ سیرت کی کتابوں کے علاوہ رجال وطبقات میں اصابہ، اسد الغابہ، طبقات ابن سعد کے علاوہ تفسیر کی کتابوں کی ورق گردانی شروع کی تو اہل کتاب صحابہ کے کچھ اور نام بھی ملے۔ اس طرح ہمت بڑھی اور اللہ تعالیٰ نے کئی برس کی محنت کے بعد ایک ایسی کتاب مرتب کرادی جو اس سے پہلے کسی زبان میں نہیں لکھی گئی۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ نے اپنے پیش لفظ میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کتاب کے چھپنے کے بعد جب اس کا نسخہ میں نے اپنے استاذ شاہ حلیم عطا صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جن کے درس میں یہ خلش پیدا ہوئی تھی) کو بھیجا تو انھوں نے اپنے جوابی خط میں کچھ مشوروں کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ ''آپ نے یہ غیر مفروغ عنہا (یعنی جو کام اب تک ہوا نہیں) کام کیا ہے، مبارک باد قبول کیجئے۔'' اس درمیان میں اس کے علاوہ فتاویٰ عالم گیری اور اس کے مؤلفین پر کچھ کام کرتا رہا۔ چند نو مسلم اکابر پر بھی مواد جمع کرتا رہا، مگر معارف میں اب تک کوئی چیز شائع نہ ہو سکی تھی۔ اسی اثناء میں ندوہ کے معروف استاذ مولانا شبلی فقیہ رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہو گیا۔ ان پر ایک چھوٹا سا مضمون لکھا، جو معارف کے وفیات کے کالم میں شائع ہوا۔ گویا یہ پہلا مضمون تھا، جو معارف میں شائع ہوا۔ 'اہل کتاب صحابہ وتابعین' نامی کتاب تو ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی، اس سے پہلے عالم گیری اور اس کے مؤلفین' والا مضمون کئی قسطوں میں شائع ہوا۔ یہ مضمون جس وقت، یعنی ۱۹۴۶ء میں، شائع ہو رہا تھا اس وقت سید صاحب بھوپال میں بحیثیت قاضی القضاۃ تشریف لے جا چکے تھے۔ انھوں نے وہاں سے خط لکھا کہ تمہارا مضمون دیکھ کر خوشی ہوئی، اسی طرح تحقیق سے لکھنے کی کوشش کرو۔

واقعات کے ہجوم میں اشہب قلم آگے بڑھ گیا، اس لئے ۱۹۴۵ء کے بے شمار اہم

واقعات چھوٹ گئے، اس لئے ہم اسے پیچھے لوٹا کر ۱۹۴۵ء میں لے چلتے ہیں۔

۱۹۴۵ء میں کئی کام ساتھ چل رہے تھے۔ ایک طرف اہل کتاب صحابہ کا کام آہستہ آہستہ ہو رہا تھا، دوسری طرف تبع تابعین کا کام جاری تھا، پھر درمیان میں ایک موضوع یہ ذہن میں آیا کہ 'ہندوستان کے چند نو مسلم اکابر' پر ایک مضمون لکھا جائے، چنانچہ میں نے دس بیس حضرات کے حالات لکھ ڈالے، خاص طور پر سندھ کے کئی حضرات مثلاً، ابو معشر نجیح اور ان کے ہم عصر کئی علماء کے علاوہ سرمد، سعد اللہ بنی اسرائیل استاذ شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ بھی تھے۔ یہ مضمون سب سے پہلے میں نے مولانا عبدالسلام ندوی کو دکھایا۔ انھوں نے پسند کیا اور اس پر کچھ اصلاح بھی کی، سید صاحب کسی سفر پر گئے ہوئے تھے اور معارف شاہ معین الدین صاحب دیکھ رہے تھے۔ ان کو دیا تو انھوں نے دیکھ کر کاتب کو دے دیا۔ کتابت ہو گئی، پروف بھی پڑھ لیا گیا۔ اب چھپنے کے لئے جا رہا تھا کہ حضرت سید صاحب سفر سے واپس آ گئے۔ انھوں نے شاہ صاحب سے پوچھا کہ اس مہینے کون کون سے مضامین جا رہے ہیں؟ شاہ صاحب نے میرے مضمون کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا: وہ کہاں ہے؟ شاہ صاحب نے پیش کیا تو ایک نظر ڈال کر فرمایا: اسے روک دیجئے۔ جب مجھے علم ہوا تو نوجوانی میں چھپنے چھپانے کا جو شوق ہوتا ہے اس کی وجہ سے تھوڑا سا دھچکا لگا تھا، مگر کچھ دیر بعد حضرت سید صاحب نے مجھے بلا کر فرمایا کہ یہ موضوع بہت وسیع ہے۔ اس پر اور پڑھئے۔ چنانچہ اور لوگوں پر تو نہیں، مگر سرمد پر پڑھنا شروع کیا تو پہلے پورا مضمون ایک قسط میں آ گیا تھا، اب صرف سرمد پر مضمون چار قسطوں میں شائع ہوا۔ بعد میں کچھ مزید اضافوں کے ساتھ یہ کتابی شکل میں شائع ہوا۔ سید صاحب کے اس طرز تربیت نے تحقیق کی نئی راہ دکھلا دی۔

اسی سال راقم الحروف کی شادی کی تاریخ ماہ مئی میں مقرر ہوئی۔ ۴۵ء میں ہر چیز کی گرانی اور کم یابی تھی، خاص طور پر کپڑے کی گرانی اپنی آخری حد کو پہنچی ہوئی تھی۔ یا تو کنٹرول سے معمولی کپڑے ملتے تھے، یا پھر بہت قیمتی کپڑے دستیاب تھے۔ میری شیروانی بنانے کی حیثیت نہیں تھی اور معمولی کپڑے کی شیروانی بنانا نہیں چاہتا تھا۔ کسی ذریعے سے اس کا علم

حضرت سید صاحب کو ہوا۔ انھوں نے اپنے نوکر سے شیروانی کا ایک اچھا کپڑا بھیجا اور اس سے کہا کہ مجیب اللہ سے کہہ دو کہ اس کپڑے کی شیروانی بنوالیں۔ چنانچہ اسی کپڑے کی شیروانی سلوائی۔ حضرت سید صاحب کی اس عزت افزائی کا ان کے سامنے جا کر شکریہ ادا کرنا تو بے ادبی محسوس ہوئی، مگر قلب میں تشکر کے جو جذبات پیدا ہوئے اس کی گرمی آج تک باقی ہے۔

۱۹۴۵ء میں غالبًا اگست کا مہینہ تھا کہ گجرات کے مشہور قصبہ راندیر سے حضرت سید صاحبؒ کے نام مدرسہ اشرفیہ کی طرف سے ایک دعوت نامہ موصول ہوا۔ حضرت سید صاحبؒ نے دعوت قبول کر لی اور ایک ہفتہ بعد سفر کا ارادہ کر لیا۔ سفر سے دو تین دن پہلے مجھ سے فرمایا کہ تم سفر میں میرے ساتھ چل سکتے ہو؟ (حضرت سید صاحب 'تم' سے مخاطب نہیں کرتے تھے، میں نے ادبًا لکھ دیا ہے) میں نے کہا: حضرت! آپ جیسا فرمائیں۔ انھوں نے کہا کہ انشاء اللہ نئے نئے لوگ اور نئی نئی چیزیں دیکھنے کو ملیں گی۔ میں نے اپنی سعادت سمجھی کہ ایک خادم کی حیثیت سے سید صاحب کے ساتھ چلنے کا موقع مل رہا ہے۔ چنانچہ تاریخ مقررہ پر ہم لوگ لکھنؤ کے لئے روانہ ہوئے۔ اس وقت گجرات جانے کے لئے بمبئی ہو کر جانا پڑتا تھا اور گاڑی لکھنؤ سے ملتی تھی۔ لکھنؤ پہنچ کر ندوہ میں قیام ہوا اور وہیں سے بمبئی کا ٹکٹ ہمارے مہتمم مولانا عمران خان مرحوم نے بنوایا۔ حضرت سید صاحب کا ٹکٹ انھوں نے سکنڈ کلاس کا بنوایا اور میرا انٹڈنس کا بنوایا۔ سکنڈ اور فرسٹ کلاس کے ساتھ ایک چھوٹا سا ڈبہ انٹڈنس کے نام سے نوکروں وغیرہ کے لئے لگتا تھا، جس کا کرایہ بہت کم ہوتا تھا۔ حضرت سید صاحب نے پوچھا کہ مجیب اللہ کہاں ہیں؟ خان صاحب نے بتایا کہ وہ پیچھے ڈبہ میں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ ان کا ٹکٹ بھی سکنڈ کلاس کا بنوایئے، وہ میرے ساتھ رہیں گے۔ چنانچہ مہتمم صاحب نے فورًا ٹکٹ تبدیل کرا کے مجھے حضرت سید صاحب کے قریب سیٹ پر بٹھایا۔ دو ایک اسٹاپ گزرنے کے بعد ایک بزرگ صورت مسلمان ڈبے میں داخل ہوئے اور میرے ہی قریب بیٹھے۔ کچھ دیر بعد مجھ سے سید صاحب کے بارے میں پوچھا کہ یہ کون صاحب آگے بیٹھے ہیں۔ میں نے ادبًا بڑے آداب

والقاب کے ساتھ ان سے حضرت سید صاحب کا نام لیا۔ وہ جا کر پھر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ وہ چار اسٹاپ کے بعد وہ اتر گئے۔ جب وہ اتر گئے تو حضرت سید صاحب نے مجھے بلا کر فرمایا کہ دیکھو سفر کے درمیان کوئی پوچھے تو معمولی انداز میں کہہ دو کہ فلاں صاحب ہیں، سفر میں ہر طرح کے اچھے برے لوگ ہوتے ہیں۔ بڑے تجربہ کی بات حضرت سید صاحب نے فرمائی تھی۔ واقعی سفر میں، خاص طور پر اس زمانہ میں، اپنے کو نمایاں کرنے میں بہت سے ناگوار واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔

۲۵-۲۶ گھنٹے کے بعد ہم لوگ بمبئی پہنچے، وہاں صوفی عبدالرحمٰن صاحب گجراتی کے یہاں قیام رہا۔ وہاں سے دوسرے دن ہم لوگ گجرات کے لئے روانہ ہوئے، چند گھنٹے بعد وہاں پہنچ گئے۔ راندیر سے کئی حضرات سورت اسٹیشن پر آ گئے تھے۔ اسٹیشن سے ہم لوگ پہلے سورت میں حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب مرحوم کی قیام گاہ پر گئے، پھر وہاں سے راندیر گئے۔ وہاں جن صاحب کے مکان پر ٹھہرے ان کا نام تو یاد نہیں ہے، مگر نہایت اچھا اور کشادہ مکان تھا، ہر طرح کی سہولت تھی۔ بڑی مسجد میں مولانا مفتی عبدالرحیم صاحبؒ امام تھے، وہ قریب ہی تھی، حضرت سید صاحب کو ہال کمرہ میں ٹھہرایا گیا اور ان کے لئے عمدہ پلنگ پر بستر لگایا گیا۔ مجھے ایک دوسرے چھوٹے کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ ہال کمرہ میں حضرت سید صاحب کی پلنگ سے کچھ فاصلہ پر ایک جھولا تھا۔ مجھ سے میزبان نے کہا کہ رات کو آپ اسی میں سوئیں گے۔

عشاء کی نماز کے لئے جب ہم لوگ مسجد گئے تو دیکھا کہ پوری مسجد میں بہترین قسم کے قالین بچھے ہوئے ہیں۔ میں نے سمجھا کہ شاید مہمانوں کے اعزاز میں بچھائے گئے ہیں، مگر معلوم ہوا کہ یہ روزانہ بچھے رہتے ہیں۔ یوپی وغیرہ میں اس کا تصور بھی نہیں تھا۔

سید صاحب کی آمد سن کر مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ بھی راندیر آ گئے اور تقریبًا ایک ہفتہ راندیر اور سورت میں ساتھ رہے۔ میں اس وقت تبع تابعین میں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے حالات لکھ رہا تھا۔ امام محمد کی کتاب الآثار دار المصنفین کے کتب خانہ میں

موجود تھی، جس میں ان کے پندرہ شیوخ کا ذکر تھا، مگر ان کی کتاب الحجہ یہاں موجود نہیں تھی، وہاں مولانا مفتی مہدی حسن صاحبؒ کے کتب خانہ میں موجود تھی۔ اس میں ان کے ایک سو پانچ شیوخ کا نام تھا۔ میں اس سے ان کے شیوخ کے ناموں کو جب موقع ملتا نقل کرنے لگتا۔ مولانا یوسف صاحب بنوریؒ میرے انہاک کو دیکھ کر امتحاناً دارالمصنفین کے کتب خانہ کے بارے میں سوال کرنے لگے کہ وہاں فلاں فلاں کتابیں موجود ہیں؟ میں ہاں یا نہیں میں ان کا جواب دیتا رہا۔ اسی درمیان میں انھوں نے پوچھا کہ بیضاوی کا متن آپ کے یہاں ہے،؟ میں اس مزاح سے واقف نہیں تھا، اس لئے کچھ سوچنے لگا۔ میری خاموشی دیکھ کر حضرت سید صاحب نے فرمایا کہ یہ تو ان کے سینے میں ہے، یعنی میرے حافظ ہونے کی طرف اشارہ فرمایا، اس وقت میں اس مزاح کو سمجھا۔ انھوں نے مقدمہ ابن خلدون اور المخصص لابن سیدہ کے بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا کہ مقدمہ ابن خلدون کا کچھ حصہ ہم لوگوں کے درس میں تھا اور المخصص کو میں نے دیکھا ہے، لغت کی کتاب ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ مولانا نے ابن خلدون کو لام پر تشدید کے ساتھ ادا کیا اور ابن سیدہ کو ی پر تشدید کے ساتھ۔ میں نے عرض کیا کہ مولانا! خلدون میں ''لام'' ساکن ہے اور ابن سیدہ میں بھی ''ی'' ساکن ہے۔ انھوں نے سید صاحب کی طرف رجوع کیا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ مولانا! انھوں نے ارتجالاً آپ سے آپ کے مزاح کا بدلہ لے لیا۔

حاشیہ

(۱) یہ حصہ مولانا کی آپ بیتی سے لیا گیا ہے، مولانا کی پوری آپ بیتی حضرت سید صاحب کے ذکر خیر سے معمور ہے صرف ایک حصہ منتخب کیا گیا ہے۔

فخرِ عصر سید سلیمان ندویؒ

ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدر آبادیؒ

سید سلیمان ندویؒ اعلیٰ اللہ مقامہ اپنے خطوط میں دستخط صرف ''سید سلیمان'' کرتے تھے مگر دنیا ان کو ''ندوی'' کی نسبت ہی سے پہچانتی ہے۔ درسگاہ ندوہ کو اپنے ہاں کے اس طالب علم پر فخر ہونا چاہئے (جیسا کہ ہمالیہ تلے کے سارے براعظم کو ہے) نہ کہ ان کو ندوہ پر' استغفر اللہ' ندوہ کی توہین منظور نہیں ہے۔

للناس فیما یعشقون مذاھب

اگر وہ ۱۴۰۱ھ تک بقید حیات رہتے تو میں ان کو پندرہویں صدی ہجری کا مجدد خیال کرتا کہ علوم اسلامی کی انھوں نے بے پایاں خدمت کی اور ان کو ایک نئے راستے پر لگایا ہے۔ ابن ہشام کی ''سیرت رسول اللہ'' کی بھی ضرورت رہے گی اور سید صاحب مرحوم کی سیرت النبی کی بھی۔ یہ نہیں کہ آخر الذکر کو تحصیل حاصل قرار دیا جائے۔

وہ نادر روزگار عالم تھے۔ ان کی کتاب ''عائشہ صدیقہؓ'' میں آج بھی شاید ہی کچھ اضافہ ہوسکتا ہو۔ وہ ان کے زمانۂ طالب علمی کی تالیف ہے۔

ایک مشاہدہ بار بار ذہن میں تازہ ہوتا رہتا ہے، عرض کردیتا ہوں۔ بعض استاذ وشاگرد لازم وملزوم ہوجاتے ہیں یعنی استاد ذہین تر ہوتا اور رہنمائی کرتا ہے، شاگرد عالم تر ہوتا اور استاد سے زیادہ کارگزاری کرتا ہے۔ ابن تیمیہ اور ابن القیم ہوں، محمد عبدہ اور رشید رضا ہوں یا شبلیؒ اور سید سلیمان ندوی۔ واللہ اعلم۔

مجھے سید صاحب مرحوم سے نادیدہ محبت تھی، یعنی ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ سنا ہے کہ انہیں بھی مجھ سے محبت تھی یعنی شفقت اور ذرہ نوازی، میں نے نوعمری ہی سے ان سے طالب علمانہ خط و کتابت شروع کی تھی اور وہ ہمیشہ اور فوراً جواب سے نوازتے تھے، ''سنا ہے'' کا لفظ اس لئے استعمال کرتا ہوں کہ مجھے اس کا علم نہ ہوتا اگر حال میں مولانا ابوعلی عبدالباری یہ بیان نہ فرماتے۔ وہ ساٹھ باسٹھ سال سے دارالمصنفین اعظم گڑھ سے وابستہ ہیں اور رسالہ معارف سے خاص کر تعلق رکھا ہے۔ وہ شعبان ۱۴۰۳ھ (مئی ۱۹۸۳ء) کے ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ میں لکھتے ہیں کہ، رسالہ معارف میں کوئی مضمون امیدوار بن کر حاضر ہوتا تو بطور ایڈیٹر سید صاحب مرحوم اس میں ضرور ترمیم اور اصلاح کرتے۔ صرف دو آدمیوں کے مضمون اس سے مستثنیٰ تھے۔ ایک مرحوم مسعود عالم ندوی اور دوسرا یہ ناکارہ جاہل جس کا جب کوئی مضمون ''معارف'' میں چھپنے کے لئے آتا تھا تو سید صاحب باغ باغ ہوجاتے تھے اور فوراً کتابت کے لئے کاتب کے حوالے کر دیتے تھے ذرا بھی تاخیر گوارہ نہ کرتے تھے۔

سید صاحب مرحوم سے ان ''روابط'' کے باوجود ملاقات کم ہی رہی، وہ شمالی ہند میں تھے اور میں دکن میں۔ غالباً پہلی بار ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ جامعہ عثمانیہ کی دعوت پر وہاں لیکچر دینے آئے تھے اور میں وہاں کالج میں طالب علم تھا۔ غالباً دوسری اور آخری بار دو ایک ملاقاتیں اس وقت ہوئیں جب وہ مستقل قیام کے لئے کراچی تشریف لے آئے اور وہ مجلس تعلیمات اسلامی کے سلسلے میں میرے قیام کا بالکل آخری زمانہ تھا۔ ان ملاقاتوں کی کچھ یاد ابھی ذہن میں ہے۔

جامعہ عثمانیہ میں (جہاں اس وقت اساتذہ میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم اور مولانا عبدالباری مرحوم تھے) لیکچر سے وہ کچھ پہلے آ گئے تھے۔ مجھے اطلاع ملی سب کام چھوڑ کر بھاگا بھاگا ان سے ملنے گیا کہ سالہا سال کی ایک علمی خلش ان سے دور کرانے کی توقع تھی۔ وہ اساتذہ میں گھرے ہوئے تھے، جوں توں کر کے قریب پہنچا اور پوچھا، مولانا غزوۂ بنی النضیر کے متعلق کہتے ہیں کہ حضرت عمرو بن امیہ ضمریؓ کے ایک قتل خطا پر خوں بہا

کی ادائی میں مالی شرکت کا مطالبہ کرنے کے لئے رسول اکرم ﷺ ان یہودیوں کے یہاں گئے اور انہوں نے حضور ﷺ کے قتل کی کوشش کی۔ قصور تو ایک مسلمان کا تھا۔ یہودیوں پر کیوں ذمہ داری سمجھی جائے؟ سوال اچانک تھا۔ فوراً جواب دیا کہ ''نہیں جی، ان پر ذمہ داری تھی'' پھر دوسروں سے گفتگو میں منہمک ہوگئے اور مجھے کریدنے کا موقع نہ ملا، تھوڑی دیر بعد ان کا لکچر شروع ہوا اور اوروں کی طرح میں بھی ذوق وشوق سے سننے گیا، بلکہ کوشش کر کے اولین صفوف میں جگہ پاسکا۔ وہ بولتے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے، اور لکھتے تو قلم سے عطر بہتا، تقریر میں ایک موقع پر فرمایا کہ انگریزی لفظ JAR عربی لفظ ''جرّہ'' سے ماخوذ ہے۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور کہا: ''مولانا، وہ تو اُردو لفظ ''گھڑا'' سے لیا گیا ہے۔ فوراً فرمایا ''ممکن ہے اسی سے گھڑا ہو'' اس لفظی کھیل پر سارے جلسے نے عش عش کیا ہو تو تعجب نہ ہو۔

بنی النضیر کے یہودیوں کے مسئلے سے بیسوں سال مجھے خلش رہی اور نہ گفتگو سے اور نہ پڑھنے سے کوئی تشفی ہوسکی۔ آخر الحمدللہ اس کا جواب مل گیا اور وہ میں نے مصنَف عبدالرزاق اور سمہودی کی تاریخ مدینہ کے حوالے سے (جس میں اب سیرت شامی کا بھی اضافہ کرسکتا ہوں) اعظم گڑھ کے ماہنامہ الرشاد بابت جنوری وفروری ۱۹۸۲ء میں ''غزوۂ نبی النضیر کا اصل باعث'' کے عنوان سے چھپوا بھی دیا ہے۔ حضور اکرم خوں بہا کے لئے ان کے ہاں نہیں گئے تھے۔ قریش مکہ کے اکسانے پر انہوں نے حضور کے قتل کی سازش کی اور کہلا بھیجا: ہم سب مسلمان ہونے کے لئے تیار ہیں، آپ تین صحابیوں کے ساتھ آیئے اور ہمارے بھی تین چار عالموں سے علمی بحث کیجئے وہ قائل ہوجائیں تو ہم بھی سب مسلمان ہو جائیں گے۔ کون سا نبی ہوگا جو اس بہانے پر جال میں نہ آجائے......

آخری (دوسری؟) مرتبہ ملاقات کراچی میں ہوئی۔ ایک ملاقات میں فرمایا: تم سیرت پر ایک نئی کتاب لکھو، میں نے کہا، کیا ''رحمت عالم'' اور ''سیرۃ النبی'' کے بعد بھی ضرورت ہے؟ فرمانے لگے: ان کا نہج الگ ہے۔ ہم تمہیں بتائیں گے، اس طرح کی سیرت کی ضرورت ہے۔ مجھے ہمت نہ پڑی کہ ہامی بھر سکتا۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ میں یہ پوچھ

نہ سکا کہ ان کا منشا کس نہج کی سیرت نبویہ کا ہے۔ جب میں کراچی سے پیرس واپس ہونے لگا تو الوداعی ملاقات کے لئے بھی ایک دن سویرے ان کے مکان پر حاضر ہوا، بے حد اصرار سے ناشتے کی مہمان نوازی میں شرکت کرائی۔ رخصت کے وقت فرمانے لگے: کیوں جاتے ہو؟ یہیں رہ جاؤ۔ میں نے کہا: کس کام کے لئے؟ فرمایا علمی نشریات کے کام میں مجھے مدد دینے کے لئے۔ عرض کیا انتظامی یا مالی کام میں حصہ لینا تو ممکن نہیں، باقی علمی کام، اس کے لئے قیام ضروری نہیں، خط وکتابت سے کام ہوسکتا ہے اور پاریس کے عظیم کتب خانوں سے اس بارے میں جو مدد مل سکے گی، وہ کراچی میں رہنے پر ممکن نہیں۔ چپ ہوگئے۔

سید صاحب مرحوم کی بڑائی اور بزرگی کا جو معیار میں نے دیکھا وہ یہ تھا کہ ان میں مجرمانہ عزت نفس بالکل نہ تھا (جو بدقسمتی سے بہتوں میں پایا جاتا ہے) کوئی ان پر اعتراض بھی کرتا تو بالکل برا نہ مانتے۔ ٹھنڈے دل سے غور کرتے اور میٹھے انداز سے جواب دیتے۔ ان کی مشہور زمانہ تالیف ''عربوں کی جہاز رانی'' ہے۔ جب وہ شائع ہوئی تو میری نوجوانی کا زمانہ تھا۔ ''عربوں کی جہاز رانی'' پر ایک طویل ''تنقید'' لکھ کر رسالہ معارف ہی کو بھیج دی۔ وہاں مولانا نے اس کو عنوان دیا ''عربوں کی جہاز رانی ...... ایک استدراک'' اور مئی وجون ۱۹۳۵ء کے دو شماروں میں چھاپا (پھر تیسری قسط فروری ۱۹۴۵ء میں دس سال بعد بھیجی اور چھپی) ۱۹۳۵ء میں اپنی گذارش بھیجی تو ایک بڑا با محبت خط مجھے لکھا (جو ممکن ہے میرے کاغذات میں حیدرآباد دکن میں اب بھی موجود ہو) اس میں کم وبیش یہ الفاظ تھے: ''تم نے ہماری داد نہ دی کہ بحر عرب میں کاغذی کشتی چلا دی''؟ ظاہر ہے کہ میں شرم سے پانی پانی ہوگیا اور جواب گزرانا کہ حاشا وکلاّ میں نے غلطیاں نہیں پائی ہیں بلکہ میرے مطالعہ میں کچھ نئی باتیں آئی تو چاہا کہ ان کو پیش کردوں تا کہ اس اچھوتے موضوع پر بتدریج معلومات جمع ہوتی جائیں (اب حال میں جامعہ عثمانیہ کے ابوالنصر خالدی صاحب نے بھی اس پر اردو میں ایک کتاب شائع کی ہے)۔

محقق وتنقید نگار

مولانا ڈاکٹر سید ابراہیم استھانوی ندویؒ

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی جامعیت اور ان کے علوم وفنون کا تنوع ہے۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب نے سید صاحبؒ کے بارے میں بالکل درست فرمایا کہ ''میں نے ہندوستان اور بیرون ہند کی سیاحت اور ممالک اسلامیہ سے قریبی واقفیت کے سلسلے میں مولانا سید سلیمان ندوی جیسا جامع فنون اور متنوع الذوق نہیں دیکھا۔'' (۱)

حقیقت یہ ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی علم وفن کے اعتبار سے اس دور کے جاحظ تھے، اور اگر علم کے ساتھ عمل کو بھی مربوط کردیا جائے تو وہ جاحظ سے بھی بڑھ جاتے ہیں، وہ بے مثال سیرت نگار، عظیم الشان مؤرخ، غیر معمولی عالم، فقیہ اور مفسر، لسانیات اور عمرانیات کے ماہر اور اردو ادب کے عظیم نقاد، محقق اور انشاء پرداز تھے۔ ان کی تمام تصانیف میں قدر مشترک کے طور پر بے مثال تحقیق اور بلند پایہ تنقید نگاری کا وصف جلوہ گر ہے، خواہ وہ طویل تصنیف ہو یا مختصر خطبہ ہو یا مقالہ ہر جگہ تحقیق کی روح کارفرما ہے، بلا شبہ وہ اپنے دور کے سب سے بڑے محقق تھے۔

اس مقالہ میں سب سے پہلے سید صاحبؒ کے ان علمی اور تحقیقی خدمات کا تذکرہ ہوگا، جو انہوں نے اردو زبان میں انجام دیں، حقیقتاً سید صاحبؒ نے اردو زبان کی ترقی میں بہت اہم رول ادا کیا ہے، اور جو تحقیقی اثاثہ چھوڑا ہے، اس کا معیار بہت بلند ہے۔

آج ہندوستان میں سینکڑوں اکیڈمیاں قائم ہیں لیکن ان کے مقاصد محدود ہیں، سید صاحبؒ بذات خود ایک اکیڈمی تھے، بلکہ یہ کہا جائے تو درست ہوگا کہ ان کی وجہ سے ہندوستان میں بہت سی اکیڈمیاں اور عالمی ادبی انجمنیں آباد تھیں، انہوں نے اردو ادب کے دامن کو علم و ادب کے بیش بہا خزانوں سے مالا مال کر کے اردو ادب میں لافانی مقام حاصل کیا۔ اردو زبان کے ارتقاء میں سید صاحبؒ کی تحقیقی خدمات کا جائزہ لینے کے لئے ''نقوش سلیمانی'' کا مطالعہ کرنا بہت ضروری ہے، اردو زبان کے ارتقاء کے بارے میں تحقیقی مواد فراہم کرتے ہوئے جس نظریہ کو پیش کیا ہے وہ ہوسکتا ہے کہ سب کے لئے قابل قبول نہ ہو، لیکن سب ہی اس کی اہمیت کے معترف ہیں۔

''نقوش سلیمانی'' میں اردو زبان کی تاریخ پر متعدد مضامین ملتے ہیں، اردو زبان کس طرح وجود میں آئی اس کے بارے میں سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ''سولہویں صدی میں اہل یورپ کا یہاں کے سواحل پر گذر ہوا۔ جن میں سے پیشرو پرتگالی اور ان کے بعد فرنچ اور سب سے آخر میں انگریز تھے، ایک ایسا ملک جو مختلف نسلوں مختلف قوموں، زبانوں کا مجموعہ تھا ناگزیر ہے کہ وہاں اچھی میل جول کے بعد ایک زبان پیدا ہو، وہ پیدا ہوئی اور اسی کا نام اردو ہے۔'' (۲)

دلائل کی روشنی میں سید صاحبؒ نے یہ ثابت کیا کہ یہ زبان کسی خاص مذہب کے ماننے والوں کی نہیں ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ اردو زبان تنہا کسی قوم کی زبان نہیں ہے، اس میں ہندی، اسلامی، یورپین تمام زبانوں کا ذخیرہ ہے، اور اس لئے اس کی ملکیت کا تمام باشندگان ہند بجا طور سے دعویٰ کر سکتے ہیں اور اس کو مسلمانوں کے ساتھ کوئی خاص خصوصیت نہیں، بلکہ وہ ہندوستان کی مشترک زبان ہے۔ سید صاحبؒ کے سامنے ہندوستان کے مستقبل کا نقشہ تھا، اور وہ اپنی متاع عزیز یعنی اردو کی حوادث ایام سے حفاظت کرنا چاہتے تھے، غالبًا یہی جذبہ سید صاحبؒ کی تحریر میں کارفرما تھا، اور اسی جذبہ کے تحت انہوں نے مقالہ میں تحریر فرمایا ہے کہ: ''میں

اسی بناء پر ہندوستان کی مشترک زبان کو اردو کہنا اصلاح کی غلطی سمجھتا ہوں، اردو کے ابتدائی مصنفین نے اس کو ہمیشہ ''ہندی'' کہا ہے، اور انگریزوں کی زبان میں اس کا نام اب تک ''ہندوستانی'' ہے۔'' (۳)

ان کے مخاطب صرف مسلمان نہ تھے، بلکہ وہ ہندوستان کے ایک عظیم انسان کی شکل میں پوری قوم کو دعوت فکر و نظر دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اس زمانے میں جب کہ ہر ملک میں یہ آواز بلند ہے کہ ملک کی باگ اہل ملک کے ہاتھوں میں دے دی جائے، یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ ایران میں ایرانی اور مصر میں مصری اور عراق میں عراقی کی طرح ''ہندوستان میں ہندوستانی'' سے میری مراد ''ہندوستانی باشندے'' نہیں، ''ہندوستانی بھاشا'' ہے، اور میری تقریر کا مقصود سیاسی سوراج نہیں، بلکہ زبانی سوراج ہے۔'' (۴) متحدہ قوم کے لئے متحدہ زبان کی اہمیت پر سید صاحبؒ نے جس انداز میں روشنی ڈالی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ میرے خیال میں ہندوستان کے کسی لیڈر نے اتنے واضح انداز میں اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا، لیکن اہل ملک نے ان کے مشورہ پر کہاں تک عمل کیا یہ اب کوئی بھی مخفی بات نہیں۔

> اردو اور ہندی کے درمیان جو اختلافات رونما ہوئے ان کا تجزیہ کرتے ہوئے علامہ موصوف کے ذہن رسا نے حقیقی دشمن کی نقاب کشائی کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ ''انگریزوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ اگر ہندوستان پر حکومت کرنا ہے تو اس متحدہ قومیت کے درخت پر جو صدیوں کی خونریزی سے سینچ کر تیموریوں کی باغبانی سے تیار ہوا تھا، پہلے کلہاڑی مارنا ضروری ہے، اس کے لئے ضرورت تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے امتیازات کے حدود کو جس قدر ممکن ہو ابھارا جائے، چنانچہ فورٹ ولیم میں اردو اور ہندی کے نام سے دو شعبے قائم ہوئے، ایک مسلمانوں کے سر پر تھوپا اور دوسرے کو ہندوؤں کے سر مڑھا، اور اس کا نام علمی قدر دانی اور ادب نوازی رکھا۔'' (۵)

اسی سلسلے میں وہ قوم کو متنبہ کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں زبان کا انقلاب ہو کر رہے گا، جس قدر ہندوستان زیادہ متحد ہوتا جائے گا اس کی متحدہ زبان کا امکان بڑھتا جائے گا، جو لوگ ہندوستان میں دو زبانیں پیدا کرنا چاہتے ہیں، ان کو ہوشیار رہنا چاہئے کہ وہ اس موجودہ ہمالیہ سے بڑھ کر ایک اور ہمالیہ بنا رہے ہیں، ہندوستان کو دو متفرق زبانوں میں تقسیم کرنے سے دونوں قوموں کے درمیان ایک ہمالیہ کھڑا ہو جائے گا، جو قیامت تک ٹوٹ نہ سکے گا۔''(٦)

سید صاحب کے ان خیالات سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ وہ ہندوستان کے لئے ایک قومی زبان کے قائل تھے، اور وہ چاہتے تھے کہ تمام ہندوستان میں ہندوستانی زبان کی ترویج و اشاعت ہوتا کہ اس کی وجہ سے عوام میں اتحاد پیدا ہو۔ ہندوستان کے موجودہ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے سید صاحبؒ کی یہ تجویز ہندوستان کے اتحاد کے لئے بے انتہا اہم اور مفید تھی، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کے سارے عوام سے محبت رکھتے ہیں، اور متحدہ ہندوستان کا تابناک نقشہ ان کے سامنے تھا۔

سید صاحبؒ کے ان تحقیقات عالیہ سے حکومت ہند کو فائدہ اٹھانا چاہئے تھا، ان سے متحدہ قومیت کی تحریک کو تقویت علمی اور اس کے تمام لسانی مسائل حل سے حل ہو سکتے تھے، اس لئے کہ سرزمین ہند پر بہت سے مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں، ان کے درمیان اتحاد ایک زبان کے ذریعہ ہی ہو سکتا تھا، سید صاحب کے اردو زبان پر اس تحقیقی مقالہ سے نہ صرف مسلمان بلکہ پورا ہندوستان مستفید ہو سکتا ہے۔

''نقوش سلیمانی'' میں اردو زبان کے علاوہ دیگر مضامین بھی ملتے ہیں، جن میں اکبر کا ظریفانہ کلام، ہاشم علی کا مجموعہ مراثی اور ان کے علاوہ مکاتیب شبلیؒ، گلستان امجد، کلام شاد کے مقدمات قابل ذکر ہیں، ان تمام مضامین میں تحقیق کا عنصر کارفرما ہے، اور تنقیدی اصول کے مطابق کلام کا تجزیہ ہر جگہ نمایاں ہے، ڈیسن کے قول کے مطابق ناقد کے لئے

ضروری ہے کہ وہ محاسن کی تحقیق کرے، نہ کہ معائب کی۔ اور اس کے بنیادی فرائض میں سے یہ ہے کہ وہ حسن و جمال کی جستجو کرے جو ادیب میں مخفی ہے۔ میتھو ارنلڈ کے اصول کے مطابق ناقد کو چاہئے کہ وہ اشیاء کا مطالعہ اس طرح کرے جیسا کہ وہ حقیقت میں ہیں، اس لئے کہ انسان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اعلیٰ مثال کی منزل کو حاصل کرے، اور خطا و نسیان سے بالکل محفوظ رہے، لیکن ناقد کے لئے ضروری ہے کہ اس کا ذہن اخاذ ہو، اس کا دل وسیع ہو اور اس کی نگاہ تیز ہو تا کہ وہ بنیادی باتوں کا صحیح تجزیہ کرے اور تحفظ ذہنی سے کام نہ لے، بلکہ وہ اپنی تنقید میں آزاد ہو۔

مغربی ناقدوں نے تنقید کے جو اصول بیان کئے ہیں ان کا ماحصل یہ ہے کہ بنیادی تنقید کا اہم پہلو یہ ہے کہ وہ الہامی ہو، اور ادیب یا شاعر کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی ہمت افزائی کی جائے، اور ان کے لئے ترقی کی راہ ہموار کی جائے، بڑا یا عظیم تنقید نگار وہی ہے جو ادب کے مفہوم کو سمجھنے میں ہماری مدد کرے، اور حقیقی ناقد وہی ہے جو تنقید کرنے سے پہلے شاعر کے کلام یا ادیب کے مقالے کا بہ نظر غائر مطالعہ کرے اور ان کی تصانیف میں جو قوت جمال اور ادبی ثروت پنہاں ہے، اس کو ہمارے سامنے اس طرح پیش کرے کہ ہم اس سے صحیح طور پر محظوظ ہو سکیں۔

سید صاحبؒ کے علمی اور تنقیدی مضامین پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک مشرقی محقق ہوتے ہوئے بھی مغربی تنقید کی روح سے واقف تھے، انہوں نے اپنی تنقیدوں کے ذریعہ بہت سے ادباء اور شعراء کو روشناس کرایا جو گمنامی میں تھے۔ نقوش سلیمانی کے علاوہ ''معارف'' میں بہت سے ادباء، علماء اور شعراء کی تالیفات اور دواوین کا تعارف کرا کے ان کو علمی حلقوں میں شہرت عطا کی، ''باب الانتقاد'' میں سینکڑوں کتابوں پر عالمانہ تبصرے کئے۔ اس طرح سید صاحب نے تنقید نگاری میں بھی ایک عظیم سرمایہ چھوڑا ہے جو ان کو اپنے دور کا ایک اعلیٰ ناقد بنانے کے لئے کافی ہے۔

ان مضامین کے علاوہ نقوش سلیمانی میں اردو، عربی الفاظ کی ایسی تحقیقی و تنقیدی

بحث ملتی ہے، جن سے ان الفاظ کے صحیح تلفظ کا علم ہوتا ہے جس سے سید صاحبؒ کی تحقیقی صلاحیت ظاہر ہوتی ہے، بلاشبہ یہ مضامین علم لسانیات میں قابل قدر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں، ایک ایک لفظ کی تحقیق کے لئے علامہ موصوف نے نہ معلوم کتنی کتابوں کا مطالعہ کیا اور کس طرح ان کا ذہن صحیح الفاظ تک پہونچا حالانکہ یہ الفاظ اپنی اصلی شکل سے بالکل دور ہو چکے تھے اور امتداد زمانہ کی وجہ سے ان الفاظ کی ظاہری صورت بدل چکی تھی۔ سید صاحبؒ نے اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے ان الفاظ کا تقابلی مطالعہ کیا، سید صاحبؒ کے یہ محققانہ مضامین ان کے تحقیقی مزاج کے آئینہ دار ہیں، نقوش سلیمانی کے آخری صفحہ کو ملاحظہ کیجئے، جس میں سید صاحبؒ نے ''استدارک'' کے عنوان سے بعض الفاظ کی تحقیق سے مراجعت کرلی۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے جو اپنے دور کے غیر معمولی ماہر لسانیات تھے، ان کی تحقیق پر اپنے خیال میں تبدیلی پیدا کرلی۔ یہ نقش ''نقوش سلیمانی'' کا سب سے اعلیٰ اور ارفع نقش ہے، کیونکہ معمولی تحقیق کرنے والے بھی بہت کم اپنی رائے میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں۔ تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے یہ ایک قابل تقلید مثال ہے کہ اگر کوئی صحیح بات اپنی تحقیق کے خلاف ثابت ہوجائے تو حق کے جویا عالم ومحقق کو مراجعت الی الحق کرلینا چاہئے، اور اس کو اپنے وقار کا مسئلہ Prestige Issue نہیں بنانا چاہئے۔

سید صاحبؒ کی دوسری تحقیقی کتاب ''عرب وہند کے تعلقات'' ہے، اس جلیل القدر تصنیف کے بارے میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی جو خود بھی مشہور عالم اور انشاء پرداز تھے، اپنے خیالات کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں: ''ضرورت تھی کہ گہری نگاہیں گوہر مقصود کا پتہ لگائیں، خس وخاشاک کو دور کرکے اصلیت کی تہہ تک پہنچیں اور آج جب کہ دل ملانے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، دکھائیں کہ کبھی اس سرزمین پر محبت وہمدردی کا ابر رحمت بھی برساتھا، اس کے لئے تصنع کی حاجت نہ تھی، واقعات کو بگاڑنے اور بنانے کی ضرورت نہ تھی، صرف چہرۂ حقیقت کو بے نقاب کردینا کافی تھا، مگر شاہد مقصود تک باریابی ہر ایک کی قسمت میں نہیں آئی ہے، کارکنان قضا وقدر نے یہ فتحیابی ''سلیمان

وقت'' کے لئے محفوظ ومخصوص فرمادی تھی۔''(۷)

سید صاحبؒ نے اس کتاب میں اپنی تحقیق کے جوہر دکھائے ہیں، ایک طرف اسلامی مؤرخین مسعودی، سلیمانی تاجر، ابن حوقل، ابن بطوطہ، یاقوت، رومی، قفطی، ابن اثیر، ابن خلدون اور البیرونی کی کتابوں سے استفادہ کیا اور ان کے بہت سے نظریے اور خیالات کی تصحیح بھی کی تو دوسری طرف مغربی مؤرخین کے افکار وخیالات کا مطالعہ اور ان کے اقوال پر ناقدانہ نظر ڈالی۔ سید صاحبؒ کا یہ اصول تھا کہ اگر کوئی بات ان کے تحقیقی معیار پر پوری اترتی تھی تو وہ بلا تامل اخذ کرلیتے تھے، ورنہ وہ دلائل کی روشنی میں مؤرخ کی غلطی کو پیش کرتے تھے، خواہ وہ مؤرخ قدیم ہو یا جدید، مشرقی ہو یا مغربی، وہ بغیر کسی جھجک کے ان پر تنقید کرتے تھے، ہندوستان کے ایک مشہور مؤرخ مولانا آزاد بلگرامی کے مبالغہ آمیز بیانات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میر آزاد بلگرامی نے ''سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان'' میں کئی صفحے ہندوستان کے ان فضائل کے بیان کے نذر کئے، اور اس میں یہاں تک کہا ہے کہ جب آدمؑ سب سے پہلے ہندوستان اترے، اور یہاں ان پر وحی آئی، تو یہ سمجھنا چاہئے کہ یہی وہ ملک ہے جہاں خدا کی پہلی وحی نازل ہوئی، اور چونکہ نور محمدؐ حضرت آدمؑ کی پیشانی میں امانت تھا، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور اسی سرزمین میں ہوا۔''

حضرت علامہ موصوف اپنے مخصوص انداز میں فرماتے ہیں کہ یہ تمام روایتیں فن حدیث کے لحاظ سے بہت کم درجہ پر ہیں، یعنی یہ باتیں قابل اعتبار نہیں ہیں، بلکہ ان کو افسانہ سمجھنا چاہئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی صاحب نے سید صاحبؒ کے تحقیقی کارنامہ کا اس طرح تذکرہ کیا ہے:

> ''سلیمان زماں نے دیو وپری کی داستانوں کا سنانا عار سمجھا اور نکتہ سنج حقیقت نگار مصنفین اور سیاحوں کا اپنا رفیق طریق بنایا جن کی فکر ونظر اسلامی وسعت اور

صدق پسندی تھی۔''

ان مؤرخین میں سب سے زیادہ سید صاحبؒ البیرونی سے متأثر ہوئے، البیرونی کے بارے میں مشرقی ومغربی مؤرخوں نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، لیکن علامہ سید سلیمان ندوی نے البیرونی کو جو خراج عقیدت پیش کیا ہے، اس کا کچھ اور ہی انداز ہے، وہ لکھتے ہیں: ''بہر حال البیرونی ہندوستان میں اس وقت داخل ہوا، جب ہندوستان کی سرزمین سلطان محمود غزنوی کے حملوں سے زیروزبر ہو رہی تھی، مگر عین اسی وقت علم وفن کا دوسرا سلطان تن تنہا نہایت اطمینان اور چین سے ہندوستان کی علمی فتوحات میں مصروف تھا، اور اس سیاسی لڑائی اور خلفشار پر دل ہی دل میں جل رہا تھا۔'' سید صاحبؒ کے کہنے کا مطلب یہ تھا ہے کہ عین اس وقت جب سلطان محمود غزنوی ہندوستان کی دولت لوٹ رہا تھا، ایک دوسرا سلطان العلوم ہندوستان میں علم کی دولت لٹا رہا تھا۔

عرب وہند کے تعلقات پر نہ صرف اردو میں بلکہ دنیا کہ کسی زبان میں اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی، سید صاحبؒ پہلے مصنف تھے جنہوں نے اس اہم موضوع پر قلم اٹھایا، اور اپنی تحقیقی صلاحیت سے اس کتاب کو اعلیٰ وارفع بنا دیا، اس کتاب میں سید صاحبؒ نے ایسے مؤرخوں کے اقوال لینے سے احتراز کیا ہے جن کے کلام میں مبالغہ آمیزی پائی جاتی ہے، اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ اس کتاب میں خیالی مضامین اور عبارت آرائی نہیں ملتی۔ اس کتاب میں پانچ ابواب ہیں، پہلے باب کا عنوان تعلقات کا آغاز اور ہندوستان کے عرب سیاح ہے، اس باب میں سب سے اہم تحقیق یہ کی گئی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جب آسمان کی جنت سے نکالے گئے تو وہ اسی زمین کی جنت میں جس کا نام ہندوستان جنت نشان ہے اتارے گئے، سراندیپ (لنکا) میں انہوں نے پہلا قدم رکھا جس کا نشان اس کے ایک پہاڑ پر موجود ہے۔ اس طرح سید صاحبؒ نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان مسلمانوں کا پدری وطن ہے۔ اس کتاب کا دوسرا باب تجارتی تعلقات پر حاوی ہے، جو قدیم زمانے میں ہندوستان اور عربوں کے درمیان قائم تھے۔ تیسرا باب

عرب اور ہند کے علمی تعلقات پر مشتمل ہے، اس باب میں سید صاحبؒ نے متعدد مؤرخوں وسیاحوں کے بیانات سے یہ ثابت کیا ہے کہ قدیم زمانے میں عرب علماء کثیر تعداد میں ہندوستان آئے، اور اسی طرح ہندوستان کے بہت سے اسکالرس عباسی دور میں بغداد پہنچے، اس طرح انہوں نے ہندوستانی علوم کی اشاعت عرب دنیا میں کی، علامہ موصوف کا سب سے اہم کارنامہ اس باب میں برامکہ کی تحقیق ہے، عام طور سے یہ مشہور ہے کہ برامکہ مجوسی تھے، یعنی آتش پرست ایرانی، بلخ میں نوبہار نامی ایک آتش کدہ تھا، جس کو منوچھر نے بنوایا تھا، اس کے بارے میں اسلامی مؤرخین لکھتے ہیں کہ برامکہ اسی آتش کدہ کے پیر مغاں تھے۔ سید صاحبؒ ان اسلامی مؤرخوں کی اس تحقیق پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہیں، پھر لفظ برمک کی اصلیت پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں اور تحریر فرماتے ہیں کہ: ''قدیم مؤرخوں اور لغت نویسوں نے اس لفظ کی تحقیق کی طرف توجہ نہیں کی، بعد کے فارسی مؤرخوں اور لغت نویسوں نے اس کو مَکِیْدَنْ (چوسنا) کے فارسی مصدر سے بتایا ہے، جس پر ''بر'' کا لفظ بڑھا کر ''بَر مَکَدَن'' استعمال ہونے لگا، اس طرح اس لفظ کی اصلیت تیار کی، پھر اس لفظ کے سہارے ایک بے بنیاد کہانی کی عمارت تیار کرلی، کہتے ہیں کہ پہلا برمک مسلمان ہو کر جب خلیفۂ وقت کے سامنے حاضر ہوا تو خلیفہ نے اس کو ڈانٹ کر کہا کہ تجھ کو بادشاہوں کے دربار میں آنے کا سلیقہ نہیں، تو اپنے ساتھ زہر لے کر دربار میں آیا، (اس کی انگوٹھی کے نیچے زہریلا پتھر تھا) برمک اول نے کہا یہ میرا قصور ہے، میری انگوٹھی کے نیچے زہر ہے تاکہ اگر کبھی مجھ پر ایسا وقت آجائے کہ مجھے اپنی عزت بچانے کے لئے جان دینی پڑے تو میں اس انگوٹھی کو چوس اور جان دے دوں۔'' (۱۰)

آپ نے یہ دلچسپ داستان تو سن لی، لیکن آپ محقق زماں علامہ سید سلیمان ندوی کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے ''یہ کہانی تمام تر جھوٹ ہے اور صرف فارسی قصہ نویس کی گپ ہے، کیونکہ دمشق کے دربار کی زبان فارسی میں تھی بلکہ عربی تھی، علاوہ ازیں اس قصہ کا ماحصل یہ ہوگا کہ برمک کا لفظ ۸۶ھ کی پیداوار ہے، حالانکہ عرب کے تمام مستند مؤرخوں نے یہی لکھا

ہے کہ یہ بلخ کے افسر پجاری کا پرانا لقب ہے جو ۸۶ھ سے بہت پہلے تھا۔'' (۱۱)

سید صاحبؒ ایک دوسرے مشہور مؤرخ کی رائے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ برمک جس کی اصل فارسی میں برمغ ہے، جس کی جمع مغان ہے اور اسی سے پیر مغان مستعمل ہے، اس رائے کے بارے میں میں سید صاحبؒ فرماتے ہیں اس کی کوئی مثال نہیں دی جاسکتی ہے کہ فارسی (غ) کو عربی میں (ک) سے بدل دیا گیا ہو، اگر برمغ کی عربی بنائی جاتی تو برمج بن سکتا تھا نہ کہ برمک۔ وہ مغربی مؤرخوں پر نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تعجب ہے کہ پرانے مؤرخوں کو چھوڑ کر یوروپ کے نئے مؤرخوں کی بھی ادھر نظر نہیں پڑی، اور پروفیسر براؤن جیسے محقق سے یہ حقیقت چھپی رہی، کیونکہ وہ بھی نوبہار کو آتش کدہ اور برامکہ کو مجوسی کہتے تھے، اور ان کا اصل تعلق ہندوستان سے تھا نہ کہ ایران سے، سید صاحبؒ کا یہ دعویٰ بغیر دلیل کے نہ تھا بلکہ دلائل سے اس حقیقت کو آشکارا کیا۔ برمک کی اصلیت بتلاتے ہوئے سید صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ وہ سنسکرت لفظ پرمکھ کی بدلی ہوئی شکل ہے، کیونکہ پرمکھ کے معنی سنسکرت میں برتر اور عظیم کے ہیں، ان کی یہ تحقیق جدید مؤرخوں کے لئے بہت زیادہ ممد ومعاون ثابت ہوگی، جو قدیم تاریخ کو حقیقت کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں، اور ان کے اس تنقیدی تجزیہ سے آنے والے مؤرخوں کو ایک روشنی حاصل ہوگی جس کی مدد سے وہ اس میدان میں آگے بڑھ سکتے ہیں، جو داستانوں اور خرافات کے انبار میں دب گئے، اور سید صاحبؒ کے اس قول فیصل کے سامنے تمام مؤرخ سر جھکا لیتے ہیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے بھی سید صاحبؒ کی اس اعلیٰ تحقیق کا تذکرہ اس طرح کیا ہے کہ اس باب کی جان سخن برامکہ کے لفظ کی بے نظیر تحقیق ہے جس پر میں اپنے عزیز کو دلی مبارکباد دیتا ہوں، اور کہتا ہوں کہ تحقیق کا یہ نقش ایک بہاری قلم کے انتظار میں پس پردہ تقدیر تھا، آخر آمد ز پس پردہ تقدیر پدید۔ (۱۲)

علامہ موصوف کی سب کتابیں تحقیق کے معیار پر پوری اترتی ہیں، یہی حال آپ کے خطبات کا تھا، پروفیسر رشید احمد صدیقی سید صاحبؒ کی تحقیقی جستجو کا تذکرہ کرتے ہوئے

لکھتے ہیں کہ

''جب سید صاحبؒ علی گڑھ تشریف لاتے تھے، یہاں کے اساتذہ اور طلبہ کو مخاطب کرتے تھے تو میں دیکھتا تھا کہ بہت سے جامعہ کے اساتذہ جن کو اپنی تاریخ دانی پر ناز ہے کاغذ اور پنسل لے کر بیٹھ جاتے تھے اور سید صاحب کی تحقیقی تقریر سے وہ نکات نوٹ کر لیتے تھے جو ان کے لئے مفید ثابت ہوتے تھے۔''

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے اس بیان سے سید صاحبؒ کی تحقیقی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے۔

سید صاحبؒ کی تحقیقی اور تنقیدی خدمات پر علامہ اقبالؒ کا یہ مقولہ کہ ''علوم اسلامی کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سید سلیمان ندویؒ کے سوا اور کون ہے۔'' تو ضرب المثل کی حدت تک مشہور ہو گیا ہے۔ اور حقیقتاً یہ ایک عظیم مفکر کا اپنے وقت کے جلیل القدر عالم کے لئے معتبر ترین خراج عقیدت ہے جو اس نے تجربہ اور مشاہدہ کی روشنی میں پیش کیا۔

حواشی

۱۔ پرانے چراغ حصہ اول ص:۵۷

۲ تا ۶۔ نقوش سلیمانی ۵، ۱۹-۲۰، ۶۱، ۷۴

۷۔ مقالات شیروانی ص:۳۷۳

۸ تا ۱۱۔ عرب و ہند کے تعلقات ۳، ۱۷۵، ۱۰۳-۱۰۴

۱۲۔ مقالات شیروانی ص:۳۷۶

علامہ سید سلیمان ندویؒ

چند یادیں

حفیظ الحق دسنویؒ

بچپن کا زمانہ تھا، ابھی سن شعور کو پہنچا بھی نہ تھا، والد مرحوم کی زبانی سنتا رہتا تھا کہ آپ بڑے عالم دین، مؤرخ اسلام ہیں، صحافت اور سیاست کے میدان میں زندگی گذاری ہے، ان باتوں کو سن کر بچپن ہی سے مجھے سلیمان چا (چچا) کو دیکھنے اور ان کی باتوں کو سننے کا شوق تھا۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ میرے والد کے ہم سن، ہم مکتب اور ہم وطن تھے، ان کی زبانی بہت سی باتیں سنیں، آپ ہر سال موسم گرما میں اپنے وطن دیسنہ ضلع پٹنہ بہار آتے، علامہ اپنے بچپن کے ساتھیوں میں باغ و بہار بنے رہتے، میں ان کی پُر مزاح علمی اور ادبی گفتگو کو شوق سے سنتا۔

پھر ایک زمانہ آیا جب میں نے بھی صحافت کے کوچے میں قدم رکھا، اور اپنے وقت کے بزرگان دین اور سیاست دانوں سے ملاقاتیں ہوئیں، تب جا کر مجھے معلوم ہوا کہ سید صاحبؒ کس پایہ کے اسکالر اور محقق ہیں۔

۴۴ء سے ۴۷ء تک دہلی میں صحافت کی کوچہ گردی کے بعد ۴۸ء میں جب میں اپنے وطن دیسنہ آیا تو اتفاق سے علامہ صاحبؒ بھی آئے ہوئے تھے، اس وقت

اقوام متحدہ میں کشمیر کا مسئلہ نیا نیا پیش ہوا تھا، اور پاکستانی مندوب سر ظفر اللہ خاں کی تقریروں کا بڑا چرچا تھا۔

اس وقت عام طور پر لوگوں کو سلامتی کونسل کے ڈھانچہ اور اس کے طریقہ کار کی خبر نہیں تھی، بین الاقوامی سازش اور اس کی چپقلش سے لوگ اتنا واقف نہیں تھے، جتنا ان دنوں ایک اخبار بیں واقف ہے۔

علامہ صاحب نے اقوام متحدہ کے متعلق بڑے دلچسپ پیرائے میں جو تبصرہ کیا تھا وہ یہ ہے کہ ''اقوام متحدہ کفن چوروں کی انجمن ہے، اس انجمن میں گیارہ چوروں کا گٹھ جوڑ ہے، جسے سلامتی کونسل کہتے ہیں، ان گیارہ چوروں میں پانچ بڑے طاقتور چور ہیں، اس لئے یہ بڑی طاقتیں کہلاتی ہیں، وہ سب اپنے آپ کو دنیا کا چودھری سمجھتے ہیں، اگر دنیا کے کسی مسئلہ پر ان پانچوں میں اتفاق ہے تو وہ حل ہو جاتا ہے، ورنہ زیادہ تر دھونس، اور دھاندلی کے ذریعہ من مانے طور پر چھوٹے ممالک کو مجبور کر کے اپنی بات منواتے ہیں، اور جب نا اتفاق ہوتی ہے تو ''ویٹو'' کے ذریعہ مسائل کھٹائی میں ڈال دیتے ہیں''۔

کشمیر کے معاملہ میں کہا کہ آپ اس بات پر خوش نہ ہوں کہ چودھری ظفر اللہ خاں نے بڑی اچھی تقریر کی ہے، وہاں خطابت کرنا آسان ہے، مگر میدان مارنا مشکل ہے، کیونکہ دنیا کے مسائل وہاں حق وانصاف کی بنیاد پر نہیں ملے ہوتے بلکہ ہر ایک اپنے مفاد کے مدّنظر فیصلہ کرتا ہے، کشمیر کے مسئلے پر امریکہ اور روس کے مفادات الگ الگ ہیں اس لئے یہ کھٹائی میں پڑا رہے گا۔

۴۸ء میں جب میں دہلی سے اپنے گاؤں گیا ہوا تھا اور مخصوص انداز میں سیاسی تبصرے کرتا تو وہ کافی محظوظ ہوتے، اور روزانہ مجھ سے سیاسی حالات پر تبصرہ کرنے کو کہتے، ایک بار میری ہمت افزائی کے طور پر میرے ایک بزرگ داروغہ ضمیر صاحب سے کہا کہ ضمیر بھائی ان کے بولنے کا انداز تو بالکل عاشق کا سا ہے، عاشق میرے بڑے بھائی سعید الحق کا گھریلو نام تھا، انہوں نے یونیورسٹی میں اول اور دوم آنے کا ریکارڈ قائم کیا تھا، پھر مجھ سے

پوچھا کہ کیا پڑھتے ہو؟ میں نے ان سے کہا کہ ابھی میٹرک پاس نہیں کیا ہے، تو کہا کہ میٹرک یا ڈگری سے کیا ہوتا ہے یہ تو ملازمتوں کے لئے ہوتی ہے، آپ صحافت میں رہیں، آپ اس پیشہ میں خوش رہیں گے، میں ساری زندگی اسی پیشے سے منسلک رہا، اور سچی بات ہے کہ نہایت ہی خوش رہا۔

ایسے تو علامہ کو اپنے گاؤں میں بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا مگر جب ۵۲ء میں آپ ہسٹری کانفرنس کی صدارت کے لئے ڈھاکہ آئے تو اس زمانے میں جب میں روزنامہ پاسبان کا چیف رپورٹر تھا، فرصت کے اوقات میں آپ کی خدمت میں اپنی زندگی کا بہترین وقت گذارا، اور زندگی میں اتنی قربت کبھی بھی پھر میسر نہیں آئی، صبح آٹھ بجے سے دس بجے رات تک میں اپنے وفورِ شوق میں آپ کے ساتھ رہتا، اور آپ مجھ سے اتنا خوش ہوئے کہ کہا کہ اس بار تو آپ ہمارے سکریٹری ہیں، اس کے قبل سلمان تھے، یعنی علامہ کے چھوٹے صاحبزادے، مجھے بھی اس سکریٹری شپ پر ہمیشہ ناز رہے گا۔

۵۲ء میں جب میں نے علامہ سے پوچھا کہ آپ کے پاکستان آنے کی کیا وجہ ہے جبکہ آپ اعظم گڑھ میں خاموش طریقہ سے علمی زندگی گذار رہے تھے، اس پر علامہ نے کہا کہ پاکستان آنے کے قبل میں ریاست بھوپال میں قاضی تھا، ہندوستان اور پاکستان کے درمیان منی آرڈر کا سلسلہ جاری تھا، میں نے کچھ روپیہ اپنے ایک عزیز کو کراچی روانہ کیا، اس کے بعد ہندوستان کی خفیہ پولس کی کاروائیوں کے تحت میرے خلاف گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوگیا۔ اس کی اطلاع جب میرے دوستوں کو ملی تو انہوں نے وزیراعظم جواہرلعل نہرو سے کہا۔

جواہرلعل کے حکم سے گرفتاری کا حکم واپس لے لیا گیا، مگر اس واقعہ کا مجھ پر بڑا اثر ہوا، اور میں سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ میری آئندہ نسل کا کیا ہوگا، یہ تو اتفاق کی بات ہے کہ وزیراعظم پنڈت نہرو خود اہل علم ہیں اور میرا احترام بھی کرتے ہیں مگر آئندہ دنیا میں نہ میں رہوں گا اور نہ جواہرلعل تو پھر میری اولاد کے ساتھ کیا ہوگا۔

انہوں نے کہا کہ جہاں بہت سی اور وجوہات پاکستان آنے کی ہیں ان میں سے

ایک یہ واقعہ بھی ہے۔

علامہ نے بتایا کہ جب میں دستور ساز اسمبلی میں اسلامی امور کا مشیر تھا تو ایک امریکی صحافی میرے پاس آیا، اس نے مجھ سے سوال کیا کہ مولانا پاکستان کو اسلامی دستور کی کیوں ضرورت ہے، اس نے کہا کہ اسلامی دستور سازی کے معنی گویا یہ ہیں کہ اسلام کے پاس اپنا کوئی دستور نہیں ہے۔

سید صاحب نے کہا کہ وہ صحافی بڑا ہی خرانٹ اور گھاگ قسم کا تھا اور مجھے فقط مدرسہ کا ملاّ تصور کئے ہوئے تھا۔

میں نے اس صحافی کو بتایا کہ اسلامی دستور کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کس طرز کی حکومت ہوگی یعنی وحدانی طرز کی یا وفاقی طرز کی، صدارتی طرز کی یا پارلیمانی طرز کی، صوبے اور مرکز کے کیا کیا اختیارات ہوں گے عدلیہ اور انتظامیہ کا ڈھانچہ کیا ہوگا، بلکہ اسلامی دستور کے معنی یہ ہیں کہ عوام کے نمائندے ملکی ضروریات کو دیکھتے ہوئے جس طرز کا بھی دستور تیار کریں مگر وہ شتر بے مہار نہیں ہوں گے اور انہیں قرآن وحدیث کی تعلیمات کے مطابق قانون بنانا ہوگا۔

میں نے ۵۳ء میں مولانا کو دیکھا کہ ترجمان القرآن کا مطالعہ کررہے ہیں، میں نے ان سے مولانا مودودی کے بارے میں پوچھا کہ اسلام کو کس طرح پیش کررہے ہیں تو انہوں نے پوچھا کہ آپ کو ان پر شک ہے؟ میں نے کہا کہ میں آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں، تو بتایا کہ ہر زمانہ میں اسلام کو اس زمانہ کے مطابق پیش کیا جاتا ہے، مولانا مودودی زمانۂ حاضرہ میں اسلام کو سائنٹفک طور پر اور دلیل کے ذریعہ پیش کررہے ہیں تاکہ عقلی طور پر انسان اس کو قبول کرے۔

اسی زمانہ کی بات ہے کہ اہل دیسنہ نے ڈھاکہ میں دارالسلام ہاؤسنگ سوسائٹی قائم کی تھی تاکہ ایک جگہ مل جل کر رہیں، اس پر مولانا نے کہا کہ آپ لوگ جہاں اپنے مستقبل کا فیصلہ کررہے ہیں کیا اس حصہ کے مستقبل پر بھی غور کیا ہے، اور پھر پوچھا کہ آپ نے تاریخ

بنگالہ کا مطالعہ کیا ہے، بنگال کی تاریخ مرکز کے خلاف بغاوت کا دوسرا نام ہے۔

علامہ نے بتایا کہ جب مجھے حکومت کی طرف سے اسلامی دستور میں اسلامی امور کے لئے مشیر مقرر کیا گیا تو اس عہدہ کو علمائے کرام کی خواہشات کے مطابق قبول کر لیا تھا مگر جب ایک دن لیاقت علی خاں سے پوچھا کہ میری رائے کی پارلیمانی نمائندوں کے لئے کیا حیثیت ہوگی تو ان کی گفتگو سے میں نے اخذ کیا کہ وہ لوگ ہماری رائے کے پابند نہیں ہوں گے تو گویا اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ صرف میرا نام استعمال کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ اس خیال کے مدنظر میں اس عہدے سے مستعفی ہوگیا۔

شادی بیاہ میں جو حکم ہے کہ ''کفو'' کو ترجیح دی جائے، اس کی بابت بتایا کہ اسلام میں نسل ونسب، ذات پات کی تفریق نہیں ہے، بلکہ بہتر مسلمان وہ ہے جو صاحب تقویٰ ہے، مگر شادی کو کامیاب بنانے کی خاطر ''کفو'' کو ترجیح دی گئی ہے، اور کفو کے معنی ذات نہیں بلکہ ہم معاشرہ کے ہیں، مثلاً دیسنہ کے سید اور سندھ کے سید دونوں سید ہیں مگر دونوں زبان، لباس، کھانے پینے کے لحاظ سے بالکل ایک دوسرے سے جدا ہیں، اسی طرح دیسنہ کے ملک اور پنجاب کے ملک معاشرتی لحاظ سے بالکل جدا ہیں، اور ایسی شادی کی کامیابی کی امید نہیں کی جاسکتی، اس لئے ہم معاشرہ میں شادی کو ترجیح دی گئی ہے۔

علامہ موصوف کو اپنی کتابوں میں ''خطبات مدراس'' بہت پسند تھی اور کہتے تھے کہ عیسائی مبلغوں کے جواب میں رمضان کے مہینہ میں میں نے جذبۂ اسلامی سے سرشار ہوکر یہ خطبات تیار کئے تھے، اور میرے سامعین عوام نہیں تھے بلکہ مغرب زدہ طبقہ تھا اور اسی لئے میں نے مولویانہ انداز کے بجائے عالمانہ انداز اختیار کیا ہے۔

اس کتاب کے انگریزی ترجمہ کی خاطر میرے بڑے بھائی سعید الحق جن کی انگریزی دانی کی دھوم پٹنہ یونیورسٹی بہار میں تھی، انہیں اپنے ساتھ اعظم گڑھ لے گئے، اور آپ کی نگرانی میں ترجمہ کا کام ہوا، اور بعد میں ہندوستان کے سابق صدر ڈاکٹر ذاکر حسین سے اس پر نظر ثانی کو کہا، ذاکر صاحب نے اس ترجمہ کو پسند کیا اور اسے Living

Prophet کے نام سے شائع کیا گیا۔ جناب سعید الحق ایم اے جو ریڈیو پاکستان سے ۶۷ء میں ڈائرکٹر آف مونوٹرمنگ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے انہوں نے اس کتاب پر بڑی محنت کی تھی اور مولانا نے انہیں اس کے ترجمہ کرنے کا خصوصی حق دیا تھا۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ کے موجودہ ڈائرکٹر (ناظم) جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے مجھے بتایا کہ میں جب ڈبل ایم اے کر کے علامہ کے پاس اعظم گڑھ گیا اور کہا کہ علمی کاموں میں زندگی گذارنا چاہتا ہوں تو علامہ نے ایک مضمون لکھنے کی غرض سے چند کتابیں دیں اور کہا کہ اس کے مطالعہ کے بعد اس پہلو پر مضمون تیار کریں، میں نے نوجوانی کے نشے اور یونیورسٹی کی تعلیم کی دھونس جمانے کی خاطر بڑی محنت سے مضمون تیار کیا علامہ نے جب اس پر نظر ثانی کی تو پورا مضمون بدلا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر بڑی شرم آئی، اس موقعہ پر مولانا نے کہا کہ چھوٹے چھوٹے جملے اور کم سے کم الفاظ سے کام نکالیں، الفاظ کے استعمال میں بخل سے کام لیں، کم سے کم الفاظ سے زیادہ سے زیادہ معنی اور خیال کو پیش کرنے کی کوشش کریں گویا سمندر کو کوزہ میں بند کرنے کا نام علم ہے، علامہ کے علم کا جو مجھ پر رعب پڑا وہ ساری زندگی قائم رہا۔ ''معارف'' کے شذرات جو مولانا نے لکھے، اس لحاظ سے پڑھنے کے لائق ہیں۔

۱۹۴۳ء میں جب آپ کو علی گڑھ یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف لٹریچر (ڈی لٹ) کی اعزازی ڈگری دی، اس وقت اہل دیسنہ نے آپ کے اعزاز میں عصرانہ دیا تھا اس موقعہ پر وہ نہایت ہی خوش تھے اور سپاس نامے کے جواب میں کہا تھا کہ دنیا کے اکثر اہل علم اپنے وطن کے لوگوں، عزیزوں سے شاکی رہے ہیں اور ناقدری کا رونا رویا ہے، آج کا دن میرے لئے اس اعزازی ڈگری سے بھی بڑے اعزاز کا دن ہے، آپ نے میری قدر کی ہے اور ہمت افزائی کی، میں اپنے بزرگوں کا خاص طور سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ہمیشہ میری قدر و منزلت کی ہے میں اسے فراموش نہیں کرسکتا۔

ایک بار دیسنہ کتب خانہ الاصلاح میں بیٹھے ہوئے تھے، مولانا ابوالکلام کے

الہلال کے پرچہ کو نکال کر اپنے مشہور مضمون ''مشہد اکبر'' کو دکھایا جو انہوں نے جذباتی طور پر مسجد کانپور کے واقعہ پر بطور اداریہ تحریر کیا تھا اور کہا کہ یہی وہ مضمون ہے جس نے مجھے ہمیشہ کے لئے سیاست کی پُر خار وادیوں سے الگ کر دیا۔ اس میدان کے آدمی ابوالکلام آزاد ہیں میں نہیں، اور میں نے اپنی زندگی علمی کاموں میں سوچے سمجھے منصوبوں کے تحت گزارنے کا فیصلہ کیا۔

علامہ جب مستقل طور پر پاکستان آ گئے تو ان کا ارادہ تھا کہ اعظم گڑھ کی طرح یہاں ایک ادارہ شرقیہ قائم کریں اور یہاں سے اپنے مضامین اور کتابوں کے شائع کرنے کا سلسلہ شروع کریں، سیرت النبی کی ساتویں جلد جو غیر مطبوعہ تھی، اسے بھی شائع کرنا چاہتے تھے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مسودہ ان کے ایک عزیز کے پاس ہے۔

علامہ کی زندگی نے وفا نہیں کی کہ ان کے پروگرام کو عملی جامہ پہنا سکیں، مگر ان کے لائق شاگرد جناب صباح الدین عبدالرحمٰن نے کچھ ماہ پہلے ان کتابوں کی اشاعت کا حق بک فاؤنڈیشن کو قانونی طور پر دیدیا ہے اور یہ ادارہ ایک دن مولانا کے پروگرام کو عملی جامہ پہنائے گا۔

ضرورت ہے کہ بک فاؤنڈیشن دارالمصنفین کا ایک سکشن اپنے ادارہ کے اندر قائم کرے اور سیرت النبی کی ساتوں جلد کے حصول کا اور اشاعت کا انتظام کرے۔ اسی طرح علامہ نے میرے چچا مولوی بشیر الحق صاحب سے جن کے پاس ''معارف'' کی مکمل فائل تھی اسے منگوایا تھا، اور وہ بھی یقیناً ان کے عزیزوں کے پاس موجود ہوگی، اسے حاصل کیا جائے، اور ''معارف'' کے بہتیرے مضامین کو شائع کیا جائے۔

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا سید عزالدین ندوی پھلواروی ؒ

گرچہ شیریں دہنان بادشہانند ولے
آن سلیمان زمان ست کہ خاتم با اوست

دنیائے اسلام کا یہ سانحۂ عظیم بھی بڑا حسرت ناک ہے کہ حضرت العلام سید سلیمان ندوی اس فانی دنیا سے عالم آخرت کی طرف کوچ کر گئے، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جس ماحول میں تربیت پائی اور جن گودوں میں پلے اور جن سہاروں نے انہیں زندگی بخشی ان کا قدرتی تقاضا یہی تھا کہ وہ مخدوم بنتے اور بنے، سید قوم ہوتے اور ہوئے، عالم اسلام کے بڑے سے بڑے رہنماؤں کی صف اول میں ان کی جگہ بنتی اور بنی، ان کی ابتدائی تعلیم پھلواری شریف کی مشہور عالم (علم وعمل کی) بستی میں ہوئی اور اسی ماحول سے کچھ سیکھ کر وہ دارالعلوم ندوہ گئے، پھلواری شریف میں ان کے اساتذہ کی فہرست میں حضرت مولانا سید شاہ محمد سلیمان صاحب قادری چشتی کا اسم گرامی بھی ہے جسے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک مضمون میں جو حضرت شاہ سلیمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر سپرد قلم فرمایا ہے، وضاحت کی ہے، حضرت سید صاحب ؒ کی زندگی کے کارنامے بے شمار اور بیحد روشن ہیں، اہل قلم حیران ہیں، سینہ کوب ہیں، اور آفتاب علم کی اس اچانک جدائی پر صف ماتم بچھی ہوئی ہے ہندوستان و پاکستان ہی نہیں بلکہ سارا عالم اسلام نعم البدل ڈھونڈھ رہا ہے لیکن اسے نہیں ملتا اور نہ ملنے کی امید ہے، حال یہ ہے کہ گذشتہ ساٹھ ستر سال

کی تاریخ میں ملت کے غم خوار و درد آشنا علماء نے جن میں نمایاں ہستیاں حضرت مولانا لطف اللہ علی گڑھی، حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ، حضرت مولانا شاہ سلیمانؒ پھلواری کی تھی، ندوہ العلماء کے نام سے ایک مجلس قائم کی تھی اور اس مجلس نے ایک تعلیم گاہ کا افتتاح کیا تھا اسی تعلیم گاہ کے ایک آفتاب عالم تاب حضرت مولانا سید سلیمان ندوی تھے، بلاشبہ بڑے فخر کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ سید صاحبؒ کا وجود گرامی اس تعلیم گاہ کی روح کا نچوڑ اور عطر تھا اور دارالعلوم ندوہ اگر سید صاحبؒ کے علاوہ کسی اور کو نہ بھی پیدا کرتا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب تھا، وہ دارالعلوم ندوہ کی ایک ایسی گرانمایہ پیداوار تھے جس پر ندوہ اور سارے ندوی ہمیشہ ناز کریں گے، اگرچہ وہ ساری امت مسلمہ کے مخدوم ومطاع تھے، ساری قوم بھی انہیں اسی طرح رو رہی ہے جس طرح ندوی ماتم کناں ہیں، حضرت مغفور کی زندگی کے کام اتنے زیادہ ہیں جن کا گنانا دشوار نہیں دشوار تر ہے، تصنیفوں کا جو ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں وہ اس درجہ قیمتی اور نفع بخش ہے کہ اس کا صحیح اندازہ امت کے خواص ہی کر سکتے ہیں، سیرۃ النبی کی جلدیں سبحان اللہ! کیا کہنے ہیں ان کے؛ دربار رسالت کا مقبول کارنامہ، اور نجات کے لئے یہی بس ہے کہ مصنف وتصنیف دونوں بارگاہ رسالت میں مقبول ہیں، اور اس فیروز بختی کا بھی کیا کہنا ہے کہ اس راہ میں بھی اتنے اونچے گئے ہیں کہ جہاں ان کے معاصرین نہیں پہونچ سکے ہیں، حضرت رسالت سے جن تصنیفوں کو شرف قبول بخشا گیا ہے، جہاں امام دارالہجرت مالک بن انس کی موطا اور دیگر فقہاء ومحدثین کی بعض تصنیفیں، مصلح الدین شیرازی سعدی کی گلستان وبوستان وعلامہ بوصیری کا قصیدہ بردہ ہیں، وہاں مولانا سید سلیمان ندویؒ اور ان کی تصنیفوں کا عطر ونچوڑ سیرۃ النبی کی جلدیں بھی ہیں، اہل قلم مقالات لکھ رہے ہیں، اور ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر خامہ فرسائی ہو رہی ہے اور میرے عزیز ومحترم بھائی مولانا سید رئیس احمد جعفری کی فرمائش وعنایت پر میں بھی ایک مقالہ ماہنامہ ''ریاض'' کے سید سلیمان نمبر کے لئے آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں، مگر میں ان کی زندگی کے ایک خاص روشن پہلو کو.....؟ بخش رہا ہوں وہ یہ کہ سید صاحب رحمۃ اللہ

علیہ اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ حدیث "خیر الناس من ینفع الناس" (بہترین انسان وہ ہے جو دوسروں کو نفع پہچائے) کی ایک زندہ تفسیر تھے علم پروری ان کی خمیر کا ایک جزء بن گئی تھی، ان کی ذات صدہا بے پناہ اہل علم کے لئے ایک بڑا سہارا تھی، وہ اپنے معاصرین کو بھی فائدہ پہونچانے سے گریز نہیں کرتے تھے، ندوۃ العلماء کے وابستگان میں کوئی ایسا نہیں جو ان کا ممنون کرم نہ ہو خصوصاً میرے ساتھ ان کی کرم فرمائیاں اس حد تک بڑھی ہوئی تھیں کہ مجھے کبھی یہ محسوس نہ ہوسکا کہ میں اس دنیا میں بے سہارا ہوں، خدا شاہد ہے، میری تمناؤں کو پروان چڑھانے والے میری علمی ترقیوں سے خوش ہونے والے میرے، محسن اور سب کچھ وہ تھے، دارالعلوم ندوہ سے فارغ ہوتے ہی مجھے موتیہاری ضلع چمپارن میں شعبہ تبلیغ وصدر مدرسی کی ایک جگہ مل گئی تھی، سید صاحب رحمہ اللہ نے اس کی ایک ہلکی سی مبارکباد کے بعد مجھے ایک ایسا مربیانہ شفقت ومحبت بھرا خط لکھا جس کے لفظ سے رس ومٹھاس ٹپک رہی تھی، اس خط کا اقتباس بھی ہدیہ ناظرین ہے، عنوان یوں ہے:

برادرم مولوی شاہ عزالدین صاحب صدر شعبہ تبلیغ وصدر مدرس مدرسہ اسلامیہ موتیہاری عزیزی، زادعلمہ وفضلہ، السلام علیکم۔

افسوس ہوا کہ میرا اصلی خط (یعنی پہلا خط) آپ کو نہیں ملا ورنہ آپ اس افسردہ دلی سے میرے خط کا جواب نہ دیتے، میں نے اس میں سب کچھ لکھا تھا، اور محبت سے لکھا تھا، نواب صدر یار جنگ شروانی آپ کو میمن عبدالعزیز صاحب کے پاس علی گڑھ بھیجنا چاہتے ہیں، دو برس کے بعد وہاں سے واپس آکر آپ ندوہ میں درس ادب کا کام کریں، چونکہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو ذوق ادب ہے اس لئے مناسب سمجھا کہ آپ کو اس فن میں ترقی وتکمیل کا موقع بہم پہنچاؤں، آپ موجودہ معاوضہ کی کمی وبیشی کا دھیان بھی نہ لایئے، بلکہ اپنی علمی ترقی وتکمیل اور ابھرنے کے مواقع کو دیکھئے! تو کیا آپ چالیس روپئے ماہوار کے وظیفہ پر دوسال علی گڑھ میں میمن عبدالعزیز صاحب مشہور ماہر ادبیات عرب

وکاتب ولغوی کے پاس رہ کر تکمیل کرنا پسند کریں گے تاکہ دو برس کے بعد ندوہ آ کر آپ ندوہ میں درس ادب کی خدمت انجام دیں..........الغرض دو مشکلیں ہیں اور دونوں میں سے ایک کے لئے آپ کو تیار ہونا چاہئے ورنہ کسی اور کا انتخاب کرنا ہوگا۔

والسلام

سید سلیمان

۱۲/دسمبر ۴۸ء

کرم کا یہ موجزن دریا اور دل پر قابو پانے والا بلکہ چھا جانے والا یہ جادو ایسا نہ تھا جس کی کوئی کاٹ ممکن تھی، میں نے فوراً جواب دیا، فرمان کے مطابق موتیہاری چھوڑنے پر آمادہ ہوں لیکن اس کا جواب بھی عربی کی دو سطروں میں آ گیا۔

عزیزی أکرمك الله السلام علیکم ورحمة الله

لا تعجل في الأمر وتربّص حتى يأتيك كتابي فإن الشرواني حتى الآن لم يقطع أمرًا.

والسلام

سليمان الندوي

۲۰/دسمبر ۴۸ء

یہ خط وکتابت اس وقت ہوئی تھی جب میری عمر غالبًا بائیس تئیس سال کی تھی اور میں مجروح تھا، خدا کی شان دیکھئے کہ یہ اسکیم دوبارہ برائے کار نہیں آئی اور حضرت مغفور نے کچھ دنوں کے بعد ہی ناظم ندوہ ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ کے ذریعہ تقرری کا خط بھجوا کر ندوہ میں ادب وتفسیر کی جگہ پر مامور کردیا، پانچ سال تک اس منصب پر فائز رہنے کے بعد ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کی طلب پر مجھے سید صاحب مغفور لہٗ نے شاہی مسجد لاہور کی خطابت

وامامت کے لئے روانہ فرمادیا اور وہاں کی کارگذاری پر ہمیشہ خوش وخرم رہے اور برابر قیمتی رہنمائی فرماتے رہے، جب میں نے اپنی پہلی علمی کاوش کشف الظلام کے نام سے شائع کی تو پسند فرمایا، لیکن بعض عربی اشعار کے ترجمہ کی اصلاح فرمائی، میں نے ان اصلاحوں پر اپنا تلمیذانہ شبہ پیش کیا تو مزید غور فرما کر بڑی صداقت کے ساتھ رجوع فرمالیا، اور بڑی شفقت بھری نگاہوں سے دیکھا جس کی لذت وکسک دونوں ہی آج تک محسوس کرتا ہوں، اور یہ ایک ایسا انوکھا اتفاق ہے کہ آج سے ۲۰-۲۵/سال ادھر سید صاحبؒ نے جن اشعار کے ترجمے کی اصلاح فرمائی تھی وہ ان کے سانحہ ارتحال سے ایک گہری مناسبت رکھتے ہیں، ان اشعار میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس فقیہ امت کے حالات سے ہو بہو مطابقت رکھتا ہے، اشعار یہ ہیں:

فليت المنايا كن خلّصن عاصمًا
فعشنا جميعا أو ذهبن بنا معًا
(کاش کہ موت عاصم کو چھوڑ دیتی تو ہم دونوں
ساتھ جیتے یا ہم دونوں کو ایک ہی ساتھ لیجاتی)

دفعنا بك الأيام حتى إذا أتت
تريدك لم نستطع لها عنك مدفعا
(زمانے کی مصیبتوں کو ہم تیرے سہارے دور کرتے
رہے لیکن جب وہ تجھی کو چاہتی آ گئیں تو ہم ان کو تجھ سے ہٹا نہ سکے)

آج اسی طرح امت اسلامیہ، ندوہ واہل ندوہ ہم زبان ہوکر اپنے عاصم کے غم میں سوگوار ہیں، ان کا عاصم کھو گیا اور جو جگہ اس نے چھوڑی ہے پُر کرنے والا کوئی نہیں، قوم روئے گی اور روتی رہے گی لیکن یہ گنج گراں مایہ پھر کبھی نہ ملے گا، سید صاحب رحمۃ اللہ جب معارف میں ہندوستان میں علم حدیث کے نام سے ایک طویل وبسیط مقالہ لکھ رہے تھے،

اس وقت مجھ ناچیز سے فرمائش کی کہ صوبہ بہار اور پھلواری شریف میں کن کن واسطوں سے علم حدیث پہونچا ہے اس پر ایک مقالہ لکھوں، میں نے حکم کی تعمیل کی تو معارف میں اسے شائع فرمایا، میرے مضمون پہونچنے کی اطلاع خط کے ذریعہ ان الفاظ میں دی:

عزیزم محترم السلام علیکم

آپ کا مضمون علم حدیث پر پہونچا اس کی بہت ضرورت تھی، انشاء اللہ تعالیٰ معارف میں شائع ہوگا۔

والسلام

سید سلیمان

۳۱/مارچ ۴۳ء

علم دوستی وعلم پروری کی ایک انوکھی مثال مولانا عبدالعزیز میمن کی ہے، میمن صاحب اورینٹل کالج لاہور میں ادبیات عرب کے استاد تھے ان کی مہارت فن کو دیکھ کر سید صاحبؒ ان کو کسی اونچے منصب پر دیکھنے کے خواہش مند تھے، علی گڑھ یونیورسٹی سے سید صاحب کو گہرا لگاؤ تھا، وہاں صدر شعبہ ادبیات عرب کی جگہ خالی ہوئی تو انہوں نے بڑی کوششوں سے میمن صاحب کو نامزد کرایا اور اتنی بڑی جگہ پر بڑے معاوضہ کے ساتھ چپکا دیا، اس واقعہ کا تذکرہ سید صاحب رحمۃ اللہ نے ناچیز سے بذات خود فرمایا تھا، موقع یہ تھا کہ دارالعلوم ندوہ میں مالی معاوضہ کی کمی بیشی پر گفتگو چل پڑی تھی، فرمانے لگے میں خود تو دارالمصنفین سے اب تک ایک واجبی رقم لیتا رہتا ہوں لیکن اپنے دوستوں کو گراں قدر تنخواہوں پر مامور کرتا ہوں، میمن صاحب کو سات آٹھ سو روپیوں کی جگہ پر رکھا آیا ہوں، اللہ اکبر! علم پروری وعلم شناسی کی حد ہوگئی، میمن صاحب بذات خود کسی وجہ سے غالبًا سید صاحبؒ سے خوش نہیں تھے، لیکن اس کی پرواہ کئے بغیر ان کے علم کی ایسی قدردانی صرف سید صاحبؒ کا کارنامہ ہوسکتا ہے، اب دکھے ہوئے دل اور بہتے آنسوؤں کے درمیان ان کی ایک تحریر کا حوالہ دیکر رخصت ہوتا ہوں، دارالعلوم ندوہ کے ایک سالانہ

اجلاس کے موقع پر چار مہمان جمع تھے، قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ، مولانا سلیمانؒ اشرف صدر شعبہ دینیات علی گڑھ یونیورسٹی، حضرت مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواریؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، حضرت شاہ سلیمان صاحب پھلواریؒ نے فرمایا، پہلے سلیمانؒ فرد تھا، اب رباعی ہے مولانا سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں اور کس حسرت سے فرماتے ہیں کہ قاضی محمد سلیمان صاحبؒ کی وفات سے چند سال گذرے کے مثلث ہوگئی اور حضرت شاہ سلیمانؒ کی وفات سے ۳/صفر کو قطعہ ہوگئی۔ اس رباعی کے صرف دو مصرعے باقی ہیں، راقم الحروف عزالدین کہتا ہے، دو مصرع بھی کچھ دن پیشتر سے فرد بن گئے تھے، اور آخری فرد دریتیم علامہ سید سلیمان ندویؒ کی ذات گرامی تھی، افسوس کہ وہ فرد بھی چند دن پیشتر مٹ گیا، إنا للّٰہ وإنا إليه راجعون لیکن مولانا سید سلیمان ندویؒ کی موت اپنے پیچھے ایک ایسا سرمایۂ علم وخدمت چھوڑ گئی ہے جو رہتی دنیا تک ان کا نام وکام باقی وروشن رکھے گا۔

قد مات قوم وماتت مکارمهم

وعاش قوم وهم فينا كأموات

بلاشبہ مولانا سید سلیمان ندویؒ تنہا امت تھے، قوم تھے اور سب کچھ تھے، حضرت مولانا شاہ سلیمان پھلواریؒ کی دعاؤں نے علامہ سید سلیمان ندویؒ جیسا گوہر پیدا کیا تھا، اب نہ شاہ سلیمانؒ ہیں اور نہ سید سلیمان ندویؒ، کیا توقع کی جائے کہ ہندوستان میں کوئی سید سلیمان ندویؒ پیدا ہوگا، اللہ تعالیٰ ان کے مدارج فزوں سے فزوں تر کرے، قیامت تک ان کی قبر انوار وبرکات کا سرچشمہ رہے، آمین۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ اور علامہ سید سلیمان ندویؒ

مصباح دسنوی (مرحوم)

انیسویں صدی کے نصف آخر میں برصغیر کے مسلمانوں میں جو مایہ ناز شخصیتیں پیدا ہوئیں ان میں مولانا اشرف علی تھانویؒ اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کو بڑی نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ، شریعت وطریقت کے روشنی سے قلب وذہن کو منور کر رہے تھے اور علامہ سید سلیمان ندویؒ تحقیق، تاریخ وسیر کے جلوے دکھا کر دلوں کو مسخر کر رہے تھے۔ دونوں کی عمروں میں تقریباً بائیس سال کا فرق تھا۔ مولانا تھانویؒ، عمر میں علامہ ندویؒ سے بائیس سال بڑے تھے، جب دونوں اپنی شہرت کے بام عروج پر پہنچ چکے تو ان کے درمیان ملاقاتوں اور مراسلات کا سلسلہ شروع ہوا۔ علامہ ندویؒ نے پہل کی۔ کئی خطوط اور ملاقاتوں کے بعد دونوں میں مرشد اور مرید کا رشتہ قائم ہوگیا۔ بقول مولانا ابوالحسن ندویؒ، علامہ ندوی نے ''سالوں کی راہ مہینوں میں، مہینوں کی راہ ہفتوں اور دنوں میں طے کی اور شیخ وقت کے اعتماد واستناد سے بہت جلد سرفراز اور ان کے خلیفہ مجاز ہوئے''۔ مولانا تھانویؒ نے علامہ ندویؒ کو ۲۲؍اکتوبر ۱۹۴۲ء کو اپنا خلیفہ مجاز بنایا۔ اتنے کم عرصے میں علامہ ندویؒ کو خلیفہ مجاز بنانے پر مولانا تھانویؒ کے اہل خاندان اور علماء نے شکوہ کیا کہ ہم لوگوں نے زندگی بھر آپ کی خدمت کی اور آپ نے اتنے کم عرصہ میں علامہ سلیمان ندویؒ کو اپنا خلیفہ بنا دیا۔ اس پر جناب حفیظ الحق دیسنوی کے بقول مولانا تھانویؒ نے یہ جواب دیا: ''تم لوگ بھیگی لکڑی کی طرح ہو، زمانے تک ساتھ رہنے

کے باوجود تم میں وہ کیفیت نہیں پاتا جو سلیمان ندویؒ میں پاتا ہوں، وہ ایک خشک لکڑی کی مانند ہیں۔ اسی لئے میری نظر ان کی طرف گئی''۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ، عالم اسلام کے وہ جید عالم دین تھے جنہوں نے آٹھ سو سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ انہوں نے مسلمان خواتین کی دینی اصلاح اور تربیت کا جو بیڑا اٹھایا تھا اسے پار لگانے میں پوری طرح کامیاب ہوئے۔ ان کی کتاب ''بہشتی زیور'' کو عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی۔ برصغیر اور دیگر ممالک میں رہنے والے اردو داں مسلمانوں کے گھروں میں اس کتاب کے نسخے لازماً ہوتے ہیں۔ خواتین کو جب کبھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو وہ اس کتاب سے براہ راست استفادہ کرتی ہیں۔ اس کتاب کے متعلق ان کے خلیفہ مجاز سید سلیمانؒ فرماتے ہیں: ''بہشتی زیور کہنے کو تو عورتوں کی کتاب ہے مگر فقہ حنفی کی ضروریات کے لئے انتہائی احتیاط وکاوش کا نتیجہ ہے''۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ، چہارشنبہ ۵؍ربیع الثانی ۱۳۸۰ھ (۱۸۶۱ء) کو تھانہ بھون میں پیدا ہوئے، انہوں نے ابتدائی تعلیم تھانہ بھون میں مولانا فتح محمد تھانوی صاحب سے حاصل کی۔ اس کے بعد چھ سال تک مدرسہ دیوبند میں تعلیم حاصل کر کے فارغ التحصیل ہوئے۔ پھر چودہ سال تک کانپور میں مدرس کے فرائض انجام دیتے رہے، انیس سال کی عمر میں حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی سے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی وساطت سے خط کے ذریعہ غائبانہ بیعت کی۔ اکیس سال کی عمر میں حج کرنے گئے اور وہاں اپنے مرشد سے فیض حاصل کیا۔ تیس سال کی عمر میں دوسری دفعہ حج کے لئے گئے اور وہاں ایک خاص عرصے تک اپنے مرشد کی خدمت میں رہے اور ان سے باطنی استفادہ کیا۔ چھتیس سال کی عمر میں کانپور سے تھانہ بھون آگئے اور وہاں سینتالیس سال تک یعنی تا حیات خانقاہ امدادیہ کی سہ دری میں بیٹھ کر لاکھوں انسانوں کو فیض پہنچاتے رہے۔ سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں کہ انہوں نے اپنے مواعظ، تصانیف اور ملفوظات سے لاکھوں کو انسان، ہزاروں کو مسلمان اور سیکڑوں کو متقی کامل بنا دیا۔ انہوں نے ۸۳؍سال کی عمر پائی، ان کی وفات

۱۳۶۲ھ میں (۱۹/اور ۲۰/جولائی ۱۹۴۳ء کی درمیانی شب) ہوئی۔ بہشتی زیور کے علاوہ ان کی دیگر کتابیں تفسیر البیان، شرح مثنوی فتاویٰ امدادیہ اور التعرف الی التصوف ہیں۔ ان کے خطبات، ملفوظات اور مواعظ کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا تعلق ایک دینی گھرانے سے تھا۔ ان کے والد حکیم ابوالحسن صاحب، طبیب حاذق بھی تھے اور نقشبندی ابوالعلائی سلسلے کے شیخ اور صاحب نسبت بزرگ بھی تھے۔ ان کے بڑے بھائی مولانا سید ابوحبیب صاحب طبیب، عالم دین اور حضرت ابواحمد بھوپالی مجددی کے خلیفۂ مجاز تھے۔ ان کے چچا حافظ تجمل حسین صاحب فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے خلیفہ تھے۔ انہوں نے اپنے بڑے بھائی سے بچپن میں دینی تربیت حاصل کی۔ ان کی ہدایت پر ذکر اور مراقبہ بھی کئے، ان کے بڑے بھائی نے اوائل عمر ہی میں ان کے قلب وذہن میں شریعت کے بیج بو دیئے تھے۔

علامہ ندوی نے اپنے استاد محترم علامہ شبلی نعمانیؒ کی ہدایت پر ۱۹۱۵ء میں اعظم گڑھ میں دارالمصنفین قائم کیا اور اسی سال اپنی تصنیف ''ارض القرآن'' کی پہلی جلد شائع کی ۱۹۱۶ء میں ماہنامہ ''معارف'' جاری کیا ۱۹۱۷ء میں اپنی تصنیف ''حیات امام مالک'' شائع کی۔ ۱۹۱۸ء میں ''ارض القرآن'' کی دوسری جلد شائع کی۔ یہ تحقیقی تصنیف بائیس سال کی محنت شاقہ کے بعد منظر عام پر آئی ۱۹۲۰ء میں انہوں نے اپنے استاذ محترم علامہ شبلی نعمانیؒ کی تصنیف ''سیرۃ النبی'' کی جلد اول اور جلد دوم شائع کی۔ اسی سال وہ خلافت وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے یورپ گئے، پھر سیرۃ النبی کی بقیہ جلدوں کی تصنیف میں ہمہ تن مصروف ہوگئے اور ۱۹۲۲ء میں اپنی تصنیف سیرت النبی جلد سوم شائع کی ۱۹۲۵ء میں مدراس میں سیرت نبویؐ پر آٹھ لیکچر دیئے اور انہیں ''خطبات مدراس'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا۔ ۱۹۲۶ء میں وہ پھر خلافت وفد کے سربراہ کی حیثیت سے حجاز گئے۔

علامہ ندوی کافی عرصے سے ایک کامل رہبر کی تلاش میں تھے۔ کافی غور وفکر کے بعد ان کی نظر انتخاب مولانا اشرف علی تھانویؒ پر پڑی۔ مشکل یہ تھی کہ دونوں کا تعلق دو مختلف

مکاتب فکر سے تھا، علامہ کا تعلق ندوۃ العلماء لکھنؤ سے تھا اور مولانا تھانویؒ دیوبندی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے، علامہ ندویؒ نے اس اختلاف کو نظر انداز کر کے مولانا تھانویؒ کو خط لکھا۔ مراسلت کا آغاز اس طرح ہوا کہ مولانا ظفر احمد عثمانی نے مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایماء پر کشف الدجیٰ کے نام سے ایک رسالہ لکھا اور اس پر تقریظ لکھنے کے لئے اس کی ایک کاپی سید صاحب کو بھیجی، سید صاحب نے اس کا جواب براہ راست مولانا اشرف علی تھانویؒ کو دیا اور یہ لکھا کہ ''بار بار میرا دل جب زمانہ کے فتن وحوادث سے گھبرا اٹھتا ہے اور بے اختیار کسی سکونت وطمانیت کے دامن کی تلاش ہوتی ہے تو خانقاہ امدادیہ کی یاد آتی ہے لیکن ڈرتا کہ معلوم نہیں کہ اجنبیت و بیگانگی سے میرے متعلق کیا کیا آپ تک پہنچا ہو اور آپ مجھے تخاطب کا اہل بھی سمجھیں یا نہیں، اب میں اس کشمکش کی منزل میں ہوں جس میں ظاہری علوم تسکین کا باعث نہیں بنتے''۔

اس خط کے جواب میں مولانا اشرف علی تھانویؒ نے لکھا: ''میں دوستی کو تیار ہوں بشرطیکہ علوم میں مخاطب نہ بنایا جائے''۔ سید صاحبؒ نے مولانا اشرف علی تھانویؒ کو دوسرے خط میں لکھا: ''میرے لئے کوئی ایسا نسخہ تجویز فرمائیں کہ مجھ میں استقامت وتثبت اور رغبت الی الطاعات پیدا ہو۔ فرائض کا پابند ہوں، بدعات سے نفور ہوں۔ کبھی کبھی ذوق سجود کی لذت بھی پاتا ہوں''۔ اس خط کے جواب میں مولانا اشرف علی تھانویؒ نے سید صاحبؒ کو اپنی ایک تصنیف روانہ فرمائی اور کچھ نصیحتیں کیں، تھوڑے عرصے تک مراسلت جاری رہی۔ ۱۹۳۰ء میں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا، ہوا یہ کہ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کے رسالہ ''النور'' اور سید سلیمان ندویؒ کے رسالہ ''معارف'' میں کچھ فروعی مسائل پر اختلاف ہوگیا۔ اول الذکر دیوبندی مسلک کا نقیب اور مؤخر الذکر سنت جماعت کے مسلک کا ترجمان تھا۔ چنانچہ سید صاحبؒ نے مولانا تھانویؒ سے مراسلت کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ پانچ سال بعد یعنی ۱۹۳۵ء میں سید صاحب علامہ اقبالؒ کی دعوت پر لاہور میں ان سے ملاقات کے بعد غیر متوقع طور پر تھانہ بھون پہنچے اور مولانا اشرف علی تھانویؒ سے پہلی

ملاقات کی۔اس کے متعلق مولانا تھانویؒ نے مولانا عبدالماجد دریا آبادی کو ایک خط میں لکھا: ''مولانا سید سلیمان ندویؒ صاحب دفعتاً تشریف لے آئے، میں مکان پر تھا سنتے ہی حاضر ہوا۔ میرے ذہن میں ان کا جثہ طویل وعریض تھا۔ ملا تو معتدل الخلقت پا کر قلب کو بہت انس ہوا۔ پھر ملاقات ومکالمت سے ان کی تواضع اور سادگی ورعایت جلیس دیکھ کر تو مسخر ہی ہوگیا''۔

ان دونوں بزرگوں کی دوسری ملاقات ۱۹۴۰ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۰ء تک یعنی پانچ سال تک دونوں کے درمیان خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے یہاں بیعت کے لئے کم از کم پچاس خطوط کی شرط تھی۔ سید صاحب کی طرف سے جب یہ شرط پوری ہوگئی، تو مولانا تھانویؒ نے انہیں مرید بنالیا اور ان کی شان میں یہ اشعار کہے:

از سلیماں گیر اخلاص عمل
داں تو ندوی را منزہ از دغل
اے دلت مخمور از اسرار حق
اے دلت معمور از آثار حق
اے دلت پرنور از انوار حق
اے دلت مسرور از اظہار حق

مرشد اور مرید کے درمیان زندگی میں تعلق کی مدت بہت مختصر رہی۔ علامہ ندویؒ کو خلافت عطا کرنے کے آٹھ نو ماہ بعد مولانا تھانویؒ اس جہان فانی سے رخصت ہوگئے۔ علامہ ندویؒ کو اپنے مرشد سے جو قلبی تعلق تھا اس کا اندازہ اس تعزیت نامہ سے ہوتا ہے جو انہوں نے ان کے وصال کے بعد لکھا اور ماہنامہ معارف میں شائع کیا۔ اپنے مرشد کے یہاں آخری حاضری کے بعد رخصت کا منظر یوں بیان کرتے ہیں: ''صبح کی مجلس کے بعد رخصت کی درخواست پیش کی۔ بااین ہمہ ضعف لیٹے ہی لیٹے دونوں ہاتھ رخصت کے لئے

بڑھائے۔ حقیر نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر دست مبارک کو بوسہ دیا اور آنکھوں کو ملا۔ آہ! کس بلا کا رخصتانہ تھا۔ فرمایا، جاؤ خدا کے سپرد کیا۔ یہ الفاظ کانوں نے پہلے نہیں سنے تھے، آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور دیر تک چہرہ مبارک پر جمی رہیں کہ یہ جمال آرا شاید پھر دیکھنے کو نہ ملے۔ سوا ایسا ہی ہوا''۔

علامہ ندویؒ نے اپنے مرشد کے انتقال پر ''رحلت شیخ'' کے عنوان سے جو غزل کہی اس سے ان کے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے:

داغ فراق یار مٹایا نہ جائے گا
اب دل کا یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا
حرف دم دواع ''خدا کے سپرد ہو''
تا آخر حیات بھلایا نہ جائے گا
دل بھر کے دیکھ لو یہ جمال جہاں فروز
پھر یہ جمال نور دکھایا نہ جائے گا
گوش جہاں بغور سنے اس کلام کو
پھر یہ کلام شوق سنایا نہ جائے گا
اے میکشو یہ درد تہ جام بھی پیو
ترسو گے پھر یہ جام پلایا نہ جائے گا
اے دل خموش، صبر ورضا کا مقام ہے
نقش دوام فیض مٹایا نہ جائے گا
پیر مغاں نہیں ہے مگر میکدہ تو ہے
جام وسبو یہاں سے ہٹایا نہ جائے گا
یونہی بچھا رہے گا یہاں خوان فیض عام
جب تک ہیں میہمان بڑھایا نہ جائے گا

چاہا خدا نے تو تری محفل کا یہ چراغ
یونہی جلا کرے گا بجھایا نہ جائے گا

مولانا تھانویؒ اور علامہ ندویؒ کے درمیان جو تعلق قائم ہوا تھا وہ صرف مرشد اور مرید کے درمیان ذاتی تعلق نہ تھا، بلکہ اصحاب بصیرت کی نظروں میں یہ دیوبند اور ندوہ کا باہمی اتحاد تھا، جس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے ہیں، ان دونوں بزرگوں نے اپنی زبان اور قلم سے جو نور ہدایت پھیلایا ہے وہ رہتی دنیا تک سینوں کو باطل کی تاریکیوں سے محفوظ رکھے گا:

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی اہلیہ مرحومہ سلیمہ خاتون

مولانا ڈاکٹر غلام محمد حیدر آبادی

عام طور پر اللہ والیاں بھولی بھالیاں ہوتی ہیں۔ مگر سلیمہ خاتون مرحومہ عجب مجموعہ اوصاف تھیں، مجاہدہ، عابدہ، رات کی بیدار اور دن کی کثرت سے روزہ دار اور اس کے ساتھ ساتھ بڑی عاقلہ، معاملہ فہم، منتظم اور سلیقہ شعار، گھر کی چھوٹی بڑی، بال بچوں اور عام وخاص مہمانوں کی ساری ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے اور اپنے شوہر، وقت کے ابن خلدون اور ابن قیم کو ان کی علمی اور ملی خدمات کے لئے پوری یکسوئی فراہم کئے ہوئے تھیں، تعلقات میں ایسی شفیق ومہربان کہ جس کسی کو بھی ان سے واسطہ پڑا اس نے ان کے برتاؤ میں مادرانہ مہر ومحبت کا وفور محسوس کیا۔ خوددار اور باہمت ایسی تھیں کہ تنگیوں اور سختیوں کے موقع پر نہ حرف شکایت زبان پر لائیں نہ کسی غیر کا احسان اٹھانا گوارا کیا۔ مشہور شاعر عرفی نے شاید ایسی ہی ہستیوں کے بارے میں کہا تھا:

اقبال کرم می گزد ارباب ہمم را
ہمت نہ خورد نیشتر لا ونعم را

حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کی پاکستان آمد فیصلہ ہجرت کے ساتھ نہیں بلکہ نجی نوعیت کی تھی، کہ ایک مختصر سفر میں یہاں کے حالات کا جائزہ لے کر کسی قطعی فیصلہ پر پہنچا جائے۔ اسی لئے معمولی رخت سفر کے ساتھ آئے تھے مگر حالات کچھ ایسے بنتے گئے کہ مسافر کو مقیم بن جانا پڑا اور پھر اپنی اہلیہ محترمہ کو بھی بلوالیا گیا، جائداد، اثاثہ واسباب جو کچھ

اپنے وطن دیسنہ یا اعظم گڑھ یا بھوپال میں رہ گیا تھا سب چھوٹ گیا سو چھوٹ گیا۔ ادھر برس بھر سے زیادہ تک بورڈ تعلیمات اسلامی جس کی صدارت کی پیشکش مدت سے حکومت پاکستان کی طرف سے موجود تھی، بعض وجوہ سے علامہ نے اس کو بھی قبول نہیں فرمایا، پردیس میں یہ وقت ایک آسودہ حال گھرانے کے لئے کس قدر صبر آزما تھا مگر جس پامردی اور کامیابی سے گزارا گیا اس میں بڑا حصہ حضرت علامہ کی غیور اور عالی ہمت رفیقۂ حیات کا بھی تھا۔ اسکا اندازہ صرف ایک واقعہ سے لگا لیجئے۔ یہ واقعہ برسوں پہلے میں نے اپنی تالیف تذکرہ سلیمان میں بھی لکھا ہے کہ ایک روز راقم الحروف کی موجودگی میں ایک لیڈر مولانا آئے اور انہوں نے دو ہزار کی رقم یہ کہہ کر علامہ کو پیش کی کہ فلاں صاحب نے اتنی ہی رقم مجھ کو بھی ہدیہ کی ہے۔ اور یہ حضرت کے لئے ہے، علامہ مسکرائے اور فرمایا اچھا، اور فوراً اٹھ کر زنانہ دروازہ میں کھڑے ہوئے اور اپنی رفیقۂ حیات اور بچیوں سے ایک ایک کر کے پوچھا، بھئی یہ دو ہزار روپے مولانا ہدیہ لائے ہیں، تم کو ضرورت ہے؟ ہر ایک نے جواب دیا کہ نہیں چاہئے۔ اس کے بعد علامہ نے وہ روپے ان مولانا کو لوٹا دیئے کہ مجھے تو حاجت نہ تھی، گھر میں بھی کوئی لینے کو تیار نہیں ہے۔

پھر ۲۲ رنومبر ۱۹۵۳ء کو جب حضرت علامہ رحلت فرما گئے، تو ایک فرزند اور دو کم عمر صاحبزادیوں کی تعلیم، شادی بیاہ وغیرہ کی ذمہ داری علامہ کی بیگم صاحبہ کے دوش پر آ پڑی، جن کا کوئی وسیلۂ معاش نہ تھا، یہ وقت وہ تھا جب ملک غلام محمد گورنر جنرل پاکستان تھے اور وہ تو علماء کے مخالف سمجھے جاتے تھے۔ مگر کئی وجوہ کی بناء وہ حضرت کی شخصیت کے معترف تھے، کہنے والوں نے بہت اصرار کیا کہ بیگم صاحبہ حکومت میں ایک درخواست دیں تو معقول روزینہ مقرر ہو جائے گا مگر غیور سیدہ اس پر بالکل راضی نہ ہوئیں۔ اللہ کی ذات پاک پر توکل کئے رہیں اور غیب سے ایسے سامان ہوتے گئے کہ اپنے ہونہار صاحبزادہ کو انہوں نے اعلیٰ تعلیم دلوائی اور آج وہ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی (صدر شعبہ اسلامیات ڈربن یونیورسٹی افریقہ) کے نام سے علم و تحقیق کی دنیا میں ایک معروف شخصیت ہیں، اور مرحومہ کو اپنے اسی

اکلوتے فرزند (علامہ کے بڑے فرزند جناب ابو سہیل ریٹائرڈ کسٹم افسر حضرت علامہ کی پہلی زوجہ محترمہ کے بطن سے ہیں) کے علم و عمل اور سعادت مندانہ رویئے پر ہمیشہ ناز رہا ہے۔

تمہید میں عرض کر چکا ہوں کہ سیدہ مرحومہ بڑی زاہدہ و عابدہ خاتون تھیں، صوفیانہ اصطلاح میں وہ صاحب نسبت بھی تھیں، اور راہ سلوک کے منازل سے خوب باخبر تھیں اور بقول حضرت علامہ مستجاب الدعوات بھی تھیں۔ راقم الحروف کو پچھلے چالیس سے زائد برسوں میں ان کی استجابت دعا کے شواہد بہت ملتے رہے، وہ حضرت مولانا محمد عیسیٰ الہ آبادی کے ذریعہ باضابطہ سلسلہ چشتیہ میں داخل تھیں۔ جو حکیم الامت شاہ اشرف علی تھانویؒ کے قدیم اور خاص خلیفہ اور بقول حضرت علامہ اپنے شیخ کی ظاہراً و باطناً تصویر تھے۔

مرحوم کو مبشرات سے بھی بڑا حصہ ملا تھا، بطور نمونہ صرف دو واقعات پیش ہیں، جس مغرب کو حضرت علامہ نے آخرت کا رخت سفر باندھا اس دن ظہر کی نماز کے بعد جب مرحومہ حضرت کی صحت کی دعا میں مشغول تھیں تو یکا یک دیکھا کہ ایک سفید پوش ہستی نمودار ہوئی اور اس نے دودھیا رنگ کا ایک گلاس پیش کیا۔ جب مرحومہ نے اپنا یہ مکاشفہ عارف ربانی حضرت علامہ کو سنایا تو انہیں جواب ملا کہ ”یہ آپ کی تسکین کا سامان کیا گیا ہے“۔ چنانچہ علامہ کی رحلت پر وفور غم کے باوجود سیدہ مرحومہ پر شریعت مقدسہ کے اہتمام کی جو کیفیت طاری رہی اور خود ہم کو اس اہتمام کی تاکید فرماتی رہیں، وہ اس بشارت سکینت کا کھلا ثبوت تھا۔ اس کے تقریباً چونتیس برس بعد جب خود ممدوحہ کا سفر آخرت قریب تھا تو کئی مبشرات کے منجملہ آخری یہ تھا کہ کسی بزرگ نے خواب میں ان سے فرمایا کہ ”آپ باب ابراہیم چلی آیئے“۔ مخدومہ نے اپنا خواب فون پر راقم الحروف کو سنایا تو اس ناچیز نے عرض کیا کہ کھلی بشارت ہے، توحید میں رسوخ مخدومہ کو حاصل ہے۔ اور شائبہ شرک تک سے جو نفرت اور گریز کا اہتمام موجود ہے وہ عین مشرب ابراہیمی کا پرتو ہے۔ اور اس کی جزا باب ابراہیم سے داخلہ کی بشارت ہے:

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

آبدیدہ ہوکر فرمانے لگیں ''میں تو بہت گنہگار ہوں اور اللہ تعالیٰ کے کرم کی محتاج ہوں، بیٹا میرے لئے دعا کرتے رہنا'' آہ ہم تو جیسے تیسے دعا کرتے رہیں گے مگر ہمارے لئے دعائے مقبول کا سہارا اب کوئی نہیں رہا۔

راقم الحروف تو چوبیس پچیس برس کی عمر سے آج پینسٹھ کے لگ بھگ عمر تک مخدومہ مرحومہ کی جس مسلسل شفقت اور پیہم کرم نوازیوں، شاباشیوں اور ہمت افزائیوں کا مورد رہا وہ تو ایک طویل باب ہے جس سے دوسروں کو کیا دلچسپی ہوسکتی ہے، اللہ تعالیٰ مخدومہ کو ان کرم فرمائیوں کی لامتناہی جزا عطاء فرمائے اور اس ناکارہ کے حق میں ان کو کامرانی آخرت کا وسیلہ بنائے، البتہ ان سے حاصل شدہ ایک سند کا ذکر تحدیث نعمت کے طور پر ضرور کرنے کو جی چاہتا ہے۔

مخدومہ نے مکرّر سہ کرّر اس خادم سے فرمایا کہ ''میں نے اپنے اعزا اور ملنے والوں سے کہہ دیا ہے کہ جس کو سید صاحب (حضرت علامہ سلیمان) کا فیض حاصل کرنا ہو وہ غلام محمد صاحب سے بیعت ہوجائے''۔

مخدومہ مرحومہ صرف باتوں کی شفیق نہ تھیں بلکہ مالی ایثار اور عملی اعانت کے جذبہ سے بھی معمور تھیں اور بڑے اخفاء کے ساتھ اعزا، اقربا اور مستحقین کی اعانت فرماتی رہتی تھیں۔

حضرت علامہ کی عالمگیر شخصیت کی وجہ سے ان کا گھر خاص کر جب وہ اعظم گڑھ اور بھوپال میں مقیم رہے عام وخاص چوٹی کے ادباء، علماء اور ارباب قیادت کی آمد کا مرکز رہا اور ان کی حسب مراتب مہمان نوازی کا جو اعتراف سب کو تھا اس کا سہرا سیدہ مرحومہ کے سر ہے، وہ بڑی مہمان نواز، خوش سلیقہ اور منتظم خاتون تھیں، ان کا دل بھی فراخ تھا اور ہاتھ بھی کشادہ، انشاء اللہ آخرت میں کشادگیاں ہی کشادگیاں ان کا نصیبہ رہیں گی۔

حضرت علامہ کی رحلت کے بعد سیدہ مرحومہ اپنے بڑے داماد محترم سید ابوعاصم ایڈوکیٹ کے گھر رہیں۔ مگر کچھ عرصہ بعد اپنے سب سے چھوٹے داماد سید محی الدین صاحب مرحوم کے اصرار پر ان کے ہاں منتقل ہوگئیں، چند برس بعد جوان مرگ محی الدین

صاحب کی وفات پر پھر وہ اپنے منجھلے داماد ڈاکٹر سید عطاء اللہ صاحب کے ہاں رہنے لگیں اور بالآخر انہیں کے گھر سے آخرت کو کوچ کیا، ادھر کافی عرصہ سے ان کی صحت خراب تھی، مگر جگر پر کینسر ہوچکا تھا، بڑے سے بڑے ڈاکٹروں کی بھی یہی رائے رہی کہ اس کو چھیڑا نہ جائے۔ خدا کی قدرت کہ اس سے تکلیف کچھ نہ تھی مگر آہستہ آہستہ بھوک ختم ہوگئی، خون سوکھتا چلا گیا، کمزوری سے صاحب فراش ہوگئیں، آخری دو ڈھائی مہینے کی علالت میں میرے محبّ عزیز ڈاکٹر مصباح الرحیم صاحب نے بڑی دلسوزی اور عقیدت ومحبت سے طبی عملی خدمات انجام دیں اور ایک ''مستجاب الدعوات'' مخدومہ سے دعاؤں کا بڑا ذخیرہ اپنی کامیابی آخرت کے لئے جمع کرلیا۔ صاحب زادہ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی نے خدمت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، ڈربن سے آکر تقریباً مہینے بھر ماں کی خدمت میں وقف رہے، پھر اپنی ذمہ داریوں کی وجہ سے مجبوراً انہیں واپس جانا پڑا اور بقول سرجن قاضی صاحب (نواسے داماد مولانا محمد علی جوہر مرحوم) کس کرب میں دل پر پتھر رکھ کر وہ اپنی چہیتی والدہ کو بستر مرگ پر چھوڑ کر جانے پر مجبور تھے، صاحب مقام والدہ نے اپنے فرزند دلبند کو وداع کرتے ہوئے وصیت فرمائی کہ تمہیں خدا کے سپرد کیا۔ دیکھو وہاں پہنچ کر کوئی بات سننے میں آئے تو صبر وتحمل سے کام لینا یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ غرض پھر وہ وقت آگیا جو اٹل تھا، ۲۶/ذی قعدہ ۱۴۰۷ھ ۲۳/جولائی ۱۹۸۷ء جمعرات کو ٹھیک سوا سات بجے صبح سیدہ کی روح عالم بالا کو پرواز کرگئی۔ خوش نصیب ماں کو غسل سعادتمند بیٹیوں نے دیا، تجہیز وتکفین کی، پھر اسی دن نماز عصر کے فوراً بعد جامع مسجد ''بیت المکرّم'' گلشن اقبال میں ایک بڑے مجمع نے ان کی نماز جنازہ پڑھی، صاحبزادہ ڈاکٹر سید سلیمان ندویؒ کے حسب تاکید نماز جنازہ کی امامت کا شرف راقم الحروف کو حاصل رہا، جب یہ عاجز غمزدہ جنازہ کے روبرو آیا تو دفعتاً یوں محسوس ہوا جیسے میرے سینہ میں برف کی سل رکھ دی گئی اور اس کے اثر سے سارے وجود میں خنکی اور ایک پرکیفیت سکینت سرایت کرگئی، یہ بالیقین مرحومہ کی مقبولیت اور ملائکہ کے ذریعہ ان پر نزول سکینت کا کھلا اثر تھی:

دل کو سکون روح کو آرام آ گیا
موت آ گئی کہ یار کا پیغام آ گیا

نماز کے بعد جنازہ ملک پلانٹ سے متصل قبرستان میں لایا گیا، قبرستان کے گیٹ میں داخل ہوتے ہی بالکل سامنے چند قدم پر نیم کے سایہ دار درخت کے نیچے مرحومہ کو پیوند خاک کر دیا گیا کہ:

نم کنوم العروس
اب سو جاؤ جیسے دلہن سوتی ہے۔

مرحومہ کی عمر ۸۲ / برس کی تھی۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کی قبر پر تا قیامت اپنی رحمتوں کی پھوار برستی رکھے اور ان کے درجات بڑھتے رہیں۔

سید صاحبؒ اپنے وطن میں

پروفیسر عبدالقوی دسنویؒ

اہل دسنہ کو اپنی چھوٹی سی بستی سے ہمیشہ سے بے حد محبت رہی ہے، اس لئے وہ اپنی جنت سے حضرت آدم کے برخلاف کبھی بھی ہمیشہ کے لئے نکلنا گوارا نہیں کر سکتے تھے، وہ ہندوستان کے کسی گوشے میں رہتے ہوئے بھی دسنہ کو اپنا مسکن و ماویٰ متصور کرتے تھے، چنانچہ بڑی سے بڑی ملازمت اور اچھے سے اچھے شہر میں رہنے کے باوجود اپنی چھٹیاں دسنہ ہی میں گزار کر سکون کی دولت حاصل کرتے اور خوشیوں اور مسرتوں سے مالا مال ہوتے۔ بڑے شہروں کی بڑی آبادی، عالی شان عمارات، دولت وثروت کی ریل پیل، چہل پہل، تام جھام، سڑکیں، زندگی کی آسائشیں اور گزر بسر کی آسانیاں، انہیں کسی قیمت پر بھی اپنی طرف مستقل طور پر متوجہ نہیں کر پاتی تھیں، اس لئے عام طور سے، سارے ابنائے قریہ دسنہ ہی کو بنانے، سنوارنے، آباد کرنے میں مصروف رہتے تھے اور اسی کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے تھے، میرے والد ماجد (پروفیسر سعید رضا) کی نظر میں بھی عروس البلاد بمبئی دسنہ کے مقابلہ میں ایک نظر نہ بھایا، وہ ملازمت کی مجبوری کی وجہ سے وہاں ضرور رہتے تھے لیکن ان کا دل اپنے محبوب گاؤں میں لگا رہتا تھا، چنانچہ ۱۹۳۴ء میں انہوں نے وطن عزیز ہی میں اپنا چھوٹا سا شہری قسم کا مکان بنانا شروع کیا اور ۱۹۳۶ء میں جب اس کی فرشی منزل تیار ہو گئی تو اپنے آبائی مکان سے اہل وعیال کے ساتھ وہاں منتقل ہو گئے۔ یہ زمانہ شاید اکتوبر کا تھا، مولانا سید سلیمان ندویؒ دسنہ تشریف لائے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر سید محمود بھی اس دوران میں کسی روز دسنہ آگئے تھے۔ والد صاحب نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر چار بجے شام میں اپنے نئے مکان میں سیرت کی مجلس منعقد کرالی تھی، جس میں ڈاکٹر سید محمود بھی شریک ہوئے۔ اس جلسے میں سید صاحب نے نہایت ہلکی اور سادہ زبان میں سیرت رسول اللہ ﷺ پر تقریر کی۔ پہلی بار میں نے سید صاحبؒ کو اس قدر قریب سے اور کافی دیر تک اسی موقع پر دیکھا تھا، اس مجلس کی تصویر دل پر اب بھی نقش اور ذہن کے نہاں خانے میں محفوظ ہے، اس کے کچھ عکس آج بھی تقریباً اڑتالیس سال گزرنے کے بعد مجھ پر عجیب کیفیت پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اس کی یاد میرے لئے ''یاد ماضی عذاب'' کی صورت نہیں ہے بلکہ مسرت اور فرحت کا باعث ہے۔ سید صاحب ٹھہر ٹھہر کر آہستہ آہستہ تقریر کر رہے تھے۔ درمیانہ قد، گداز جسم، روشن اور متبسم چہرہ، آنکھیں ذہانت، متانت، شرافت اور وسعت قلب کی امانت دار، پیشانی چوڑی چمکیلی، ان کی شخصیت کی عظمت اور حشمت کی گواہ، سر پر سجی سجائی صاف وشفاف پگڑی، مومنانہ جمال ووقار اور صوفیانہ انداز وادا کی مظہر جسم پر شیروانی، چہرہ پُر نور، داڑھی اس سے روشن تر۔ سید صاحب کی یہ تمام خصوصیات ہم جیسے کم عمر بچوں کے دلوں پر ایک خاص رعب اور مسرت کی کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔ پھر تقریر کا انداز، بات کہنے کا سلیقہ، سمجھانے کا ڈھنگ، حاضرین محو تھے۔ رسول ﷺ کی سیرت کا بیان سید صاحبؒ کی شخصیت کا پرتو، دونوں سننے والوں کے دلوں میں اسلام سے عجیب قربت کا باعث بنی ہوئی تھیں۔ والد صاحب کا چہرہ چمک رہا تھا، وہ بے انتہا خوش تھے۔ بڑے ابّا عبدالحفیظ ندویؒ تقریر میں گم تھے۔ برادر محترم پروفیسر عبدالحی رضا میری طرح کبھی تحیر کبھی تجسس کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ جو عزیز واقارب شریک محفل تھے عجیب کیفیت میں غرق تھے۔ اس کے بعد تو سید صاحب کو بار بار دیکھا اور جوں جوں عمر بڑھتی گئی، شعور پیدا ہوتا گیا، ہوش وحواس جوان ہوتے گئے، عقل وخرد میں پختگی آتی گئی، سید صاحبؒ کی علمیت کا نقش دل پر بیٹھتا گیا، شخصیت کا احترام بڑھتا گیا، ان کے کردار کی عظمت، قلب کو مسحور کرتی گئی، ان کی علمی

وادبی فتوحات اہل دسنہ کے لئے مسرت کا پیغام لاتی گئیں اور ان کی شان اور فخر میں اضافہ کرتی گئیں۔

سید صاحبؒ اپنے وطن دسنہ برابر آتے، اِن آنکھوں نے انہیں اپنے خوبصورت بلند وبالا، وسیع اور کشادہ بنگلہ نما مکان کی تعمیر میں مصروف دیکھا۔ اعظم گڑھ کے راج مستری تعمیر میں لگے رہتے۔ پھر ایک دَور آیا، جیرائن ندی کے اُس پار سید صاحب کو اپنے باغ کو سجانے میں مصروف پایا۔ اچھے اچھے لذیذ آموں کے درخت لگائے گئے اور پھر درخت بڑھے، پروان چڑھے اور پھلوں سے لدے۔ یہ سب منزلیں آئیں۔ سید صاحب خاص طور سے گرمیوں میں دسنہ آتے، عصر کی نماز کے بعد باغ جاتے، کچھ دیر وہیں گزارتے اور باغ کی دیکھ ریکھ میں مصروف رہتے، مسرور ہوتے۔

کبھی کبھی دن میں الاصلاح لائبریری میں تشریف لاتے۔ ہم نوجوانوں سے گفتگو کرتے، بعض کتابیں اور مضامین پڑھنے کی طرف اشارہ کرتے۔ ایک بار ظہر کی نماز کے بعد تشریف لائے تو رسائل کے کمرے کا جائزہ لینے لگے۔ پوچھا وکیل کے شمارے کہاں ہیں۔ میں نے تمام جلدیں لاکر ان کے سامنے رکھ دیں۔ اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگے پھر بتایا کہ ابتدا میں اس میں ان کے مضامین شائع ہوئے تھے۔

انجمن الاصلاح کے جلسوں میں شریک ہوتے اور کبھی کبھی بعض نجی نشستوں میں بھی تشریف لے آتے تو محفل میں جان پڑ جاتی، شان بڑھ جاتی۔

سید صاحب کے قیام ہی کی وجہ سے اس زمانہ میں اس چھوٹے سے قریہ میں اہل علم کی آمد ورفت کا سلسلہ قائم ہوجاتا۔ مولانا شوکت علی، مولوی عبدالحق، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی وغیرہ تشریف لائے اور اس بستی کو سربلند کر گئے۔

آخری ملاقات سید صاحب سے بمبئی میں ہوئی جب وہ حج سے واپسی پر بیمار پڑ گئے تھے اور اعظم گڑھ کے منشی عبدالعزیز انصاری صاحب کے فلیٹ میں قیام کیے ہوئے

تھے۔منشی عبدالعزیز صاحب، سید صاحب کے بے انتہا عقیدت مند تھے انہوں نے اس بیماری میں سید صاحب کی بڑی دیکھ ریکھ کی۔سید صاحب بے حد کمزور ہو گئے تھے اس لئے آہستہ آہستہ گفتگو کرتے رہے، لیکن یقین اور اعتماد کے پیکر بنے رہے۔

۱۹۶۱ء میں جب میں بھوپال آیا تو اکثر یہاں کے لوگوں کو اقبال کے قیام بھوپال کا ذکر کرتے ہوئے پایا۔جگر اور بھوپال کے تعلق پر بھی بار بار روشنی ڈالتے سنا۔اور یہ جان کر کہ میں سید صاحب کا ہم وطن ہی نہیں بلکہ اسی شجر کا ایک برگ کم مایہ بھی ہوں جس کے سید صاحب گل شگفتہ تھے۔تو وہ لوگ ان کے بارے میں نہایت عقیدت اور احترام کے ساتھ ان کی باتیں بتاتے۔چنانچہ میں نے ان کا قیام جس مکان میں تھا اسے دیکھا، دیر تک عجیب کیفیت طاری رہی، خیالات کے تانے بانے نہ جانے کہاں کہاں پہنچاتے رہے۔

جس مسجد میں نماز پڑھتے تھے وہاں نماز پڑھی۔موتی مسجد میں جہاں وہ نماز جمعہ ادا کرتے تھے بار ہا گیا اور ان کو یاد کیا اور جذبات کی رَو میں بہتا گیا۔

ایم۔اے کی تعلیم کے زمانے میں جب میں نے علامہ شبلیؒ کا مطالعہ کیا تھا، تو سید صاحبؒ کی ندوہ کی طالب علمی، الہلال سے تعلق، کلکتہ کے قیام، پونا کالج کی پروفیسری اور دارالمصنفین کی تعمیر کے زمانے سامنے آئے۔سید صاحب کی تعلیمی، علمی، ادبی، مذہبی اور کسی قدر سیاسی مصروفیات سے آگاہی ہوئی اور فکر و نظر سے باخبر ہوا۔

جشن اقبال میں اقبال کے مطالعہ نے سید صاحب کی عظمت کی کہانیاں بار بار سنائیں، اور اقبال کے سید صاحب سے متعلق اس طرح کے فیصلے سے آگاہ ہوا:

''علوم اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندویؒ کے اور کون ہے''۔

اور اقبال کی اس تحریر نے:

''آج سید سلیمان ندویؒ ہماری علمی زندگی کے سب سے اونچے زینے پر ہیں، وہ عالم ہی نہیں امیر العلماء ہیں، مصنف ہی نہیں، رئیس المصنفین ہیں، انکا وجود علم

وفضل کا ایک دریا ہے جس سے سینکڑوں نہریں نکلی ہیں اور ہزاروں سوکھی کھیتیاں سیراب ہوتی ہیں''۔

سید صاحبؒ کی ہمہ گیر شخصیت سے باخبر کیا اور ان کے لئے اور زیادہ احترام اور عقیدت کا جذبہ بڑھایا۔

....

سید صاحب کو اپنے وطن سے بے حد دلچسپی تھی، آپ کا ارادہ تھا کہ زندگی کے آخری ایام دیسنہ ہی میں رہ کر گذاریں، آپ نے اپنے لئے مردانہ نشست کا بنگلہ بنوایا تھا جس کے لئے معمار اعظم گڈھ ہی سے بلائے گئے تھے اور جس کی تعمیر کی دیکھ بھال خود کرتے رہے، اب اس بنگلہ میں دیسنہ اسٹوڈنٹس کانفرنس کی طرف سے جلسۂ میلاد النبیؐ، مجلس بحث ومباحثہ ودیگر جلسے ہمیشہ منعقد ہوتے رہتے ہیں، دیسنہ کے نوجوان اسے نشیمن کے نام سے پکارتے ہیں، اور تمام تر علمی، ادبی، اور سوشل کام کتب خانہ کے بعد وہیں انجام دئے جاتے ہیں، آپ نے جی رائن ندی کے کنارے (اسی ندی پر دیسنہ واقع ہے) ایک خوبصورت باغ لگایا ہے، جس میں ملیح آباد کے عمدہ آم لگائے گئے ہیں، موسم گرما میں جبکہ آپ دیسنہ تشریف لائے تھے تو روزانہ شام کو معمول ہوتا کہ اپنے چند احباب مولوی عبدالنعیم، مولوی عبدالحکیم صاحب، مولوی نجم الہدیٰ وغیرہ کے ساتھ باغ میں چہل قدمی کی غرض سے جایا کرتے تھے۔

الاصلاح لائبریری دیسنہ سے بھی آپ بے حد دلچسپی رکھتے تھے، ''نور محمدی'' کی تمام جلدیں آپ نے کتب خانہ کو اس غرض سے عطا کردیں کہ اس کے پیسے کتب خانہ کی دوسری ضروریات میں کام آئیں، اس طرح ''خطبات مدارس'' کی پانچ سو جلدیں کتب خانہ کو عطا کی گئیں۔دیسنہ جب تشریف لاتے تو اکثر بعد نماز ظہر کتب خانہ تشریف لاتے، اس وقت راقم الحروف کتب خانہ کی کتابوں کی صفائی کیا کرتا تھا، آپ پرانے رسائل ''وکیل'' وغیرہ دیکھا کرتے اور اکثر ''وکیل'' میں اپنے چھپے ہوئے مضامین کی طرف اشارہ

کرتے اور کہتے کہ انہیں پڑھ جاؤ۔

مغرب کی نماز کے بعد آپ مسجد میں بیٹھ کر آیات قرآنی کی تفسیر فرمایا کرتے تھے، اور یہ روزانہ کا معمول تھا۔

آپ کے انتقال سے یوں تو تمام ادبی حلقوں میں رنج وافسوس کا اظہار کیا گیا لیکن دیسنہ کے باشندگان بے حد متاثر ہوئے۔

دیسنہ

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا وطن

سہیل احمد بن ڈاکٹر صباح الدین احمد دسنوی

علامہ سید سلیمان ندویؒ کو شہرہ آفاق مصنف اور اسکالر بنانے میں جہاں ان کے استاد علامہ شبلی نعمانیؒ اور ندوہ کا دخل ہے وہاں ان کے گاؤں دیسنہ ضلع پٹنہ صوبہ بہار کے ستھرے ماحول اور علمی فضا کا بھی بڑا حصہ ہے۔

علامہ کا وطن صوبہ بہار میں اپنی مردم خیزی کی وجہ سے مشہور ہے، اس چھوٹے سے ایک گاؤں میں تقریباً ایک سو سے زیادہ یونیورسٹی کے گریجویٹ اور درجنوں علمائے کرام، ڈاکٹر، انجنئر، صحافی اور ادیب پیدا ہوئے ہیں جو اس وقت ہندوستان اور پاکستان میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

دیسنہ کے ماحول کا نکھار سال میں صرف تین مہینوں میں ہوا کرتا تھا، یعنی مئی جون اور اکتوبر کے ماہ میں۔ ہندوستان کی اہم یونیورسٹیوں اور کالجوں سے طلباء ان تین مہینوں کے دوران تعطیل منانے گاؤں ضرور آتے تھے اور اس طرح علی گڑھ یونیورسٹی، بمبئی یونیورسٹی، کلکتہ یونیورسٹی اور پٹنہ یونیورسٹی اور دوسرے کالجوں کے طلباء جب آتے تو وہاں کا ماحول رہائشی یونیورسٹی کے طلباء کی یونین کا سا ہو جاتا، جہاں انگریزی تعلیم پانے والے دیسنوی طلباء بھی جمع ہوتے اور اس طرح مشرقی اور مغربی علوم کے حاصل کرنے والے

جب یکجا ہوتے تو طرح طرح کی سرگرمیاں شروع ہو جاتیں۔

یہ ماحول نوجوانوں کے لئے اپنے اندر بڑی کشش رکھتا تھا اور اس وجہ سے نوجوانوں کے بزرگوں کو بھی مئی یا جون اور اکتوبر میں اپنے گاؤں آنا پڑتا اور اکثر شادی بیاہ ان مہینوں میں انجام پاتے جس کی وجہ سے سارے گاؤں کی فضا رنگین ہو جاتی۔

اس گاؤں میں بزرگوں نے انجمن الاصلاح نام کا ایک علمی اور سماجی ادارہ قائم کر رکھا تھا، اسی انجمن کے زیر اہتمام ۱۸۹۸ء میں کتب خانہ الاصلاح قائم ہوا تھا، یہ کتب خانہ صوبے کے باہر سارے ہندوستان میں اپنی نادر اور نایاب کتابوں کے باعث مشہور تھا جن کی شہرت سن کر ہندوستان کے دو سابق صدر راجندر پرشاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین، کانگریس کے سابق صدر اچاریہ کرپلانی، بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق وغیرہ کو اس میں گاؤں جانا پڑا، اس کتب خانہ میں عمر خیام کا سب سے پرانا نسخہ تھا، جسے برٹش حکومت نے کتب خانہ کے بجائے ریز روبنگ آف انڈیا میں محفوظ رکھا تھا۔ ارو جب پیرس میں نمائش ہوئی تھی تو اس نسخے کو وہاں رکھا گیا اور یورپی اخباروں نے اس پر تبصرے کئے اس کے علاوہ سینکڑوں قلمی نادر نایاب نسخے بھی تھے۔

ایک خاص بات اس کتب خانے کی یہ تھی کہ آج سے ۵۰ رسال قبل کے تمام اہم اخبارات ورسائل کی مکمل فائل یہاں موجود تھی۔ مثلاً ابوالکلام آزاد کے الہلال اور البلاغ کی فائل، زمانہ، سعادت، ساقی، مولانا محمد علی مرحوم کے اخبار ہمدرد اور کامریڈ وغیرہ کی فائلیں جو تحقیقی کاموں کے لئے نہایت ہی ضروری تھیں۔

یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر ذاکر حسین جب صوبہ بہار کے گورنر تھے تو انہوں نے اس کتب خانہ کی تمام اہم نادر اور نایاب کتابوں کو ہندوستان کے مشہور کتب خانہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں مستقل کر دیا۔ جو وہاں، دیسنہ سکشن کے نام سے محفوظ ہے اور ہندوستان کے علماء وفضلاء اس سے فیض اٹھا رہے ہیں۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کو بچپن اور نوجوانی میں اس کتب خانہ سے فیض اٹھانے کا

بڑا موقع ملا اور اس طرح ان کے علمی رجحان کو پروان چڑھانے میں اس علمی گہوارہ سے بڑا فائدہ ہوا۔

انجمن الاصلاح کے زیر اہتمام طلباء کی ایک انجمن تھی اس ادارے کے ذریعے طلباء اپنے الکشن، کتب خانہ کے کتابوں کے اجراء اور وصول کے علاوہ ان کی حفاظت کا کام، سالانہ اسپورٹس، میلاد النبی کی مجالس اور مسجد میں ماہ رمضان میں تراویح کے انتظامات وغیرہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔

نوجوانوں کی سرگرمیوں میں علامہ بھی اپنی نوجوانی کے دوران خوب خوب حصہ لیتے تھے اور ۱۹۰۳ء میں انجمن الاصلاح کے جلسہ میں اپنا پہلا مضمون ''وقت'' اور دوسرا مضمون ''علم اور اسلام'' پڑھا ''وقت''، لاہور کے مشہور رسالہ ''مخزن'' اور ''علم اور اسلام'' علی گڑھ میگزین میں شائع ہوا اس طرح مضمون نگاری کا سلسلہ انہیں اپنے گاؤں کے ماحول سے ملا۔

چھٹیوں اور تعطیل میں وہاں ایسی ہماہمی اور سرگرمیاں ہوتیں جس طرح رہائشی یونیورسٹیوں میں ہوا کرتی ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وہاں کے طلباء نے اپنے اپنے تعلیمی اداروں کے ماحول کی بنیاد پر اسٹوڈنس یونین قائم کر رکھی تھی اور اس طرح الکشن کی مہم ہوتی، طلباء کے گروپ اپنا منشور پیش کرتے اور خفیہ بیلٹ کے ذریعہ ووٹ ڈالے جاتے اور کامیاب گروپ اپنی کابینہ بناتا جس کے ذمہ اسپورٹس کے مقابلے اور سالانہ اجلاس منعقد کرنا ہوتا، اس اجلاس کے قبل رنگ برنگ کی جھنڈیاں اور محراب بنائے جاتے، جس طرح آج کل وزرائے کرام کی آمد کے موقع پر کیا جاتا ہے اور اکثر موقعوں پر صوبائی وزراء یا ہندوستان کے اہل علم اجلاس کی صدارت یا تقسیم انعامات کے لئے آتے۔ اس موقع پر ایسا معلوم ہوتا کہ کسی یونیورسٹی میں تقسیم اسناد کی تقریب ہے۔

گاؤں کے ریٹائرڈ سرکاری ملازمین اور بزرگان دیسنہ کی نگرانی میں مسجد، کتب خانہ، قبرستان وغیرہ کا انتظام بلدیاتی ادارے کی طرح انجام دیا جاتا، بزرگوں کا اجلاس

ہاؤس آف لارڈس کی طرح ہوتا اور نوجوانوں کا اجلاس ہاؤس آف کامنس کی طرح، نوجوان بزرگوں کی اسکیموں اور پروگراموں کو عملی میدان میں عمل درآمد کرتے۔

علامہ کو اپنے گاؤں کے اس علم پرور ماحول سے اتنی دلچسپی تھی کہ ہر سال وہ جون کے مہینہ میں اپنے گاؤں ضرور آتے۔ایک بار مولانا نے اپنے رسالہ معارف کے شذرات میں لکھا کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ دیسنہ دارجلنگ اور نینی تال کی طرح پہاڑی اور صحت بخش مقام ہے، دیسنہ نہ تو صحت بخش مقام ہے اور نہ سیر وتفریح کی جگہ، بلکہ میرا وطن ہے اس لئے یہاں ہم وطنوں سے ملنے آجایا کرتا ہوں۔

علامہ موصوف جب آتے تو نوجوانوں کے کبڈی اور فٹ بال میچ دیکھتے، طلباء کے اجلاس میں شریک ہوتے، کتب خانہ جاتے اور نوجوانوں سے گفتگو کرتے، انعامات تقسیم کرتے، اور اس طرح انہیں اپنی نوجوانی کا زمانہ یاد آتا۔

یہی وجہ ہے کہ اس گاؤں میں صرف علامہ سید سلیمان ندویؒ ہی نہیں پیدا ہوئے۔ بلکہ پروفیسروں میں بمبئی کے مشہور پروفیسر رقعات عالمگیری کے مصنف پروفیسر نجیب اشرف ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ڈائرکٹر اور مشہور مصنف سید صباح الدین عبدالرحمٰن، بمبئی کے انجمن اسلام نامی مشہور ادارہ کے سکریٹری سید شہاب الدین دیسنوی، انجمن مفید اسلام کلکتہ کے سکریٹری جنرل سید صلاح الدین احمد، پٹنہ یونیورسٹی کے مشہور طالب علم جناب سعید الحق جنہوں نے یونیورسٹی کے امتحانوں میں اول آکر رکارڈ قائم کئے تھے اور کئی کتابوں کے مترجم تھے، جن میں خطبات مدراس کا ترجمہ، عرب وہند کے تعلقات کا ترجمہ، شکسپیئر کے ڈراموں کے تراجم شامل ہیں، وہ ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر آف مونیٹرنگ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ڈھاکہ میڈیکل کالج کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر وصی احمد انصاری ایف آر سی ایس جو ملک کے نامور سرجن ہیں، مشہور مؤرخ مولانا سید ابوظفر ندوی، ڈاکٹر عبدالقوی صدر شعبۂ اردو سیفیہ کالج بھوپال جو اردو کے صرف پروفیسر ہی نہیں ہیں بلکہ اردو ادب میں انہیں ایک خاص مقام حاصل ہے، اس کے علاوہ بہترے ادیب،

صحافی وغیرہ اسی خاک سے پیدا ہوئے اور آج اپنے اپنے شعبۂ حیات میں کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں۔

....

بہار ہی میں ہے دسنہ کا وہ عظیم مقام
جہاں کی خاک سے اٹھے تھے ندویوں کے امام
(مولانا ڈاکٹر سید شاہ تقی الدین احمد فردوسی منیری ندوی)

....

اہل علم کے اعترافات

حضرت سید صاحب کے متعلق ان کے مرشد حضرت تھانویؒ کا ارشاد:

از سلیماں گیر اخلاص عمل — داں تو ندوی را منزہ از دغل
اے دلت مخمور از اسرار حق — اے دلت معمور از آثار حق
اے دلت پرنور از انوار حق — اے دلت مسرور از اظہار حق

....

فخر ندوہ کے متعلق استاذ وشاگرد کے اقوال:

حضرت سید صاحبؒ کے استاذ علامہ شبلی نعمانیؒ نے فرمایا:

’’ندوہ نے کیا کیا، کچھ نہیں کیا، ایک سلیمان کو پیدا کیا تو یہی کافی ہے‘‘۔ (خطبہ اجلاس ندوۃ العلماء ۱۹۱۲ء)

اور حضرت سید صاحبؒ کے شاگرد رشید مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے فرمایا:

’’اگر ندوہ نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کے علاوہ کسی اور کو نہ پیدا کیا ہوتا تو یہی اس کے فخر کے لئے کافی تھا‘‘۔

علامہ اقبالؒ کا اعتراف عظمت:

آج سید سلیمان ندویؒ ہماری علمی زندگی کے سب سے اونچے زینہ پر ہیں، وہ عالم ہی نہیں امیر العلماء ہیں، مصنف ہی نہیں رئیس المصنفین ہیں، ان کا وجود علم وفضل کا ایک دریا ہے جس سے سیکڑوں نہریں نکلی ہیں اور ہزاروں کھیتیاں سیراب ہوئی ہیں۔

علامہ تقی الدین ہلالی مراکشیؒ:

”العلامة الجامع لشتات العلوم المنطوق منها والمفهوم والمعقول والمنقول“.

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ:

واقعہ یہ ہے کہ میں نے ہندوستان وبیرون ہند کی سیاحت اور ممالک اسلامیہ سے واقفیت کے سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندویؒ جیسا جامع فنون اور متنوع الذوق نہیں دیکھا۔

حضرت سید صاحبؒ کی قرآنی بصیرت

میرے نزدیک فہم قرآنی میں ان کا پایا اتنا بلند تھا کہ مجھے ہندوستان ہی نہیں تحت براعظم میں بھی کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس کا مطالعہ اتنا وسیع اور عمیق ہو، اور غائر مطالعہ کی وجہ یہ ہے کہ عربی ادب اور بلاغت اور اعجاز قرآن کا مطالعہ ان کا بہت وسیع وعمیق تھا، پھر مولانا حمید الدین (جو اس فن کے گویا امام تھے) کی صحبت،

ان کی گفتگو،ان کی تحقیقات سے پورا استفادہ کیا۔(افادات قرآنی ص:۳۱)

....

ہندوستان میں بہت کم لوگوں کومعلوم ہے کہ سید صاحبؒ اگر چہ مؤرخ وادیب کی حیثیت سے مشہور ومتعارف ہیں اور بعض دینی حلقوں کا ابھی تک ان کو مؤرخ وادیب ہی کہنے پر اصرار ہے،لیکن جیسا کہ میں نے ان کے تذکرہ میں لکھا ہے، میرے نزدیک ان کا اصل موضوع اور ان کے امتیاز واختصاص کا میدان فہم قرآن اور علم کلام تھا،مولانا حمیدالدین فراہی کی زیارت اوران سے استفادہ کا شرف مجھے حاصل نہیں ہوا،ان کا تعمق فی القرآن مشہور ومسلّم ہے، میرے محدود علم میں ان کے بعد تدبر قرآن،قرآن مجید کے بلاغتی، ادبی اور کلامی دقائق ونکات کی واقفیت اوراس کے معانی ومطالب میں غواصی کا جہاں تک تعلق ہے،سید صاحب کا کوئی ہمسر نہیں نظر آتا، یہ محض گروہی عصبیت اور نری عقیدت کی بناپر نہیں ہے میں نے بار ہا ان کا قرآن مجید کا درس اور متعدد سورتوں اورآیات پران کی تفسیر سنی ہے۔(پرانے چراغ ۲/۲۵۳)

(حضرت مولانا سیدابوالحسن علی ندویؒ)

ندوۃ العلماء

اہل علم کی نظر میں

مولانا ابوالکلام آزاد:

اصلاح وتجدید کا وہ سرّ مخفی جس کی جستجو میں تمام مصلحین گذشتہ سرگرداں رہے مگر بہت کم افکار عالیہ تھے جن کی اس تک رسائی ہوئی،احیاء ملت کا وہ مقصد جس کو گو سمجھنے والوں نے سمجھا پراس کے انجام دینے کی مہلت کسی نے نہ پائی،تحریک دینی کا وہ مشروع عظیم جس کو بایں ہمہ سطوت وقوت سلطان عبدالحمید نہ کرسکا،اور خدیو مصر نے سید جمال الدین سے اس کا وعدہ کیا مگر ہمت ہاردی، اصلاح اسلامی کا وہ مطلوب عزیز جس سے دارالخلافت اسلامی کے جوامع خالی رہے اور جس کا جمال اصلاح دس برس کی سعی وجستجو کے بعد بھی جامع ازہر کے ستونوں کونصیب نہ ہوا، وہ یوسف گم گشتہ جس کی آرزو تیونس کی جامع زیتونہ میں کی گئی مگر پوری نہ ہوئی اور جس کو مراکش کے جامع ابن خلدون میں پکارا گیا مگر جواب نہ ملا یعنی وہ کہ نامور محمد عبدہ ساری عمراس کے عشق میں رویا وابیضت عنها من الحزن فهو كظيم مگر اسے نہ پاسکا،اور قاضی القضاۃ ترکستان نے چالیس برس اس کی حسرت میں کاٹے کہ وا أسفى على يوسف مگر محروم رہا،خاک ہند کے چند ہمم عالیہ اورافکار صحیحہ کی کوششوں کی بدولت ندوۃ العلماء کے نام سے وجود میں آیا۔(الہلال)

علامہ اقبالؒ:

میرا ایک مدت سے عقیدہ ہے ہندوستانی مسلمان جو سیاسی اعتبار سے دیگر مما لک

اسلامیہ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے دماغی اعتبار سے ان کی بہت کچھ مدد کر سکتے ہیں، کیا عجب ہے کہ اسلامی ہند کی آئندہ نسلوں میں ندوہ، علی گڑھ سے زیادہ کارآمد ثابت ہو۔

(مکتوب بنام علامہ سید سلیمان ندویؒ)

شیخ علی طنطاویؒ:

آج میری عمر کے پچاس سال پورے ہونے کو ہیں، دنیا کے دور دراز ممالک دیکھ چکا ہوں، زندگی کے سرد و گرم تجربات سامنے آئے، شہرت، مال وجاہ، انسان جن کی تمنا کرتے رہ جاتے ہیں الحمدللہ کہ وہ سب مجھے حاصل ہو چکی ہیں، لیکن ان سب کے بعد اگر میں قسم کھا کر کہوں تو غلط نہیں ہوگا کہ اس ادارہ (ندوۃ العلماء) کو دیکھنے کے بعد یہ ساری چیزیں مجھے ہیچ نظر آئیں اور دل میں ایک ہی تمنا رہ گئی، کاش دوبارہ بچپن کی زندگی مل جاتی اور میں اس ادارہ میں نشو ونما پا کر دین ودنیا کی سعادت اپنے دامن میں سمیٹ لیتا۔

علامہ سید رضا مصری:

ندوۃ العلماء نے جو صدا لگائی ہے یہ وہی صدا ہے جو اسلام صدیوں سے ان تمام ممالک میں لگا رہا ہے جہاں شعائر اسلام زندہ ہیں۔

شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ امام حرم:

بلاشبہ ندوۃ العلماء کی بنیاد اخلاص وتقویٰ پر پڑی ہے، یہ ایک اسلامی قلعہ اور علم کا مینار ہے، مسلمانو!م اس کو غنیمت جانو، اور اس سے پورا فائدہ اٹھاؤ۔

ندوۃ العلماء کے مقاصد اور اس کی خصوصیات

مجلس ندوۃ العلماء ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء سے عالم وجود میں آئی اور اس کے چار مقاصد قرار پائے، عربی تعلیم کی اصلاح، مسلمانوں میں اتحاد واتفاق کی دعوت اور ان کے غیر شرعی رسم ورواج کا ابطال اور علمائے اسلام کا اسلام کی خاطر ایک متحدہ مرکز پر اجتماع، غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ضرورتیں اب بھی اسی طرح قائم ہیں اور اس آواز کو اب بھی بار بار بلند کرنے کی حاجت ہے۔

ہماری درس گاہ کی خصوصیتیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ علوم قرآنیہ کی طرف اعتنائے خاص۔
۲۔ پرانے یونانی علوم منطق وفلسفہ میں صرف بقدر ضرورت پر قناعت۔
۳۔ علوم ادبیہ اور عربی تحریر وتقریر کی پوری مہارت۔
۴۔ جدید علم کلام سے آشنا کرنا۔
۵۔ قدیم صرف ونحو کی مشقی تعلیم اور پرانی دقتوں کو دور کرنا۔
۶۔ انگریزی زبان سے بقدر ضرورت واقفیت۔
۷۔ تاریخ، جغرافیہ حساب، اقتصادیات، اور سیاسیات اور حسب مقدور دوسرے مفید جدید علوم کی تعلیم۔
۸۔ پابندی شریعت مطہرہ کے ساتھ زمانہ کی ضرورتوں سے باخبری اور طلباء میں بلند نظری، بلند ہمتی، وسعت حوصلہ اور اپنے رہنے میں صفائی وپاکیزگی کا خیال۔
۹۔ طلباء میں تقریر وتحریر کا ملکہ پیدا کرنا۔
۱۰۔ فروعی باتوں میں غیر مفید اختلافات سے اجتناب۔

علمائے دین اور مصلحین امت ہم کو بروقت ٹوک سکتے ہیں اور ہماری غلط روی کی ہر وقت اصلاح فرما سکتے ہیں۔

(حضرت علامہ سلیمان ندویؒ)